عنایت اللہ

بی آر بی بہتی رہے گی

جنگ ستمبر 1965ء کے پس منظر میں لکھا ہوا ایک شاہکار ناول



مکتبہ داستان

بی آر بی بہتی رہے گی

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ کی ولولہ انگیز کہانی

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

انیقہ اور صباء کے نام

نام کتاب	....	بی آر بی بہتی رہے گی
مصنف	....	عنایت اللہ
ناشر	....	گل فراز احمد
		علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	....	مارچ 2009ء
قیمت	....	170 روپے

☆......ملنے کے پتے......☆

علم و عرفان پبلشرز

40۔اردو بازار، الحمد مارکیٹ، لاہور

فون: 7352332-7232336

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔اردو بازار، لاہور

فون: 7223584، موبائل 0300-4125230

حکایت پبلشرز

26-پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور۔ 7356541 -7321896

تعارف

شیخ سعدی نے اپنی ایک حکایت میں بیان کیا ہے کہ ایک حمام میں میرے محبوب نے مجھے ایسی مٹی دی جس
میں سے خوشبو نکل رہی تھی۔ میں نے مٹی سے پوچھا ــــ ''اے مٹی! تجھ میں یہ خوشبو کہاں سے آگئی؟'' ــــ وہ بولی۔
''میں چند روز پھول کی صحبت میں رہی، اس کی خوشبو مجھ میں سما گئی ہے، وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم۔''
مٹی، مٹی ہی ہے لیکن اس میں جب کسی پھول کی خوشبو سما جاتی ہے تو اس کی حیثیت بدل جاتی ہے ہم اسے
بڑی محبت سے ہاتھوں میں اٹھا لیتے ہیں اور اس کی قدر ومنزلت کرتے ہیں ــــ اور پانی، پانی ہی ہے لیکن جو پانی
دریائے فرات میں بہتا ہے وہ اس لحاظ سے قابلِ احترام ہے کہ اس کے کناروں پر کربلا کے میدان میں امام حسینؓ
نے یزیدیوں کے ظلم وستم کے خلاف سینہ سپر ہو کر جنگ لڑی تھی اور اپنا لہو فرات کے پانی میں شامل کر دیا تھا ــــ اور
لاہور کی نہر بی آر بی اس اعتبار سے مقدّس ہو گئی ہے کہ اس کے دامن کو شہیدانِ پاک کے خُونِ ناب نے
لالہ زار بنا دیا تھا۔

بی آر بی کی نہایت دلچسپ، بصیرت افروز اور جوش آفریں کہانی لکھنے کا شرف عنایت اللہ کے حصّے
میں آیا ہے۔ کہانی پڑھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ مقدّس کام عنایت اللہ ہی خوش اسلوبی سے کر سکتا تھا۔
بی آر بی پہلے بھی بہتی تھی لیکن چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی سحر طلوع ہوئی تو بی آر بی کی ہر لہر پر کروڑوں پاکستانیوں
کی عقیدتیں نچھاور ہو رہی تھیں ــــ بی آر بی جرأت وبسالت کی علامت بن گئی تھی۔ یہ صرف نہر نہیں تھی بلکہ ایک
دلیر سپاہی تھی جس نے پانی کی دیواریں کھڑی کر کے عزیز وطن کی حفاظت کی تھی۔ بی آر بی نے غازیانِ پاک
کے دوش بدوش ایک مجاہد کا کردار ادا کیا تھا۔ پاک فوج کے جانبازوں اور پاک فضائیہ کے شاہبازوں کے
لیے بی آر بی ماں بہن کی مانگ بن گئی تھی جس کی آبرو پر اُنہوں نے جانیں نچھاور کر دیں۔
آج لوگ جب اس نہر کے کنارے جاتے ہیں تو ان کے سر بے اختیار فرطِ عقیدت سے جُھک جاتے
ہیں۔ بی آر بی کے پُلوں سے گزرنے والوں کے قدم خود ہی رک جاتے ہیں اور وہ اس نہر کی آبرو پر شہید ہو
جانے والوں کو آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیے بغیر آگے چل ہی نہیں سکتے۔
بی آر بی کی روانی کمال تمکنت سے غازیوں اور شہیدوں کے گیت گاتی چلی جا رہی ہے۔ عقیدت مندوں
کے دل سے فاتحانہ صدا اٹھتی ہے ــــ ''بی آر بی بہتی رہے گی.... بی آر بی بہتی رہے گی''۔

عنایت اللہ کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے دو مرکزی کردار لے کر اس پُوری داستان کو لکھ دیا ہے جس کا تعلق
اس نہر سے ہے۔ اس نہر نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا اور جو کچھ کیا وہ مکمل 'افسانہ' ہے ــــ ایک بہادر، جرأتمند
اور وطن پرست قوم کا افسانہ جس کی جزئیات، تفصیلات، منظر اور پس منظر دیکھیے تو یہ افسانہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔
ہاجرہ ایک بے کس، بے آسرا اور یتیم لڑکی ہے جس کا اس بھری دنیا میں کوئی غمخوار ہے نہ رازداں۔ وہ سینے
میں بے کسی کی گھٹن لیے در در ٹھوکریں کھاتی ہے۔ ہر جگہ دُھتکاری جاتی ہے۔ وہ پیار مانگتی ہے مگر ہوس آلود نگاہ یہ

اُسے جوانی کی سرمستیوں کا پیغام دیتی ہیں۔ اُسے ماں کی محبت نہیں مل سکتی۔ باپ کی شفقت سے بھی وہ محروم ہے۔ یہاں تک کہ وزیرآباد کے ایک گھرانے میں پہنچ جاتی ہے جہاں نوجوان اقبال نے دوسرے ہی روز فلمی مکالموں کی زبان میں اُس پرحسن وجوانی کے سبھی راز فاش کر دیتے اور اُسے دو روپے دے کر خلاؤں میں بھٹکتا چھوڑ گیا۔

اقبال کے ساتھ ہاجرہ نے کچھ امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ بھٹکا ہُوا ایک بے کس انسان جانے کس کس سے امیدیں وابستہ کر کے تنکوں کے سہارے ڈھونڈتا رہتا ہے مگر وہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔ ڈوبتا ہے اور ڈوب ڈوب کر اُبھرتا ہے۔ ہاجرہ اندھیری رات کی مسافر تھی، صبح کی روشنی کا دُور دُور تک نشان نہ ملتا تھا مگر اُس کا ضمیر اندھیروں کے سمندر میں ڈوب جانے پر تیار نہ تھا چنانچہ اُس کی کمزوری کا احساس شدّت اختیار کر کے ایک مسلسل ذہنی کش مکش بن گیا۔ اُس کی بھٹکی اور دھتکاری ہُوئی ذات میں نفسیاتی جنگ جاری تھی کہ چھ ستمبر کی صبح بھارت کی توپوں اور طیّاروں نے پاکستان کو بیدار کر دیا۔

اقبال جس کی ذہنیت فلمی گانوں اور فلمی ماحول کی پروردہ تھی، محض اتفاق سے لیفٹیننٹ کی حیثیت سے محاذ پر جا پہنچا۔ اُس کا لیفٹیننٹ بن جانا اور بھارت کا حملہ دو مختلف واقعات تھے جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا۔

ہاجرہ محبت۔ پیار اور شفقت کی تلاش میں کانٹوں سے اپنے سینے کو زخمی کرتی رہی۔ اُس نے پھول دیکھ کر ہاتھ بڑھایا تو کانٹوں نے لپک کر اسے لہولہان کر دیا ــــــ افضال کی صورت میں اُسے سچی محبت کا پھُول کھلتا نظر آیا لیکن افضال نہ صرف ہاجرہ کے لیے زہریلا کانٹا ثابت ہُوا بلکہ وہ سارے پاکستان کے لیے مارِ آستین نکلا ــــــ ہاجرہ کی روح کو ایک اور دھچکہ لگا۔ اُس کے سینے کی خلفشار طوفان بن گئی۔

وقت گزرتا گیا، منزلیں آتی رہیں اور گردِ راہ بنتی رہیں، یہاں تک کہ وہی اقبال جس کے شرمناک ارادوں نے ہاجرہ کی حسیّات کو بُری طرح مجروح کر دیا تھا اور جسے ہاجرہ نے ایک بار بد دعا دی تھی کہ "خُدا کرے تیری آنکھوں کے ڈھیلے جل جائیں اور تُو ٹھوکریں کھاتا پھرے" بی آر بی کے کنارے اس کے لیے اپنا عزیز ترین ساتھی بنا اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ ان کے سامنے بی آر بی بہ رہی تھی مگر اقبال اب بی آر بی کی روانی کو دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اسی نہر کے کنارے وطن کے دفاع میں لڑتا ہمیشہ کے لیے اندھا ہو چکا تھا۔ اُس نے آنکھوں کا نُور پاکستان پر قربان کر دیا تھا ــــــ ہاجرہ اُسے کہہ رہی تھی ــــــ "اقبال جی! میری آنکھیں لے لو، تم وہ محاذ تو دیکھ

نیند سوئی ہُوئی نظر آتی ہے۔ پھر یہی طوفان کے تھپیڑوں میں تن تنہا انیس بیس برس کی جواں سال لڑکی بن جاتی ہے طوفان اور تُند ہو جاتا ہے۔

مصنّف قدم بہ قدم لڑکی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اُس نے راہبر و یا راہنما کا کردار ادا نہیں کیا۔ اُس نے ہاجرہ کو پوری آزادی دی اور اُس کی نفسیاتی الجھنوں کے عین مطابق اُسے اپنی راہ چلنے دیا ہے۔ مصنّف اس کے قدرتی پن اور اصلی ہیئت کو بلا مقصد مجروح نہیں ہونے دیتا۔

اس فنی خوبی اور نفسیاتی تجزیے کے ساتھ ساتھ جب مصنّف قاری کو ایک ہزار میل لمبے محاذ پر لے جاتا ہے تو قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ جنگ کا عینی شاہد ہے یا وہ جنگ کی مکمل فلم دیکھ رہا ہے۔ ڈویژنوں کے تصادم، بریگیڈوں کی ٹکر، کمپنیوں اور پلاٹونوں کی مورچہ بندیاں، بھارت کی جنگی قوت، جالندھر میں انڈین آرمی کے انٹیلی جنس کا ہیڈکوارٹر، بھارتی جاسوسوں کی ہولناک سرگرمیاں، غازیوں کے کارنامے، شہریوں کی بیتابیاں غرض جنگ کا وہ کون سا گوشہ ہے جس پر عنایت اللہ کی نظر نہیں گئی اور جب ایمونیشن سے لدی ہوئی مال گاڑی راولپنڈی سے محاذ کی طرف روانہ ہوتی ہے اور بھارتی جاسوس وزیرآباد کے قریب اس گاڑی کی راہ میں بارُود (ڈائنامیٹ) رکھ دیتے ہیں تو قاری پڑھتے پڑھتے بے اختیار کہہ اٹھتا ہے ــــــ "یا خدا! اس گاڑی کو خیریت سے لاہور پہنچا دینا۔ پاکستان کی آبرو کا انحصار اسی گاڑی پر ہے" ــــــ لیکن پاکستان کی قسمت، اُس رات، بھارت کے جاسوسوں کے ہاتھ میں تھی۔

صُوبے دار اکبر علی کا کردار اور بھارت کی ایک حسین و جمیل جواں سال جاسوسہ کا کردار عنایت اللہ کے فن کا ایک اور کمال ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر قاری کو کئی دھچکے لگتے ہیں لیکن مصنّف پتہ نہیں چلنے دیتا کہ کہانی کا رُخ کس طرف ہے۔ عنایت اللہ بیک وقت داستان گو بھی ہے اور ماہر جنگی وقائع نگار بھی ــــــ اور یہ حقیقت ہے کہ فوجی نقطۂ نگاہ سے جس قدر صحیح اور جذباتی لحاظ سے جس قدر ولولہ انگیز وقائع نگاری عنایت اللہ نے کی ہے کوئی نہیں کر سکا۔

عنایت اللہ کی تحریر میں قابلِ تحسین تسلسل، پُرلطف روانی، جزئیات گیری اور تفصیلات پر مکمل گرفت ہے۔ یہ داستان سنانے میں مصنّف کئی مقامات پر جذباتی ہو سکتا تھا لیکن اس نے ہر جگہ فن اور حقیقت نگاری کی خاطر ماہرانہ ضبط سے کام لیا ہے اور توازن کو چابک دستی سے قائم رکھا ہے۔ اس نے اپنی تمام تر فن کارانہ صلاحیتوں سے کام لے کر بڑی درد انگیز اور بڑی ہی دلچسپ کہانی لکھی ہے۔ اس کے قلم کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اُردو ادب میں پہلی بار ایک نہر کو ہیرو کا کردار عطا کیا ہے۔

عنایت اللہ نے بی آر بی کی کہانی لکھی ہے ــــــ اُس نہر کی جو آج لاہور کے قریب ہی نہیں، مغربی پاکستان میں ہی نہیں، پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بہ رہی ہے۔ پاکستان کے ہر قصبے، ہر گاؤں اور ہر گلی میں بہ رہی ہے۔ اس کے سامنے پاکستانیوں کے سر عقیدت سے جھکے جا رہے ہیں ــــــ بی آر بی بہتی رہے گی۔ انشاء اللہ بہتی رہے گی۔

میرزا ادیب ــــــ لاہور
ستمبر ــــــ ۱۹۶۷ء

پیش لفظ

یہ ناول جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے فوراً بعد لکھا گیا اور اسی عنوان سے چھپا تھا لیکن یہ مکمل کہانی کی تلخیص تھی۔ اب بیس برس بعد، یہ ناول اُسی عنوان سے پھر پیش کیا جا رہا ہے جس میں وہ واقعات اور کردار بھی شامل کیے گئے ہیں جو تلخیص میں نہیں آ سکے تھے۔ اس طرح یہ کہانی مکمل ہو گئی ہے۔

"بی آر بی بہتی رہے گی" ایک بار پھر پیش کرنے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس کی گئی ہے کہ جو بچے ستمبر ۶۵ء میں پیدا ہوئے تھے یا اُس وقت بہت چھوٹے تھے، وہ اب جوان ہو گئے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو ایک ایک بچے کے باپ بن گئے ہوں گے۔ ان جوانوں تک اپنی تاریخ اور اپنی روایات پہنچانا قومی وقار، استحکام اور پاکستان کی باوقار بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے متعلق "خاکی وردی لال لہو" پیش کیا جا چکا ہے۔ "بی آر بی بہتی رہے گی" جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے پس منظر میں لکھا ہوا ناول ہے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بی آر بی بہت مشہور ہوئی تھی بلکہ یہ نہر پاکستان کی آن اور آبرو کی علامت بن گئی تھی۔ لاہور سیکٹر کی جنگ اسی نہر کے کنارے لڑی گئی تھی۔ ہمارے جیالے جانبازوں نے اس نہر پر جانیں قربان کر دی تھیں۔

آج کی نسل بی آر بی کے نام سے بھی شاید واقف نہیں ہو گی۔ بی آر بی مخفف ہے بمبانوالی راوی بیدیاں نہر کا۔ یہ نہر پاکستانیوں نے اپنی مدد آپ کے اصول پر کھودی تھی۔ کھودنے والوں میں تانگہ بان بھی تھے، پروفیسر بھی، دیہات کے لوگ بھی۔ جوں جوں نہر آگے بڑھتی جاتی تھی، اُس علاقے کے لوگ دوڑ دوڑ کر پہنچتے اور نہر کھودتے تھے۔

بی آر بی ہمارے لیے دریائے فرات کی طرح قابلِ احترام ہے جس کے کناروں پر کربلا کے میدان میں امام حسینؓ نے یزیدیوں کے ظلم و ستم کے خلاف جنگ لڑی اور اپنا خون فرات کے پانی میں شامل کر دیا تھا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کے المیہ یعنی سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد پاکستان میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ ہماری فوج لڑنے کے قابل ہی نہیں۔ ہمارے دشمن کے ایجنٹوں نے اس غلط تاثر کو ہمارے ذہنوں میں پختہ کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاک افواج کی شجاعت اور جذبہ حب الوطنی کے جو غیر معمولی مظاہرے مشہور ہوئے تھے وہ محض افسانے تھے۔

یہ بے بنیاد اور تخریبی پروپیگنڈہ پاکستان کے بعض ادیبوں نے تحریری طور پر اور اپنی محفلوں میں تقریری طور پر بھی کیا۔ اُدھر ریڈیو اور ٹی وی سے پاک بھارت جنگوں کا ذکر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس طرح دشمن کے پروپیگنڈے نے پورا اثر کیا اور لوگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے جذبے کو بھول گئے۔

باتیں بے شمار ہیں۔ تھوڑی سی جگہ میں سما نہیں سکتیں۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ملت پاکستان پر انکشاف ہوا تھا کہ ہم میں اسلام کی عسکری روح اور روایت زندہ ہے اور ہم باطل کے پہاڑوں

کو ریزہ ریزہ کر سکتے ہیں۔ ہماری افواج نے جس شجاعت اور شہادت کے اور قوم نے جس ایثار کے مظاہرے کیے تھے، اسے ہم جذبۂ ستمبر کا نام دیتے ہیں۔ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یہی اہمیت تھی۔

اس جذبے کو زندہ رکھنے کے لیے میں نے یہ ناول لکھا ہے۔ یہ ہے تو ناول لیکن اس کی بنیاد حقیقت پر رکھی گئی ہے۔

۱۹۶۷ء میں ناول لکھا تو میرے بزرگ دوست محترم میرزا ادیب جو ادب کے میدان میں اساتذہ کی فہرست میں آتے ہیں اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ناول کا تعارف لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اسے سعادت سمجھا۔ میرزا ادیب نے تعارف لکھا جو میں نے ناول میں شامل کیا۔ یہ تعارف اب بھی ناول کے ساتھ ہے۔ یہ ناول پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ اپنی اُبھرتی ہوئی نسل اور آنے والی نسلوں کے لیے یہ ناول کس قدر ضروری ہے۔

عنایت اللہ
مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

لیفٹیننٹ

اقبال کی آنکھوں کے دیئے بجھ گئے ہیں۔ وہ اب کلیوں اور کانٹوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ چُبھن اور بُو سے بتا سکتا ہے کہ یہ کانٹا اور یہ کلی ہے۔ اس کی پُرشباب زندگی کبھی نہ ختم ہونے والی رات بن گئی ہے — سیاہ کالی، گُھپ اندھیری بانجھ رات جس کے بطن سے سحر کبھی جنم نہ لے سکے گی — اس تیرگی میں اُسے ایک نسوانی آواز سنائی دیتی ہے "اقبال جی! میری آنکھیں لے لونا!" — اور وہ مسکرا دیتا ہے۔

"مان جاؤ نا اقبال جی!" — آواز بار بار سنائی دیتی ہے "ڈاکٹر کہتا ہے کوئی تکلیف نہیں ہوتی ..... لے لونا، اقبال جی میری آنکھیں!"

اس آواز میں پیار کا الاؤ دہک رہا ہوتا ہے جو اقبال کی رُوح کو روشن کر دیتا ہے۔ کبھی تو اُس کی ہنسی نکل جاتی ہے اور وہ ہاجرہ کو سینے سے لگا لیتا ہے۔

ہاجرہ کو کس نے کبھی سینے سے لگایا تھا؟ اُس نے تو اکثر رو رو کر خدا سے التجائیں کی تھیں — "یا خدا، مجھے دنیا سے اُٹھا لے یا ان تمام مردوں کو اندھا کر دے" — اُسے جیسے دنیا کے تمام مردوں سے نفرت تھی۔ اُسے تو اپنے آپ سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ وہ تو مردوں کی آنکھیں پھوڑ دینے پر تُلی رہتی تھی لیکن اب اقبال کے سینے سے لگ کر اُسے وہی سکون اور وہی مسرت محسوس ہوتی تھی جس کے لیے وہ نو دس برس کی عمر سے ترس رہی تھی، مگر اقبال کی اندھی آنکھوں کو دیکھ کر اُسے یوں دکھ ہوتا تھا جیسے وہ اسی کی بددعا سے اندھا ہو گیا ہو۔

لیفٹیننٹ اقبال کے سینے کی تپش میں ہاجرہ کو ماں کے سینے کا گداز یاد آجایا کرتا تھا۔ ماں اُسے اسی طرح وارفتگی سے سینے سے لگایا کرتی تھی مگر دس برس گزرے ماں کا سینہ برف کا تودہ بن گیا تھا۔

وہ راولپنڈی کی ایک یخ بستہ رات کی ہولناک واردات تھی۔ دس گیارہ برس پہلے، اُس رات کی تیرگی ٹھٹھر کے جم گئی تھی۔ ہاجرہ نو دس برس کی بچی تھی۔ راولپنڈی ہولی فیملی ہسپتال کے قریب ایک جھگی میں ماں کے پاس زمین پر گہری نیند سو رہی تھی۔ تن پر ایک قمیض اور پاجامہ تھا جو اُس کی ماں نے اُس کے باپ کی پرانی قمیض سے بنایا تھا۔ اُس کا باپ پھٹے پرانے کمبل میں لپٹا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ایسے ہی ایک کمبل میں اُس کی ماں اپنے

جاگ اٹھی اور رو پڑی تھی، مگر بجتے دانت اُسے رونے بھی نہ دیتے تھے۔ ماں نے کمبل دوہرا کر کے ہاجرہ پر ڈال دیا تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہی ایک پھٹا پرانا کمبل حائل تھا۔ جب موت کے برفانی ہاتھ کمبل کو بھی تار تار کرنے لگے تو ماں خود اپنی بچّی اور موت کے درمیان آگئی۔ وہ بچّی کے اوپر اس طرح لیٹ گئی تھی کہ بچّی پر جسم کا وزن بھی نہ پڑے اور اُسے سردی بھی نہ لگے۔

دوسری صبح جب کوئلے اور بجلی سے گرم کیے ہوئے کمروں میں رہنے والے انگیٹھیوں اور ہیٹروں کے پاس بیٹھے اخباروں میں ایک سیاسی جماعت کے لیڈر کی تصویر دیکھ رہے تھے جس میں وہ غریبوں میں کمبل تقسیم کر رہا تھا تو پاکستان کے دارالحکومت کے سینے پر سرکنڈوں کی تھر تھر کانپتی ایک جھگّی میں ہاجرہ کی ماں اور اُس کے باپ کی اکڑی ہوئی لاشیں پڑی تھیں اور ننھی منّی ہاجرہ دونوں لاشوں کے درمیان بیٹھی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ دونوں سردی سے اکڑ کر مر گئے تھے اور ہاجرہ ماں کی لاش اور دوہرے کمبل کے نیچے مرنے سے بچ گئی تھی۔

ہاجرہ کو اُس کے ماں باپ نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ مقبوضہ کشمیر سے نکالے ہوئے لوگ ہیں۔ ہاجرہ ابھی ایسی باتیں سمجھنے کے قابل نہیں تھی۔ اُس وقت وہ دودھ پیتی بچّی تھی جب اُس کے وطن کی زمین ان پر تنگ ہوگئی تھی۔ کمالہ نے کشمیر جنّت نظیر کو جہنّم بنادیا اور کشمیر کے حُسن کو کشمیری مسلمانوں کے خون میں ڈبو دیا تھا۔ ہاجرہ کی ایک جوان خالہ اور دو بچے کشمیر میں ہی رہ گئے اور کشمیر کی خاک میں مل کر خاک ہوگئے تھے۔

وہ کشمیر سے بے گھر ہو کر نکلے تو مرنے تک بے گھر ہی رہے۔ ایک سال سے کشمیر کے ان مہاجرین نے راولپنڈی کے اس میدان میں آکر جھگیاں بنائی تھیں۔ ان لرزتی کانپتی جھگیوں اور مارگلہ کے سرد جھکڑوں کے درمیان کچھ بھی حائل نہ تھا۔

وہ پاکستان کو اپنا دیس سمجھ کر آئے تھے مگر اپنے دیس میں وہ پردیسی ہوگئے۔ پاکستانی معاشرے میں انہیں اتنی سی اہمیت دی گئی کہ وہ بڑے سستے مزدور تھے۔ تھوڑے سے پیسوں پر بہت زیادہ کام کر دیتے تھے۔

سردیوں کا موسم آیا تو ہاجرہ کا باپ ایک روز بڑی دُور سے ان درختوں سے چھوٹے چھوٹے ٹہن کاٹ کر اور گٹھا بنا کر لا رہا تھا جو درخت کسی کی ملکیت نہیں تھے۔ اپنی جھگیوں کے قریب آیا تو پولیس کا ایک آدمی اُسے راستے میں مل گیا۔ اُس نے لکڑیوں کا گٹھا دیکھا تو اُسے دو تین گالیاں دے کر پوچھا کہ وہ لکڑیاں کہاں سے لایا ہے؟

"حضور!۔۔۔" ہاجرہ کے باپ نے کہا۔۔۔ "بڑی دُور سے کاٹ کر لایا ہوں۔"

"سیدھے تھانے چلو"۔۔۔ پولیس والے نے اُسے حکم دیا۔۔۔ "سرکاری درخت کاٹتے پھرتے ہو؟.... چلو میرے آگے آگے۔ چھ مہینے سزا ملے گی تجھے۔"

وہ لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے پولیس والے کی منّت سماجت کرتا گیا لیکن پولیس والے نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ اُسے تھانے لے جانے کی بجائے اپنے گھر لے گیا اور کہا کہ لکڑیاں اندر پھینکو اور بھاگو یہاں سے۔ ہاجرہ کے باپ نے گٹھا اس کے گھر میں پھینکا اور چل پڑا پھر دروازے میں رُک گیا۔

"حضور!۔۔۔" اس نے پولیس والے سے بھیک مانگنے کے لہجے میں کہا۔ "چار آنے مزدوری ہی دے دو۔"

پولیس والے نے اُسے دو آنے اور ایک گالی دے کر کہا۔۔۔ "جا دفع ہو جا۔"

دوسرے دن کا بوجھ آنے دو آنے پر اٹھانے والے نے اس دھرتی سے اپنا بوجھ اٹھا دیا۔ ساتھ والی جھگیوں والوں نے ہاجرہ کی ماں اور باپ کی لاشوں کو ان ہی کے بوسیدہ کمبلوں میں لپیٹ کر قبروں میں اتار دیا اور اوپر ٹھنڈی یخ مٹی ڈال دی۔ ہاجرہ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ہچکیاں سینے میں گھُٹ گئیں۔ آنسو آنکھوں میں اٹک گئے۔ پسلیوں نے دل کو جکڑ لیا اور وہ قبرستان میں مٹی کے دو ڈھیروں کے درمیان بیٹھ گئی تھی۔

جانے کون تھا جو اُسے قبرستان سے اٹھا لایا تھا۔ وہ معصوم سی بھولی بھالی بچی تھی۔ راولپنڈی کی سردی نے اُسے ایک ہی رات میں عورت بنا ڈالا تھا۔۔۔ دکھیاری، غموں کی ماری عورت۔۔۔ اُس کے لیے پیار ٹھٹھر کے مر گیا تھا اور لوگوں نے اس پر مٹی ڈال دی تھی۔ وہ ماں مر گئی تھی جو اُسے ساتھ لیے گھر گھر برتن مانجھنے جایا کرتی تھی لیکن اُس نے ننھی ہاجرہ کے ہاتھ کبھی میلے نہ ہونے دیے تھے ورنہ ان جھگیوں میں رہنے والے اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو گھروں، دکانوں، ہوٹلوں اور بیکریوں میں یا ورکشاپوں میں گاڑیاں صاف کرنے پر دس دس روپے ماہوار اور دو وقت کی روٹی پر نوکر کرا دیا کرتے تھے۔ ان بچّوں کی معصومیت دو وقت روٹی کے چکر میں الجھ کر دم توڑ جاتی تھی۔ طلوعِ سحر سے رات دس گیارہ بجے تک محنت مشقّت کرتے یہ بچے بچپنے میں جوان اور جوانی میں بوڑھے ہو جایا کرتے تھے۔

☆

ماں باپ مر گئے تو چند دنوں بعد جھگیوں والوں نے ہاجرہ کو بھی ایک گھر میں نوکر کرا دیا۔ جب اسے نوکر رکھنے والوں کو پتہ چلا کہ بچّی لاوارث ہے تو تنخواہ کا سوال ہی ختم ہوگیا اور ہاجرہ دو وقت کی روٹی اور رات باورچی خانے میں دو کمبلوں میں سونے کی عیاشی کی خاطر صبح سے رات گئے تک اتنے بڑے گھرانے کی خدمت کرنے لگی۔ ننھی ہاجرہ کے سامنے جینے کا یہی مقصد تھا کہ پیٹ بھر روٹی مل جائے اور رات سردی نہ لگے مگر ماں باپ مر گئے اور اس سے مشقت کرائی جانے لگی تو اُسے پیار اور شفقت کی تشنگی کا بھی احساس ہونے لگا۔ یہ احساس زہر آلود تھا۔

اُس کا دل پرائے گھر کے فرش اور فرنیچر کی گرد اور جھوٹے برتنوں کے انبار سے نہ لگ سکا اور دل ماں کے پیار اور باپ کی شفقت کی جستجو میں بھٹکنے لگا۔ اس گھر کے بچے ہنستے کھیلتے اور ناچتے کودتے تھے۔۔۔ ہاجرہ بھی ان ہی جیسی اور ان ہی جتنی بچّی تھی۔ ایک روز کام چھوڑ کر ان بچوں سے جا ملی۔ پہلے تو بچوں نے اُسے دھتکارا پھر بچوں کی ماں کو پتہ چلا تو اس نے ایک ہی ڈانٹ میں اُس سے بچپن چھین لیا۔

اُس شام ہاجرہ اپنے ماں باپ کی قبروں کے درمیان جا بیٹھی اور روتے روتے شام کا اندھیرا گہرا ہوگیا۔ اگر اُسے بھوک اور سردی نہ لگتی تو شاید مٹی کے ان دو ڈھیروں کے درمیان ہی سو جاتی۔ وہ اٹھی تو اندھیرے سے ڈرنے لگی، پھر اپنے آقاؤں کا خوف اُسے ادھ مُوا کرنے لگا۔ اس نے کہیں اور بھاگ جانا چاہا لیکن کہاں؟ ننھے مُنّے ذہن میں دو سوال سانپوں کی طرح پھنکارنے لگے۔۔۔ روٹی کون دے گا؟ کمبل کون دے گا؟۔۔۔ اُسے اپنی جھگی یاد آئی۔ اُس کے آنسو نکل آئے اور وہ سسکیاں لیتی چل پڑی۔

وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں داخل ہوئی تو باورچی خانہ بم کی طرح پھٹا۔۔۔ "کہاں مر

گئی تھی نامراد؟"

وہ سہم کر پیچھے ہٹی۔ پیشتر اس کے کہ دیکھے یہ کس کی آواز تھی اُس کے گال پر زنّاٹے دار تھپڑ پڑا۔ کمرے میں تارے ٹوٹنے لگے اور چھت سے لٹکتے بلب کی روشنی دھندلا گئی۔

☆

اس غم آلود دھندلکے میں چھ سال بیت گئے۔

چھ بڑے ہی لمبے لمبے سال، جیسے وہ تن تنہا بے رحم صحراؤں کی ریتلی چٹانوں کی بھول بھلیوں میں چھ برس بھٹکتی رہی ہو۔ پیار کی پیاس سے دل پر کانٹے اُگ آئے جو اُس کے سینے کو چبھ چبھ کر لہولہان کرتے رہے۔ یہ زہریلی خلش اُسے جینے نہیں دیتی تھی اور یہ خلش اُسے مرنے بھی نہیں دیتی تھی۔

ان چھ برسوں میں اُس نے یکے بعد دیگرے چار گھروں میں نوکری کی۔ ایک گھر کے جور و ستم سے اُکتا جاتی تو بھاگ کر کسی اور گھر میں جا نوکری کرتی۔ وہ پیار اور شفقت کی جستجو میں در در بھٹک رہی تھی۔ اُس نے ان گھروں میں بچے کھچے مگر اچھے اچھے اور طرح طرح کے کھانے کھائے اور کسی بھی گھر میں اُسے سردی نہ لگی مگر وہ اپنے بھوکے ننگے اور جاڑے سے ٹھٹھرتے ہوئے بچپن کو دل سے نہ اُتار سکی۔

اُس کا دل مسلسل پھر اُسی جھونپڑی میں بھاگ جانے کے لیے ترستا رہا جہاں اُس کی ماں اُسے سینے سے لگائے اکڑ کر مر گئی تھی۔

وہ اب جوان ہو گئی تھی مگر اُس کے سینے سے فریادیں نکلتی رہتی تھیں — "مجھے میرا بچپن لوٹا دو۔"

وہ تو جوان ہو گئی مگر دل بچپنے اور جھگی سے نہ نکل سکا۔ برتن دھوتے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتے تھے اور دوسرے چوتھے روز ایک آدھ برتن، پیالی یا پلیٹ ٹوٹ جاتی تھی۔ اس چھنّاکے کے معاً بعد اُسے جانے کیسی کیسی گالیاں سننی پڑتی تھیں اور ایک گھر تو ایسا تھا جہاں دو چار تھپڑ بھی پڑ جاتے تھے۔ ٹوٹتے برتنوں کی تلخ آوازیں، گالیاں، گھڑکیاں، کوسنے اور تھپڑ اُس کی ذات میں قیامت بپا کیے رکھتے تھے اور اُسے کسی گھر میں ٹکنے نہ دیتے تھے۔

اُس نے پانچویں گھر میں جہلم جا نوکری کی۔ چھٹا گھر کیمبل پور میں ملا اور اب وہ وزیرآباد کے ایک گھرانے میں نوکری کر رہی تھی۔

اُس کی عمر کا سترھواں برس بھی گزر چلا تھا لیکن اُسے ذرّہ بھر احساس نہ تھا کہ وہ جوان ہو گئی ہے۔ اُس پر بے رحم سا سکوت طاری رہتا تھا۔ ایسی خاموشی جیسے وہ گونگی اور بہری ہو۔ اُس نے اب تک جتنے گھروں میں نوکری کی تھی وہاں کوئی جوان لڑکا نہ تھا نہ اُسے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ گھر کے کاموں ہی میں دن گزر جایا کرتا تھا لیکن وزیرآباد کے اس گھر میں ملازم ہوئی تو اس گھر کے جواں سال بیٹے، اقبال، نے دوسرے ہی روز فلمی مکالموں کی زبان میں اُس پر حُسن و جوانی کے راز فاش کر دیے۔ ہاجرہ نے عمر میں پہلی بار اپنے ہاتھ میں دو روپے دیکھے۔

اُس نے چھ سال دھن والوں کی خدمت کی تھی لیکن روٹی، کپڑے اور بستر کے سوا اُسے کوئی اُجرت نہیں ملتی تھی۔ وہ تمام گھرانے ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر ذہنیت ایک سی تھی۔ وہ سب ٹوٹے ہوئے برتنوں کے پیسے کاٹ لیا کرتے تھے اور یوں اُس کی مہینے بھر کی اُجرت دو وقت کی روٹی

اور دو کمبل رہ جاتی تھی۔ پھر بھی ہاجرہ مطمئن تھی کہ لوگ اُسے بھوکا نہیں رکھتے اور رات باہر نہیں نکال دیتے۔

اُس روز وزیرآباد کے اس گھر میں جواں سال اقبال نے باورچی خانے میں اُس کے ساتھ مسکرا کر آوارہ لب و لہجے میں باتیں کیں تو ہاجرہ کو پہلی بار علم ہوا کہ وہ جوان ہو گئی ہے۔ اُس کے بال بڑے پیارے اور گردن لمبوتری ہے، اُس کے قدبُت میں جاذبیت اور آنکھوں میں جوانی کا خمار ہے اور اُسے پہلی بار پتہ چلا کہ وہ کشمیرن ہے اور کشمیر کا سارا حُسن اُس میں سمٹ آیا ہے۔

اقبال نے اُس کا ہاتھ تھاما، ہاتھ میں دو روپے دیے اور باورچی خانے سے نکل گیا۔ ہاجرہ بے خیالی سی میں غسل خانے میں چلی گئی اور آئینے میں اپنے چہرے مہرے کو بڑی غور سے دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ کسی اجنبی اور خوبصورت لڑکی کو دیکھ رہی ہو۔ اُس نے روپے روپے کے دو نوٹ مٹھی میں بھینچ لیے۔ اُسے اقبال کی باتیں یاد آنے لگیں:

"ہاجرہ تم نوکرانی نہیں۔ میرے دل کی رانی ہو۔ تم نے اپنی جوانی اور حُسن کو روٹی کپڑے پر بیچ ڈالا ہے..... تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو ہاجرہ مجھے تم سے پیار ہے۔"

نوٹوں کو ہاتھ میں مسلتے وہ باورچی خانے میں چلی گئی اور گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ اقبال کی باتیں جلترنگ کی طرح سنائی دے رہی تھیں — "تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو ہاجرہ! مجھے تم سے پیار ہے۔"

ماں باپ کے مرنے کے بعد یہ پہلا انسان تھا جس کے منہ سے اُس نے پیار کے دو بول سُنے تھے اور باہر کی دنیا کی یہ پہلی آوازیں تھیں جنہوں نے اُس کی ذات کے چپ چاپ سمندر میں لذت آگیں تلاطم بپا کر دیا تھا ورنہ وہ تو گردوپیش کی اچھی بری آوازوں سے بیگانہ رہا کرتی تھی۔ اُسے سکون سا محسوس ہونے لگا۔ ایسا سکون جس کا ذائقہ اُس نے جھگی میں چکھا تھا جہاں اُس کی ماں اور باپ ٹھٹھر کر مر گئے تھے۔ اُس کے ہونٹوں سے سکون اور مسرّت کی آہ نکل گئی اور اُس کے دل سے آواز اٹھی — "اقبال بہت پیارا آدمی ہے۔"

اُس نے مٹھی میں جکڑے ہوئے دو روپے دیکھے تو اُسے تلخ سا خیال آیا — "اقبال نے مجھے پیار کی قیمت دی ہے..... دو روپے" — وہ چونک اٹھی اور اپنے آپ سے کہنے لگی — "قیمت؟..... پیار کی بھلا قیمت ہوتی ہے؟..... نہیں..... نہیں..... میں اقبال کو یہ روپے واپس کر دوں گی۔ میں پیار کی قیمت نہیں لوں گی" — اُس کے جی میں آئی کہ اقبال پھر باورچی خانے میں آئے اور اُسی طرح پھر کہے — "ہاجرہ! مجھے تم سے پیار ہے" — اور میں اُسے دو روپے واپس کر دوں۔

☆

وہ دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ ہاجرہ نیند میں بھی بے چین رہی ورنہ وہ تو بے سُدھ ہو کر سویا کرتی تھی۔ صبح جاگی تو اُس کے ذہن میں اقبال کا خیال مچل رہا تھا۔

ناشتے کے بعد اقبال ہاجرہ کو باورچی خانے میں اکیلا دیکھ کر آ گیا۔ ہاجرہ کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ اقبال نے اُس کے ہاتھ تھام لیے اور کل والی باتیں شروع کر دیں لیکن ہاجرہ نے محسوس کیا کہ اُس کی باتوں میں کل والی بُو باس نہیں ہے۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اقبال کی باتوں سے اُسے گھن کیوں آ رہی ہے کہ اقبال نے نہایت فحش حرکت کر ڈالی۔

ہاجرہ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

اُس نے اقبال کی آنکھوں میں دیکھا تو ان آنکھوں میں اُسے نہ باپ کی چمک نظر آئی نہ ماں کی جھلک نہ ان آنکھوں میں اُسے پیار کا نام و نشان ملا۔ وہ کوئی ایسی چالاک اور ہوشیار لڑکی تو نہیں تھی لیکن اقبال کی آنکھوں کی چمک اور مسکراہٹ اس قدر ننگی تھی کہ ہاجرہ کو سمجھنے میں ذرہ بھر دیر نہ لگی کہ اقبال ہر دبے اور وہ نوجوان لڑکی۔

اقبال نے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور ہاجرہ کی مٹھی میں دے کر اُسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر زور سے بھینچا۔ ہاجرہ تڑپ اٹھی اور اُس کے بازوؤں سے نکلنے لگی۔ اقبال کا ہاتھ اُس کے سینے پر جا پڑا۔

"میں رنڈی تو نہیں صاحب جی!" — ہاجرہ تیغ سا گھونٹ نگل کے بولی — "تم نے پھر اس طرح کیا تو میں بی بی جی سے کہہ دوں گی" — اُس نے پانچ کا نوٹ اقبال کی طرف پھینک دیا اور اپنے آزار بند کے ساتھ بندھے ہوئے کل والے دو روپے کھول کر پانچ کے نوٹ کے قریب پھینک دیئے اور باہر نکل گئی۔ اُس کے سینے پر منوں وزنی سِل آ گری تھی جسے وہ کہیں پھینک دینا چاہتی تھی۔

اقبال اس دھمکی سے ڈر جانے والا نہیں تھا کہ میں "بی بی جی سے کہہ دوں گی"۔ لاہور کے جس کالج میں وہ پڑھتا تھا وہاں ایسی دھمکیاں اُسے آئے روز ملا کرتی تھیں۔ بڑی بڑی طرحدار لڑکیوں نے اُسے کالج سے نکلوا دینے کی دھمکیاں دی تھیں لیکن چار سال گزر گئے تھے اور اُسے کوئی نہ نکلوا سکا تھا۔

اقبال ماں باپ کا اکلوتا مگر بگڑا ہوا بیٹا تھا جو بی۔ اے کے آخری سال میں دو بار فیل ہو چکا تھا۔ اس کا اُسے کوئی غم نہ تھا۔ ماں باپ اُسے بے دریغ روپیہ پیسہ دیئے جا رہے تھے اور وہ اوباش پن اور عشق بازیوں میں زندگی گزار رہا تھا۔ پڑھنے پڑھانے سے اُسے ذرہ بھر دلچسپی نہیں تھی لیکن کالج سے اُسے بے پناہ پیار تھا کیونکہ کالج کے نام پر ہی اُسے ماں باپ سے منہ مانگے پیسے مل رہے تھے۔ اُس نے ہوسٹل میں الگ کمرہ لے رکھا تھا جس کے بند کواڑوں کے پیچھے ایک دو لڑکیوں کی دبی دبی، چوری چھپے کی ہنسی اکثر سنائی دیتی تھی۔

ان دنوں وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گھر آیا ہوا تھا۔ اُسے آئے ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ ہاجرہ کو ان کے گھر میں نوکری مل گئی تھی اور وہ ہاجرہ کو روپے پیسے اور چرب زبانی کے کمال سے ہوس کے جال میں اُلجھانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ پہلے دو روپے پھر پانچ روپے اور ایک روز اُس نے ہاجرہ کو دس روپے دینے کی کوشش کی لیکن ہاجرہ نے دل میں نفرت کے طوفان روک کر خاموشی سے یہ دس روپے بھی ٹھکرا دیئے اور پھر وہی دھمکی — "بی بی جی سے کہہ دوں گی"۔

ہاجرہ نے یہ دھمکی تو دے دی لیکن وہ بی بی جی سے شکایت کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ وہ اس گھر سے بھاگنا بھی نہ چاہتی تھی کیونکہ چھ سات برسوں بعد اُسے پہلا گھر ملا تھا جہاں گالیاں دینا تو درکنار اُس سے کوئی ہلکی سی ترش کلامی بھی نہ کرتا تھا۔ ایک روز اُس سے ایک پلیٹ ٹوٹ گئی تھی تو وہ لرز اٹھی تھی لیکن اُسے کسی نے گالی نہ دی نہ تنخواہ میں سے پیسے کاٹ لینے کا رعب دیا۔ اقبال کی ماں نے ٹھہرے ٹھہرے لب و لہجے میں صرف اسی قدر کہا تھا — "ہائے ہاجرہ! تو نے دوسری پلیٹ بھی توڑ دی۔ ایسی دو ہی پلیٹیں تھیں، ایک مجھ سے ٹوٹ گئی تھی۔ میرے جہیز سے یہی دو پلیٹیں باقی تھیں.... چلو کوئی بات نہیں، بڑا پرانا ڈیزائن تھا"۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہاجرہ کو کسی کا برتن توڑ کر دکھ ہوا تھا، ورنہ برتن توڑ کر اُسے خوشی سی محسوس ہوا کرتی تھی

کہ چلو کمبختوں کا کچھ تو نقصان ہوا۔ اُس روز کے بعد وہ برتن دھوتے اس قدر محتاط ہو گئی جیسے اس گھر کے برتن اُس کے اپنے جہیز کے ہوں۔

اقبال کی ماں کا یہ پُرشفقت رویّہ دیکھ کر وہ اقبال کے خلاف شکایت نہ کرنا چاہتی تھی۔ ڈرتی تھی کہ ماں کے دل کو تکلیف ہو گی۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے اُس کی بات پر کوئی یقین ہی نہ کرے۔ اپنی اولاد کو کون بُرا سمجھتا ہے!

اقبال کی چھیڑ خانی دست درازیوں کی صورت اختیار کر گئی اور ہاجرہ چُپ چاپ برداشت کرتی رہی۔ ایک روز گھر والے کسی کی شادی پر چلے گئے تو ہاجرہ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ اقبال بھی چلا گیا تھا مگر تھوڑی دیر بعد لوٹ آیا۔ اُس نے ہاجرہ کو اپنے کمرے میں بلا کر اداکاری کے تمام تر کمالات آزما ڈالے۔ ہاجرہ کو سونے کی چوڑیوں، بالیوں اور ریشمی دوپٹے کے لالچ دیئے۔ اُسے کھینچ کھینچ کر اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کی لیکن ہاجرہ کے آنسو بہہ نکلے۔

"اقبال جی!" — ہاجرہ دکھیاری اور ہاری ہوئی آواز میں بولی — "تم تو مرد ہو۔ کسی بھائیوں والی بہن کو جا چھیڑو نا! بے آسرا نوکرانی کو چھیڑنا جوانمردی تو نہیں"۔

اُس کے لب و لہجے میں بے بسی اور شکست خوردہ التجا تھی مگر اقبال کا دل پتھر تھا، پتھر ہی رہا۔ اُس نے اداکارانہ آہ لے کر ہاجرہ کے دونوں رخساروں کو ہاتھوں میں تھام لیا۔

"یہ چھیڑ خانی تو نہیں ہاجو!" — اُس نے ہنستے ہوئے کہا — "اسے عشق کہتے ہیں... تیرے عشق نے اندھا کر دیا ہے"۔

"خدا کرے تو اندھا ہی ہو جاتے" — ہاجرہ نے جل کر کہا — "مجھ نامراد کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے! خدا کرے تیری آنکھوں کے ڈھیلے جل جائیں اور تو ٹھوکریں کھاتا پھرے"۔

اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس نے اقبال کے ہاتھ جھٹک ڈالے اور سسکیاں لیتی باہر نکل گئی۔

☆

دو سال بعد، جب اقبال کی آنکھوں کے ڈھیلے بیدیاں کے محاذ پر بھارتی مارٹر گن کے گولے نے جلا ڈالے اور وہ عمر بھر کے لیے اندھا ہو گیا تو ہاجرہ اُس کا ہاتھ تھامے بی آر بی کے کنارے کھڑی اُسے کہہ رہی تھی — "اقبال جی! میری آنکھیں لے لو نا! میں نے ڈاکٹر سے پوچھ لیا ہے۔ کہتا ہے آنکھیں نکالتے اور ڈالتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوتی"۔

"مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے ہاجرہ!" — اقبال نے اُسے کندھے سے تھام کر قریب کر لیا اور بولا — "میں تمہاری آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ بیدیاں سیکٹر ہے۔ میں بی آر بی کے کنارے کھڑا نہر کی روانی سُن رہا ہوں۔ لگتا ہے جیسے یہ روانی مجھے نظر آ رہی ہے۔ کہو تو بتا دوں کہ میں بغیر آنکھوں کے کیا دیکھ رہا ہوں.... دائیں طرف ٹوٹا ہوا پُل ہے جسے برستے گولوں میں سیپرز نے لہولہان ہو کر ڈائنامیٹ سے اُڑایا تھا۔ اس پُل پر ایسٹ بنگال رجمنٹ کے شیروں نے جانیں قربان کر کے پنجاب کی لاج رکھ لی تھی۔ میری آنکھیں یہیں ضائع ہوئی تھیں.... ضائع نہیں ہوئی تھیں ہاجرہ! میری آنکھیں قربان ہو گئی تھیں" — اُس نے ہاجرہ کی میڈھا اپنے سینے سے لگا کر کہا — "آج تم یہاں لے آئی ہو تو بی آر بی کی روانی کے جلترنگ نے میری روح کے دریچے کھول دیئے

ہیں۔ لگتا ہے جیسے مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے۔"

اور اُس روز، دو برس پہلے، ہاجرہ کو گھر میں اکیلا دیکھ کر اقبال نے اُس کے گال تھام لیے اور ماتھے کا گناہ آلود بوسہ لیا تھا تو ہاجرہ نے جل کر کہا ـــــ "خدا کرے تو اندھا ہو جائے" ـــــ اور وہ باورچی خانے میں چلی گئی تھی اور اندر سے چٹخنی چڑھا کر پھُوٹ پھُوٹ کر روتی رہی تھی۔ بیچارگی کا احساس اُسے ڈس رہا تھا اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس لڑکی کی آبرو کا خدا ہی حافظ ہے جس کا کوئی بھائی نہ ہو۔ پہلے تو وہ صرف بھوک، سردی اور بیاہ کی تشنگی کو محسوس کیا کرتی تھی، مگر اقبال نے اُسے بے آبرو کرنے کی کوشش کی تو اُس پر انکشاف ہوا کہ بے آبروئی، بھوک اور سردی سے زیادہ بے رحم ہے۔

☆

ڈیڑھ ماہ کی چھٹیاں گزار کر اقبال لاہور چلا گیا تو ہاجرہ کو خوشی سی ہُوئی۔ اقبال کا لاہور چلے جانا اُس کی زندگی کا پہلا خوش گوار واقعہ تھا ورنہ وہ تو مسرّت کے نام ہی سے ناآشنا تھی مگر یہ خوشی دوسرے ہی روز دم توڑ گئی جب اُسے پہلی بار سودا سلف لانے کے لیے بازار جانا پڑا۔ یہ پہلا گھر تھا جہاں اُس پر پانچ سات روپوں کا بھروسہ کیا گیا تھا۔

وہ گلی میں سے گزری تو گلی کی نکڑ پر تین چار لڑکے کھڑے تھے۔ وہ ان کے قریب سے گزری تو اُسے ایک لڑکے کی آواز سنائی دی ـــــ "چوہدری صاحب کی نوکرانی ہے۔"

"عجب چیز ہے بھئی" ـــــ دوسرا بولا۔

"اقبال کی چیز ہے نا!" ـــــ تیسرے نے کہا۔

ہاجرہ نے بڑے غصّے سے گھوم کے دیکھا تو ایک لڑکے نے دل پر ہاتھ رکھ کر مجنونانہ "ہائے" کہہ دی۔

ہاجرہ کا عتاب اُس کے سینے میں گھُٹ گیا اور وہ اندر ہی اندر جلتی بازار چلی گئی۔

وہ عام سی میلی کچیلی، بھدّے بھدّے نقش و نگار والی لڑکی ہوتی تو کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا لیکن ہاجرہ کی بدقسمتی کہ اُس کی شکل و صورت میں جاذبیت اور قدبُت میں دلکشی تھی۔ جب پاکستان کے سپوتوں کو پتہ چلا کہ وہ یتیم نوکرانی ہے تو اُس کی دل کشی اور بڑھ گئی۔ اُس کی بیچارگی نے مردوں کی نگاہ میں اُس کے حُسن کو دوبالا کر دیا۔

اُسے اب ہر روز ایک دو مرتبہ بازار جانا پڑتا تھا۔ اُسے ہر کوئی گھور گھور کر دیکھتا تھا جس دکاندار کے پاس جاتی تھی وہ بھی اُسے نظر بھر کر دیکھتا تھا۔ بعض آوارہ سے لونڈے دانستہ اُس کی راہ میں آجاتے تھے پھر بدک کر یوں ایک طرف ہو جاتے جیسے بے خبری میں اُس کی راہ میں آ گئے ہوں۔ کوئی قریب سے گزرتے کسی فلمی گیت کا فحش بول گا جاتا اور کبھی کبھی ایک نوجوان سا چھوکرا ٹرانسسٹر آن کیے اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا تھا۔

ہر مرد اور ہر لڑکے کی آنکھوں میں ہاجرہ کو اقبال جھانکتا نظر آتا تھا۔ عریانی، فحاشی اور بے حیائی کا ایک سیل تھا جس میں ہاجرہ کی ناؤ ناؤ ڈوب ڈوب کر اُبھر رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ سل گئے اور سلے ہُوئے ہونٹوں نے سینے میں اُبلتا ہُوا لاوا روک لیا۔

وہ کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکی نہ کسی کا کچھ بگاڑنے کی کوشش ہی کی۔ اُس نے کسی سے شکایت نہ کی نہ خُدا سے گلہ کیا کیونکہ اس طوفان بدتمیزی کی زد میں آئی ہُوئی وہ اکیلی ہی نہیں تھی۔ ایک روز اُس سے چند قدم آگے آگے ایک برقعہ پوش لڑکی جا رہی تھی۔ جب وہ نیواڑی کی دکان کے قریب سے گزری تو ایک لونڈے نے ترنّم سے کہا ـــــ "اِس رُخِ منوّر سے چلمن ہی ہٹا دیجیے۔"

ہاجرہ نے سوچا کہ یہ لڑکی کسی کی نوکرانی نہیں، یہ ضرور رک کر اس لڑکے کو دو چار سنا دے گی لیکن لڑکی نے پرواہی نہ کی اور اپنی راہ چلتی گئی۔ ہاجرہ نے بھی سوچا کہ بھونکتے کتوں کے جواب میں انسان بھونکا نہیں کرتے۔ اُسے فلمی گیتوں اور مردوں سے نفرت ہو گئی۔ اُسے کسی نے سمجھایا یا بتایا نہیں تھا کہ ایسے مردوں سے اُسے نفرت ہونی چاہیے۔ اُس کی ذات سے آواز سی اُٹھتی تھی کہ ہاجرہ! تُو بکاؤ مال نہیں۔ بعض اوقات یہ خیال اسے ڈنک مارنے لگتا کہ اُس کی آبرو کا رکھوالا کوئی نہیں۔

ہاجرہ گلیوں میں اور سڑکوں پر بھٹکتے ان دبلے پتلے مرِیل مرِیل، عورت نما نوجوان بانکوں کو راہ کے روڑے سمجھ کر خیالوں ہی خیالوں میں ٹھوکریں مارتی چلی گئی لیکن صوبیدار اکبر علی سے تو اُسے بہت ہی نفرت ہو گئی تھی۔ یہ پہلا مرد تھا جسے تنگ آکر ہاجرہ نے بے تکی سنا ڈالی تھیں۔

صوبیدار اکبر علی چند ہی مہینے گزرے پاک فوج سے پنشن پر آیا تھا۔ اُس کی بیوی کبھی کی مر چکی تھی۔ دو ہی بیٹیاں تھیں جن کی شادیاں اُس نے پنشن پر آتے ہی کر دی تھیں۔ اُس کا چولہا چوکا ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کرتی تھی۔ ایک روز صوبیدار اکبر علی کی نظر ہاجرہ پر پڑ گئی تو وہ بھی عمر کی گئی گزری منزلیں پھلانگ کر بیس بائیس برس کا بانکا بن گیا۔ اُس نے کسی سے ہاجرہ کے متعلق پوچھا تو اُسے پتہ چلا کہ وہ اقبال کے گھر میں نوکرانی ہے۔ اُس نے ہاجرہ کو راہ میں روک لیا۔

"دیکھو لڑکی!" ـــــ اُس نے ہاجرہ سے بلاتمہید کہا ـــــ "تم کتنی شکل دار ہو اور روٹی کپڑے پر نوکری کر رہی ہو۔ میرے گھر آجاؤ۔ نکاح پڑھا کر گھر کی مالکن بنا دوں گا۔ ریشم میں لپیٹ کر رکھوں گا۔"

ہاجرہ نے اس نئی صورت والے مرد کے چہرے مہرے کو دیکھا تو اُس کی پینتالیس پچاس سالہ بوڑھی آنکھوں میں اُسے نوجوان اقبال جھانکتا نظر آیا۔ وہ چپ چاپ راہ لگ گئی۔ دوسروں پر اُسے غصّہ آیا کرتا تھا۔ لیکن اکبر علی کی بات سن کر اُسے رونا آگیا۔ وہ تو اُس کے باپ کی عمر کا آدمی تھا۔

دوسرے روز بازار گئی تو اکبر علی نے پھر اُس کی راہ روک لی۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں" ـــــ اکبر علی نے کہا ـــــ "پچیس برس فوج کی سروس کی ہے۔ آؤ نا، اپنا گھر بسا لو۔"

"اپنی ایک بیٹی کو اُجاڑ کر گھر بسا لو نا!" ـــــ ہاجرہ نے کہا ـــــ "اُسی کو ریشم میں لپیٹ کر پوچھنا کہ تم بُوڑھے ہو گئے ہو یا نہیں" ـــــ اور اکبر علی کو مسکراتا چھوڑ کر آگے چلی گئی۔

اگلے روز اکبر علی پھر اُس کی راہ میں کھڑا تھا۔

"ہاجرہ!" ـــــ وہ ہاجرہ کو روک کر بولا ـــــ "یہ قیامت کی جوانی پرائے چولہے میں نہ جلاؤ۔ میرے گھر آجاؤ۔ خُدا کی قسم سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔"

ہاجرہ اور اکبر علی میں تیسرے چوتھے روز جھک جھک ہو جاتی۔ وہ اُس کی راہ روکنے سے باز نہ آتا تھا اور ہاجرہ جو مُنہ میں آتے کہہ کر اپنی راہ لگ جاتی تھی۔ اس دوران اقبال کئی بار ایک دو دنوں کے لیے گھر آیا۔ اُس کا بھرا بھرا جسم اور پُرشباب چہرہ مہرہ دیکھ کر ایک روز ہاجرہ کا دل اُسے یہ کہنے کو تڑپنے لگا کہ اقبال جی! گلیوں میں مجھے ایسے ایسے لونڈے چھیڑتے ہیں جنہیں تم ایک تھپیڑ مارو تو بے ہوش ہو جائیں۔ میں تمھاری نوکرانی ہوں اقبال جی! تمھارے گھر کی عزت ہوں ـــــ لیکن اقبال اُسے بھوکی نظروں سے دیکھ کر مُسکرایا تو ہاجرہ کا دل بجھ کے رہ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اقبال کی مُسکراہٹ اور گلیوں کے آوارہ نوجوانوں

کی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہیں۔

التجائیں ہاجرہ کے سینے میں رُک گئیں اور اُس کا دم گھٹنے لگا۔

وہ پیار کی تشنہ تھی مگر یہ تشنگی اب انگارے بن گئی اور اُس کا انگ انگ جلنے لگا۔ وہ نفرت اور حقارت کا حسین پیکر بن گئی۔ پہلے پہل تو اسے رونا آجاتا تھا مگر اب آہ بھی نہیں بھرتی تھی ـــــ گریاں نہ خنداں!

☆

ایک روز اقبال کے ایک خط نے گھر میں ماتم کی فضا پیدا کر دی۔ آنسو تو کسی نے نہ بہائے لیکن سب کے مُنہ لٹک گئے۔ اقبال کی ماں اور دونو بہنیں سر جُھکا کے بیٹھ گئیں اور اُس کا باپ غصّے میں بھرا ہُوا کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ ہاجرہ نے اقبال کی ماں سے پوچھا تو اُسے مختصر سا جواب ملا ـــ "اقبال فوج میں بھرتی ہوگیا ہے"

اقبال کے باپ کو اپنے اکلوتے اور لاڈ اور پیار سے پالے ہُوئے بیٹے کے لیے فوج جیسی سخت نوکری بالکل پسند نہیں تھی، حالانکہ وہ کمشن کے لیے منتخب ہُوا تھا۔ اُسے اس بات پر بھی بہت غصہ آرہا تھا کہ اقبال اُسے بتائے بغیر ٹریننگ کے لیے چلا گیا تھا۔

اقبال کا فوج کی کمشن کے لیے منتخب ہو جانا محض اتفاقی واقعہ تھا۔ وہ کالج میں کسی بڑے گھرانے کی لڑکی کے ساتھ بڑا ہی غلیظ مذاق کر بیٹھا تھا۔ لڑکی نے اپنے گھر جا بتایا اور اگلے روز لڑکی کا باپ پرنسپل پر آ برسا۔ پرنسپل نے اقبال کو کالج سے نکال دیا اور ہوسٹل کا کمرہ فوراً خالی کرنے کا حکم دے دیا۔ اقبال کو پتہ چلا کہ فوج میں کمشن کے امیدواروں کا انتخاب ہو رہا ہے۔ وہ بھرتی کے دفتر چلا گیا۔ قدبُت اور شکل وصورت اچھی تھی۔ ابتدائی امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

وہ کئی روز دوستوں یاروں کے ساتھ لاہور میں ہی گھومتا پھرتا رہا۔ وہیں سے سیلیکشن بورڈ کے بلاوے پر آخری انتخاب کے لیے چلا گیا۔ جسم اور دماغ کا چُست اور چالاک تھا۔ وہاں بھی کامیاب ہو گیا اور ٹریننگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ اُس نے ملٹری اکیڈمی سے باپ کو خط لکھا کہ وہ فوج میں کمشن کے لیے منتخب ہو گیا ہے اور اب ٹریننگ لے رہا ہے۔

دو سال گزر گئے۔

☆

ان دو برسوں کے دوران ہاجرہ کی زندگی میں اسی قدر تبدیلی آئی کہ اُس کی آبرو پر منڈلانے والوں میں اقبال نہیں تھا۔ اُس کی ہر صبح گزری ہوئی صبح کی طرح بے کیف اور شام گزری ہوئی شام کی طرح ملول اور رنجیدہ ہوتی تھی اور دن اسی طرح گھر کی جھاڑ پونچھ، برتن دھونے اور بازار کے دو تین پھیروں میں گزر جاتا تھا جس طرح چھ سات برسوں کا ہر دن گزرتا رہا تھا۔ ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کے ننگے گیت اُس کے گرد زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھناتے رہتے تھے۔

ان دو برسوں کے دوران اُسے اپنے مالکوں کے ریڈیو سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ اقبال کی بہنیں فلمی گانوں کے سوا اور کچھ سُنتی ہی نہیں تھیں۔ ہاجرہ یوں جل اُٹھتی جیسے گانے والے اُسی پر فقرے چُست کر رہے ہوں۔

ان دو برسوں میں ہاجرہ سترہ سے انیس برس کی ہو گئی تھی اور اُس کے جسم میں چند تبدیلیاں اور زیادہ

نمایاں اور دلکش ہو گئی تھیں۔ رخساروں کی رنگت اور زیادہ جاذبِ نظر اور بالوں کی چمک اور زیادہ نکھر آئی تھی مگر اُس نے کبھی دھیان نہ دیا تھا کیونکہ اُسے اپنے جسم کے ساتھ ذرّہ بھر دلچسپی نہ تھی۔

صُوبیدار اکبر علی مکمل دو برس اُس کی راہ میں کھڑا رہا اور اُسے شادی کے لیے اُکساتا رہا۔ اُس نے ہاجرہ کو سونے کے زیورات کے لالچ بھی دیئے، سو سو روپوں کے نوٹ بھی دکھائے۔ پھر ایک روز اکتا کر اُسے اٹھا لے جانے کی دھمکی بھی دی۔

"ہاجو! ـــ ایک روز اکبر علی نے تنگ آکر اُسے کہا ـــ "اپنی قیمت خود ہی بتا دو"

ہاجرہ تیرہ تھی جسے اپنی قیمت کا کچھ علم نہ تھا۔ اگر اُسے کوئی جوان جھوٹے پیار سے ہی بلاتا تو وہ بے دام بک جاتی۔ اُسے سونے چاندی اور سو سو کے نوٹوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُسے پیار سے پیار تھا اور مردوں سے نفرت۔

☆

دو سال گزر گئے تو اقبال ٹریننگ ختم کر کے چند دنوں کی چھٹی آگیا۔ وہ اب سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ ہاجرہ نے اُس کے چہرے مہرے اور ڈیل ڈول میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔ اس قدر طویل فوجی ٹریننگ نے اُس کے تن بدن کو چھریرا بنا دیا تھا اور چہرے پر لڑکپن کی آوارگی کی جگہ مردوں کی سی پختہ کاری کے تاثرات تھے جو اُس کے مردانہ حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔

دوسری صبح ہاجرہ بازار سے سودا سلف لے کے گھر کی طرف آرہی تھی کہ اُسے اقبال آتا دکھائی دیا۔ ہاجرہ کو اقبال کی چال ڈھال میں دلکش سی مردانہ سنجیدگی نظر آئی۔ اُس کے ذہن سے دو برس پہلے والا آوارہ اقبال نکل گیا۔ ہاجرہ مُسکرا دی جیسے اپنے چھیل چھبیلے بھائی کو دیکھ لیا ہو۔ اسے پیارا سا خیال آیا کہ اب اقبال کی شادی ہونی چاہیئے۔ اُس نے وزیر آباد کی گلیوں میں باراتیں آتی اور ڈولیاں اٹھتی اکثر دیکھی تھیں مگر اُسے بھولے سے بھی کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ خود بھی اُس عمر کو پہنچ گئی ہے جہاں لڑکیوں کے خوابوں اور تصوّروں میں باراتیں آنے لگتی ہیں اور رنگ رنگیلے تصوّرات انہیں ڈولی کے ہچکولے دینے لگتے ہیں مگر ہاجرہ کے خواب اور تصوّر ہمیشہ روکھے پھیکے رہتے تھے۔

اُس روز اقبال کو گلی میں آتے دیکھا تو اُسے اقبال کی شادی کا خیال آگیا اور سوچنے لگی ـ "کوئی مجھے کہے تو میں اقبال جی کے لیے پری جیسی خوبصورت دُلہن ڈھونڈ لاؤں" ـــ جب اقبال اُس کے قریب آیا تو ہاجرہ مُسکرا کر بولی ـــ "سویرے سویرے کہاں چل دیئے اقبال جی؟"

اقبال رُک گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے ہاجرہ کا ہاتھ تھام لیا اور ہاتھ کو دبا کر بولا ـ "ہاجو! صرف تین روز کی چھٹی آیا ہوں۔ اب تو پردیسی ہو گیا ہوں ہاجو! ـــ اُس نے ہاجرہ پر جھک کر رازداری سے کہا ـ "چلو آج دوپہر کے وقت ایک دوست کے گھر چلے چلیں۔ وہ باہر چلا جائے گا۔ اُس کے گھر میں اور کوئی نہیں ہو گا"

ہاجرہ کے سینے میں بم پھٹا اور اُس کی مسکراہٹ یوں بجھ گئی جیسے کسی نے آندھی میں دیا جلانے کی کوشش کی ہو۔

"تم تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہو" ـــ اقبال نے کہا ـــ "خدا کی قسم وہاں اور کوئی نہیں ہو گا۔ کسی کو پتہ نہیں چلے گا"

ہاجرہ کو چکر سا آگیا۔ سنبھلی تو دیکھا کہ اُس کے سامنے وہی دو برس پہلے والا اقبال کھڑا تھا ـــ آوارہ۔

اوباش، کردار سے عاری اقبال — ہاجرہ رو کے ہوئے آنسوؤں کے دھندلکے میں گھر آ گئی۔

چھٹیوں کے باقی دو دن اقبال نے ہاجرہ پر طرح طرح کے جال پھینکے لیکن وہ صاف بچ نکلتی رہی۔ اقبال کو ذرہ بھر احساس نہ تھا کہ اب وہ کالج کا آوارہ لڑکا نہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گیا ہے اور پاک فوج کی ایک انفنٹری بٹالین میں جا رہا ہے۔ اُس نے تو کالج بدر ہو کر راہِ فرار ڈھونڈی تھی۔

ان دو برسوں میں ہاجرہ پتھر بن گئی تھی اور اُس کے آنسو خشک ہو گئے تھے لیکن اُس روز وہ باورچی خانے میں بہت روئی۔ اُس نے رو رو کے چاہا کہ اقبال کو باورچی خانے میں بلا کر کہے کہ اقبال جی! میں نے تمہیں کس پیار سے بلایا تھا! تم تو مجھے بہت ہی پیارے لگے تھے۔ مگر وہ اقبال کا سامنا کرنے کی جرأت نہ کر سکی اور سر گھٹنوں میں دے کر یوں سسک سسک کر رونے لگی جیسے خزاں سے جھڑے ہوئے خشک پتے ایک ایک کر کے اُجڑے ہوئے آنگن میں سسک سسک کر گر رہے ہوں۔

اُسے تلخ سا خیال آیا — "میرا وجود مردوں کی تفریح کے لیے بنایا گیا ہے۔ لوگوں کو میرا جسم اچھا لگتا ہے۔ میری روح اور میرے پیار سے کسی کو پیار نہیں۔ کسی کے دل میں میرے لیے شفقت نہیں" — اُس نے اپنے سپیدی مائل گندمی بازوؤں پر نگاہ ڈالی تو اُسے ان سڈول بازوؤں سے گھن آنے لگی جیسے ان کے ساتھ گندگی چپکی ہوئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو اُس نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا۔ اُسے اپنے عضو عضو سے نفرت ہو گئی کیونکہ یہ جسم مردوں کو اچھا لگتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو دنیا کی بہامی سے نوچ کر خیالوں ہی خیالوں میں ڈور پرے پھینک دیا جیسے کسی نے ادھ کھلی کلی کو ڈالی سے توڑ کر کوڑے کرکٹ کے گندے ڈھیر میں پھینک دیا ہو۔

اقبال اُسے خیالوں کے جہنم میں پھینک کر واپس چلا گیا۔

اقبال کے چلے جانے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ صوبیدار اکبر علی وہیں تھا۔ وزیر آباد کی گلیوں اور بازاروں میں اُسے چھیڑنے والوں کی ٹولیاں وہیں تھیں لیکن ہاجرہ برف کا تودہ تھی جس سے سبھی سر پھوڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی ہاجرہ کے دل سے جلی ہوئی فریاد نکل جایا کرتی تھی — "خدا تمام مردوں کو اندھا کر دے، نہ مجھے دیکھیں نہ بکواس کریں۔"

☆

ہاجرہ کی بےجور زندگی کے دو اور مہینے گزر گئے۔

ایک رات وہ اقبال کے باپ کو چائے دینے ڈرائنگ روم میں گئی۔ ریڈیو سے گانے نشر ہو رہے تھے۔ گانا ادھورا ہی تھا کہ بند ہو گیا اور آواز آئی:

"ایک ضروری اعلان سنئے۔ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین نے صدائے کشمیر کے نام سے اپنا ریڈیو سٹیشن قائم کر لیا ہے جس کے پہلے نشریے میں تھوڑی ہی دیر ہوئی اعلان کیا گیا ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں حریت پسند کشمیریوں نے مسلح بغاوت کر دی ہے اور گوریلا جنگ شروع کر دی ہے۔ صدائے کشمیر نے خبر نشر کی ہے کہ آج دن کے پچھلے پہر مجاہدینِ آزادی نے ایک پُل تباہ کر دیا ہے اور گوریلا دستے جگہ جگہ بھارتی فوج کی چوکیوں پر کامیاب حملے کر رہے ہیں۔"

اقبال کا باپ چونک اٹھا لیکن ہاجرہ نہ چونکی۔ نہ اُس نے دھیان دیا کہ ریڈیو کے اس ضروری اعلان

میں کیا ضروری پن ہے، مجاہدینِ آزادی کون ہیں اور صدائے کشمیر کیا ہے۔ اُس نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھی اور باہر نکل آئی۔ اُس کی اپنی محدود اور سکڑی ہوئی دنیا ہنگاموں سے بھرپور تھی۔ اُس کی بلا سے باہر پُل تباہ ہوتے رہیں اور بھارتی چوکیوں پر حملے ہوتے رہیں۔ وہ خود بغاوت کر دینا چاہتی تھی مگر جانتی نہ تھی کہ کس طرح بغاوت کرے اور کس کس کے خلاف کرے۔ وہاں تو زمانہ ہی دشمن تھا۔

صبح ہوئی تو وہ بازار گئی۔ اُسے جانے کیوں یاد آ گیا کہ کل رات مقبوضہ کشمیر میں کچھ ہوا تھا لیکن اُس کے ذہن نے مقبوضہ کشمیر کو فوراً اُگل دیا۔ اُسے یہ بھی یاد نہ آیا کہ وہ خود کشمیر کی مٹی کی پیداوار ہے اور آواز جو اُس نے گذشتہ رات ریڈیو سے سُنی تھی، وہ اُس کے اپنے وطن کی آواز تھی۔ اُس کا وطن تو یہ گھر تھا جہاں اُسے پیٹ بھر کر روٹی ملتی تھی اور وہ رات پکی چھت کے نیچے سوتی تھی اور جہاں سردی سے اکڑ کر مرنے کا خطرہ نہیں تھا۔

اُس نے سوچنے کی کوشش ہی نہ کی کہ مقبوضہ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو وزیر آباد میں تھی جہاں کچھ بھی نہیں ہُوا تھا اور وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اُس روز بھی صوبیدار اکبر علی نے کھنکار کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اُس روز بھی گلی کی نکڑ پر ایک لونڈے نے دل پر ہاتھ رکھ کر ہائے کہی تھی۔ گلیوں اور بازاروں کا ماحول اور مردوں کی نظریں وہی تھیں جو ریڈیو کے اس ضروری اعلان سے پہلے تھیں۔

دنوں پر دن گزرتے چلے گئے۔ ہاجرہ اپنی اُجڑی ہوئی دنیا میں تڑپتی ترستی رہی اور بالکل ہی بےخبر کہ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدینِ آزادی بھارتی فوج پر بجلیاں بن بن کے ٹوٹ رہے ہیں اور کئی اہم فوجی چوکیوں کا صفایا کر چکے ہیں۔ ریڈیو پر ہر روز خبریں نشر ہو رہی تھیں کہ کشمیری حریت پسندوں نے بےشمار پُل تباہ کر دیے ہیں اور انڈین آرمی کا کوئی کنوائے منزل پر نہیں پہنچا۔ فوجی گاڑیاں گوریلوں کی نذر ہو جاتی ہیں اور سامان گوریلے اٹھا لے جاتے ہیں۔ ہاجرہ کو فلمی گانوں کی وجہ سے ریڈیو ہی سے نفرت تھی اس لیے اُس نے تو سنا ہی نہ تھا کہ سری نگر کا فوجی ہیڈ کوارٹر مجاہدینِ آزادی کے گوریلا حملوں سے لرز رہا تھا۔ مقبوضہ کشمیر کی سڑکوں پر موت کی حکمرانی تھی اور انڈین آرمی محصور ہو کے رہ گئی تھی۔

☆

ایک روز وزیر آباد کے ماحول میں یکایک تبدیلی آ گئی۔ ہاجرہ باہر نکلی تو اُس نے فضا میں کھچاؤ سا دیکھا۔ ایسا ہی کھچاؤ لوگوں کے چہروں پر تھا اور اُن کی باتوں میں بھی اضطراب تھا۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ گلی گلی، گھر گھر، سڑکوں، چوکوں اور بازاروں میں غم و غصّہ سے لبریز ایک ہی آواز بگولے کی طرح اُٹھ رہی تھی — "ہندوستان نے اعوان شریف پر گولہ باری کی ہے .... ہندوؤں نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے .... مسجد شہید ہو گئی ہے .... عورتیں اور بچے شہید ہو گئے ہیں .... گجرات کے ایک گاؤں پر .... گاؤں تباہ ہو گیا ہے۔"

ہاجرہ اُن ہی گلیوں سے گزر کر بازار گئی جہاں راہ جاتی لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے والے کُتوں کی طرح گھومتے رہتے تھے۔ وہ آوارہ لونڈے اُس روز بھی گلیوں میں موجود تھے مگر اُس روز وہ چھیڑنے کے موڈ میں ہی نہیں تھے۔ وہ سر جوڑے کھڑے تھے۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ہاجرہ قریب سے گزر گئی ہے۔ بازار میں بھی ہاجرہ نے لوگوں کے چہروں کے تاثرات بدلے بدلے دیکھے۔ اُن کی باتوں میں ہیجان نمایاں تھا۔ ہاجرہ کو یوں لگا جیسے آج مرد آپس میں لڑ پڑیں گے۔

پہلے تو مرد اُسے گھُور گھُور کر دیکھا کرتے تھے، آج ہاجرہ مردوں کو گھُور گھُور کر دیکھ رہی تھی اور کسی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آج زمانے کو کیا ہوگیا ہے ؟ وہ اسی قدر محسوس کر رہی تھی کہ زمانے میں کوئی انقلاب آگیا ہے ۔

اُس نے سودا سلف لیا اور واپس چل پڑی ۔ راستے میں صوبیدار اکبر علی مل گیا ۔ ہاجرہ نے چاہا کہ اُسی سے پوچھ لے لیکن دل سے حقارت کا طوفان اُٹھ آیا ۔ وہ اکبر علی سے مُنہ نہیں لگانا چاہتی تھی ۔ وہ قریب آیا تو ہاجرہ نے منہ پھیر لیا ۔ اُسے توقع تھی کہ وہ ابھی کوئی بکواس کرے گا لیکن اکبر علی یوں تیز قدم ہاجرہ کے قریب سے گزر گیا جیسے اُس نے ہاجرہ کو دیکھا ہی نہ ہو ۔

ہاجرہ کے ذہن میں معمّہ اور اُلجھ گیا ۔

”بی بی جی !—— ہاجرہ نے گھر آکر اقبال کی ماں سے پوچھا ”— آج کیا ہوگیا ہے ؟ باہر سب لوگ بڑے غصّے میں باتیں کر رہے تھے ۔ کہتے ہیں ہندوؤں نے ایک مسجد پر گولے چلاتے ہیں “ ۔

اقبال کی ماں نے اُسے گجرات کے گاؤں اعوان شریف پر ہندوستانیوں کی گولہ باری کی ساری داستان سنا دی اور اُسے بتایا کہ گاؤں میں بہت سے لوگ شہید ہوگئے ہیں ۔ ان میں عورتیں اور بچّے بھی تھے ۔ مسجد پر بھی گولے گرے ہیں ۔

ہاجرہ نے اپنے آپ میں لرزہ سا محسوس کیا اور وہ باورچی خانے میں چلی گئی ۔ ہانڈی کے لیے پیاز کاٹنے لگی تو اُس نے انگلیوں میں رعشہ سا محسوس کیا ۔ اُس کے ذہن میں یہی ایک بات اٹک کے چُبھ رہی تھی —— ”ہندوؤں نے مسلمانوں کے بچوں کو مارا ہے اور مسجد شہید کر دی ہے “ ۔

ہاجرہ نے ہندو کبھی نہیں دیکھے تھے ۔ وہ اسی قدر جانتی تھی کہ ہندو مسلمان نہیں ہوتے ۔ اُس نے نہ کبھی نماز پڑھی تھی نہ اُسے نماز پڑھنی آتی تھی نہ قرآن پڑھ سکتی تھی ۔ پہلے کلمے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی لیکن اُسے یہ احساس ضرور تھا کہ وہ مسلمان ہے ہندو نہیں ۔

اُس کی ذات میں ایک مسلمان لڑکی بیدار ہوگئی ۔ اُس نے پیاز کاٹتے محسوس کیا کہ جس چُھری کو وہ مصالحہ رگڑنے والی سِل پر رگڑ کر استعمال کیا کرتی تھی، آج بغیر رگڑے پیاز میں تیزی سے گھری اُتر رہی تھی ۔ اُس نے اپنے ہاتھوں میں اجنبی سی قوت محسوس کی ۔ سینے کا لرزہ اور دل کا اضطراب بڑھتا چلا گیا ۔ سوالوں کا ایک ہجوم اُس کے ذہن میں ہنگامہ بپا کرنے لگا ۔ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر سمجھ نہ پاتی کہ کیا پوچھے ؟ کس طرح پوچھے، اور کس سے پوچھے ! انوکھی سی بے قراری تھی جس کے زیرِ اثر وہ کسی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنا اور باتیں سننا چاہتی تھی ۔

وہ اُٹھ گئی اور سر کو جھٹک کر اپنے آپ کو ان اُلجھنوں سے آزاد کر لینا چاہا ۔ سوچا، جو مر گئے سو مر گئے، دنیا کے جہنم سے چھُوٹے ۔ خدا کرے ایک گولہ میرے سر پر بھی آپھٹے ۔ لیکن جو اجنبی سا ہنگامہ اُس کے دل و دماغ میں بپا ہوگیا تھا اس سے وہ چھٹکارا نہ پا سکی ۔ اعوان شریف کی شہید عورتوں، بچوں اور مسجد کو ذہن سے نکال نہ سکی اور اس احساس کے تابع ہوگئی کہ جو کچھ ہُوا ہے اور جو کچھ ہوگا اس کے ساتھ اُس کا بھی کوئی تعلق ضرور ہے اور جو پاکستانی ہندوستانیوں کی گولہ باری سے شہید ہوگئے ہیں، وہ اُس کے کچھ نہ کچھ ضرور لگتے تھے اور جو عورتیں شہید ہوگئی ہیں وہ اُس کی ماں کی طرح کی عورتیں تھیں جو سردی سے اکڑ اکڑ کر مر گئی تھی ۔ اُس نے سوچا کہ جب بھارتی توپوں کے گولے گاؤں کے گھروں میں پھٹتے ہوں گے تو ان عورتوں نے اپنے بچوں کو اسی طرح اپنے نیچے چھپا لیا ہوگا جس طرح اُسے ظالم سردی میں ماں نے اپنے جسم تلے دبا لیا تھا ۔

اُس کے آنسو نکل آتے ۔

اور مسجد ؟ —— مسجد کا خیال آتے ہی اُس کی چُھری پیاز کو کاٹتی اُس کی انگلی میں اُتر گئی ۔ اُس کی انگلی سے لال سُرخ خون اُمڈ آیا اور وہ اپنے خون کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے لگی ۔ اُس نے اپنا خون پہلی بار دیکھا تھا ۔ وہ بہت دیر انگلی سے بہتے خون کو دیکھتی رہی اور انوکھا سا ایک تاثر اُس کے رگ و ریشے میں سرایت کرتا چلا گیا پھر یہ اثر رُوح کی گہرائیوں میں اُترنے لگا ۔ اس سے پہلے اس کے آنسو بہا کرتے تھے مگر آنسوؤں نے اُسے کبھی سکون نہ دیا تھا ۔ آج خون کے چند قطرے بہہ گئے تو اُسے انوکھا سا قرار آگیا ۔ ایسا قرار جس کا ذائقہ اُس نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا ۔ اُس روز تک وہ رات کو لیٹتی تھی تو اُس کی آنکھ لگ جایا کرتی تھی لیکن اُس رات اُس پر ایسی کیفیت طاری رہی کہ وہ اچھی طرح سو بھی نہ سکی ۔

☆

صبح اُس نے جو خبریں سنیں انہوں نے اُس پر ہیجانی کیفیت طاری کر دی ۔ وہ روزمرّہ کے چکر میں بازار گئی ۔ اُس روز بھی چھیڑنے والوں نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دی ۔ اُس نے چاہا کہ ان ہی سے پوچھ لے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے اور میں کیا محسوس کر رہی ہوں ۔

”اب پاکستان کو دیر نہیں کرنی چاہیئے “—— اُسے ایک آواز سنائی دی —— ”جوابی حملہ کر دینا چاہیئے “ ۔

ہاجرہ نے گھوم کے دیکھا ۔ یہ ایک اوباش لونڈے کی عتاب آلود آواز تھی ۔

”ہندوؤں کو ہم کُچل کے رکھ دیں گے “—— دوسرے نے کہا ۔

”خدا کی قسم ہم محاذوں پر جا کر لڑیں گے “—— ایک اور جوشیلی آواز آئی

ہاجرہ کو پہلے تو شک ہُوا جیسے یہ فقرے اُسی پر چست کیے جا رہے ہوں لیکن اُس نے بڑے غور سے دیکھا ۔ ان لڑکوں کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر ہنسی نہیں تھی ۔ اُسے ان کے چہروں پر وقار اور ولولہ نظر آ رہا تھا ۔

سب سے انوکھی تبدیلی تو یہ تھی کہ پنواڑی کی دکان پر ریڈیو فلمی گانے نہیں سنا رہا تھا ۔ ریڈیو خاموش تھا جیسے زمانہ ہی چپ ہوگیا ہو ۔ جالندھر ریڈیو کے فلمی گانوں کا واویلا تو اس شہر کے ہنگاموں کا لازمی جُز ہُوا کرتا تھا ۔ یہ ایسا انقلاب تھا جس نے ہاجرہ کو پریشان کر دیا ۔

بازار سے واپس آتے وہ دوسری گلی کی راہ چل پڑی ۔ اس گلی سے وہ کبھی کبھی گزرا کرتی تھی ۔ آج تو اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وزیر آباد کی ساری گلیوں اور سڑکوں پر گھوم کے دیکھے کہ واقعی زمانہ بدل گیا ہے اور اعوان شریف کے بچوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سارا وزیر آباد بے تاب ہے ؟

وہ اس گلی میں گئی تو دیکھا کہ ایک مکان کے دروازے میں ایک اجنبی صورت جواں سال آدمی کھڑا تین چار آدمیوں کو باتیں سُنا رہا تھا ۔ وہ خوبرو آدمی تھا چہرے کی سپیدی مائل گندمی رنگت پر چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی خوب پھب رہی تھی ۔ اُس کے ہونٹوں پر پیارا سا تبسّم اور آنکھوں میں ذہنی سی چمک تھی ۔

ہاجرہ ابھی دُور ہی تھی کہ اس کے سامنے جو آدمی کھڑے تھے وہ چلے گئے اور وہ وہیں کھڑا رہا ۔ ہاجرہ اُسے بڑی غور سے دیکھ رہی تھی اور وہ آدمی اُسے دیکھ رہا تھا ۔ ہاجرہ کو وہ عام آدمیوں سے بہت ہی مختلف لگا ۔ مرد تو ایک دوسرے سے مختلف ہوا ہی کرتے ہیں [illegible] آنکھوں میں ایک ہی

جیسا تاثر دیکھا کرتی تھی۔ اس آدمی کی آنکھوں کی چمک میں اُسے وقار اور پاکیزگی سی نظر آئی۔ اُس کے قریب پہنچی تو کسی غیبی قوت کے زیرِ اثر اُس کے قدم رکنے لگے۔ اُس کے ذہن میں سوالوں کے اُلجھے ہوئے پیچ و خم اُسے پریشان کیے ہوتے تھے۔

"بھائی جی!" — ہاجرہ نے بے بس سا ہو کے اُکھڑی ہوئی آواز میں کہا — "لوگ طرح طرح کی خبریں سنا رہے ہیں معلوم نہیں"..... وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی جیسے اپنی آواز سے چونک اٹھی ہو۔ وہ آدمی اُس کی سادگی اور جھجک کو بھانپ گیا۔

"تمہیں معلوم نہیں بہن!" — اُس نے انسیت سے کہا — "ہندوؤں نے ہمارے ملک کے اندر آ کر ایک گاؤں پر گولہ باری کی ہے۔ گجرات کا ایک گاؤں ...." اور اُس نے اُسے اعوان شریف پر بھارتی گولہ باری کی تفصیلات سنا دیں۔ اُس کے لب و لہجے میں ہمجولیوں کی سی اپنائیت تھی۔ وہ کہہ رہا تھا — "اگر ہندو کھل کر حملہ کرتے تو پاکستانی مقابلہ کرتے لیکن انہوں نے گولہ باری کی اور بھاگ گئے۔ دُکھ تو یہ ہے کہ عورتیں اور بچے مارے گئے ہیں۔ پاکستان کی عزت اور بچے کو کوئی میلی آنکھ سے دیکھے تو ہم مر کٹ نہ مریں تو ڈوب مرنا چاہیئے"۔

ہاجرہ نے پہلی بار ایک مرد دیکھا جس نے عورت کی آبرو پر کٹ مرنے یا ڈوب مرنے کی بات کی تھی۔ وہ ایک ہی جست میں، خیالوں ہی خیالوں میں اس کی پناہ میں جا گری۔ وہ ایک ثانیے میں ڈری ہوئی بچی بن گئی۔ اس آدمی کے بولنے کے انداز میں کچھ ایسا تاثر تھا جس سے ہاجرہ کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کا کوئی بھائی ہوتا تو وہ ایسی ہی جوانمردوں کی سی باتیں کیا کرتا۔ بے بس اور بے آسرا لڑکی تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ اُس کی محرومیوں اور ذہنی خلفشار نے اُسے اس آدمی کا گرویدہ بنا ڈالا۔

"بھائی جی!" — وہ جھجک کے بولی — "تم یہیں رہتے ہو؟"

"میں چند دن ہوئے یہاں آیا ہوں" — اس آدمی نے کہا — "میرا نام افضال ہے۔ میں مذہب کا طالب علم ہوں۔ یہاں تمہارے شہر کے ایک بہت بڑے عالم کی شاگردی کر لی ہے۔ یہ دو کمرے کرائے پر مل گئے ہیں" — وہ بولتے بولتے چونک اٹھا اور متانت سے کہا — "تم جاؤ لڑکی! گلی میں اتنی دیر رکنا ٹھیک نہیں"۔

☆

وہ چپ چاپ گھر کو چل دی۔ راستے میں اُس نے کئی بار گھوم کے دیکھا۔ افضال کا دلکش سراپا اور باتیں طلسم بن کر اُسے مسحور کر رہی تھیں۔ گھر میں داخل ہوئی تو طلسم ٹوٹ گیا۔ اقبال کی ماں اور دونو بہنیں حیران اور ششدر بیٹھی تھیں۔ چہروں پر مضطرب سی اُداسی تھی۔ ہاجرہ ٹھٹک گئی اور پوچھے بغیر رہ نہ سکی۔ اقبال کی ماں نے اُسے بتایا کہ اقبال لڑائی پر جا رہا ہے۔ اُس نے ہاجرہ کو تفصیلاً بتا دیا کہ بھارتی فوجوں نے آزاد کشمیر کی دو فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے اور سرحدوں پر خطرہ بڑھ گیا ہے۔ کوئی پتہ نہیں کس وقت جنگ چھڑ جائے۔ بھارتیوں نے پہلے اعوان شریف پر گولہ باری کی پھر پاک فوج کی خاموشی کو دیکھ کر ہماری چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ اقبال نے لکھا ہے کہ پاک فوج کو جوابی کارروائی کرنی پڑے گی۔

ہاجرہ اور اقبال کی بہنوں کو تو جنگ کی ہولناکیوں کا کچھ علم نہ تھا لیکن اقبال کی ماں کو پچھلی جنگِ عظیم یاد تھی جس میں وزیر آباد اور گرد و نواح کے بے شمار جوان جانے کون کون سے دیس میں مارے گئے تھے۔ ہاجرہ سے

بات کرتے اُس کی آواز رندھیا گئی۔

"ہاجو!" — ماں نے کہا — "تم بھی دعا کرنا اللہ میرے بچے کو جہاں رکھے خیریت سے رکھے"۔

ہاجرہ اپنے دل کو ایسی دُعا کے لیے آمادہ نہ کر سکی۔ اقبال نے اتنا ہی لکھا تھا کہ میں بنگالیوں کی پلٹن کے ساتھ آگے جا رہا ہوں۔ ہندوستان کی جارحانہ کارروائیاں بڑھ گئی ہیں۔ میرے متعلق پریشان نہ ہونا، دعا کرنا۔

ہاجرہ کو اقبال کے لڑائی پر چلے جانے کا ذرہ بھر رنج نہ ہُوا، خوشی بھی نہ ہوئی۔ اقبال پہلا مرد تھا جس نے اُسے پیار سے بلایا تھا مگر اُس پیار میں جو فریب تھا اُس نے اُس کے دل میں اقبال کے خلاف نفرت بھر دی تھی۔ اُس نے اُسے پیار کے پردے میں فریب دینے کی کوشش کی تھی۔ اب افضال کو دیکھا تو اقبال کے خلاف نفرت اور شدید ہو گئی۔

☆

ہاجرہ کام کے بغیر کبھی باہر نہیں نکلی تھی لیکن اب وہ باہر نکلنے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ پچھلے پہر اُسے ایک بہانہ مل گیا۔ اُس نے اقبال کی ماں سے کہا کہ اُسے آج اپنے گاؤں کی دو لڑکیاں مل گئی تھیں وہ اُن کے ہاں جانا چاہتی ہے۔

اُسے جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ اُسی گلی میں چلی گئی جہاں اُسے افضال ملا تھا۔ افضال کا دروازہ کھلا تھا اور وہ سامنے کمرے میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ہاجرہ دروازے کے سامنے رُک گئی۔ اندر جانے سے جھجک رہی تھی۔ افضال نے اُسے دیکھ لیا اور مسکرا دیا۔ ہاجرہ جھجکی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ افضال نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔

"بُرا نہ مانو تو کہہ دوں" — افضال نے متین سے لہجے میں کہا — "میرے گھر میں کوئی عورت ہوتی، ماں بہن یا بیوی تو تمہارا یہاں آنا مناسب تھا مگر میں اکیلا رہتا ہوں اور لوگوں کے دل بڑے گندے ہیں۔ جو مُنہ میں آئے کہہ گزرتے ہیں۔ اپنی تو نہیں، مجھے تمہاری عزت کا خیال ہے۔ کسی نے تمہارے خلاف ذرا سی بات بھی کہہ دی تو میں برداشت نہ کر سکوں گا"۔

ہاجرہ مسکرا دی۔ اُس کی زندگی کی یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو مسرت سے لبریز تھی اور جس میں روحانی قرار تھا۔ اُسے ایک مرد مل گیا تھا جسے اُس کی عزت کا خیال تھا ورنہ وہاں تو زمانہ ہی اُس کی آبرو اور عصمت کا لیٹرا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میری عزت کا کسی کو خیال نہیں افضال جی!" — اُس نے کہا — "مجھے تو اِن مردوں نے گلیوں میں روک روک کر ننگی ننگی باتیں کہی ہیں۔ اب دو باتیں اور کہہ لیں گے تو میرا کیا بگڑ جائے گا۔ میرے تو نصیب ہی بگڑ گئے ہیں"۔

"تم کہاں رہتی ہو؟" — افضال نے پوچھا — "تمہارے ماں باپ ...."

"مر گئے ہیں اور میرا کوئی گھر نہیں" — ہاجرہ نے دکھیاری سی آواز میں کہا — "میں ایک گھر میں نوکرانی ہوں"۔

افضال کے چہرے کا تاثر یکسر بدل گیا۔ اُس نے ہاجرہ کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں رحم، ہمدردی اور اُنس تھا۔ اُس کے مُنہ سے آہ نکل گئی اور ہاجرہ کے آنسو بہہ نکلے۔

"تم بہت دُکھی ہو" — افضال نے کہا — "بعض دکھ کہہ لینے سے ہی ہلکے ہو جاتے ہیں۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ، شاید تمہاری دست گیری کر سکوں۔ سب دُکھ اللہ کی طرف سے آتے ہیں اور وہی سب کا پاسبان ہے۔"

ہاجرہ سے کس نے کبھی پوچھا تھا کہ تم رو کیوں رہی ہو ؟ یا تم اُداس کیوں ہو ؟ آج افضال نے اُس کا درد اپنا درد سمجھ کر پوچھا تو ہاجرہ کا دل پسلیاں توڑنے لگا جیسے پنچھی پنجرہ توڑنے کے لیے پھڑپھڑا رہا ہو۔ ہاجرہ نے اٹھارہ انیس برسوں کی داستانِ غم سنا ڈالی۔ اُس نے ہچکیاں بھی لیں اور سسکیاں بھی، اور وہ افضال کو سناتی چلی گئی کہ زمانے نے اُسے کیسے کیسے ڈنک مارے ہیں۔

افضال ہمہ تن گوش تھا اور سراپا ہمدردی بنا ہُوا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں کہ یا تو خدا میری شکل وصورت کو اس طرح بگاڑ دے کہ کوئی مجھے آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھے یا یہ سارے آدمی اندھے ہو جائیں" — ہاجرہ نے آنسو پونچھ کے کہا — "جب سے ہندوستانیوں کے حملے کی خبریں آنے لگی ہیں آدمیوں کی توجہ مجھ سے ہٹی ہے ورنہ ان گلیوں اور بازاروں میں میرا چلنا پھرنا محال ہو گیا تھا۔"

"اب تمہیں کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ سکے گا ہاجرہ!" — افضال نے مردانہ دبدبے سے کہا — "میں مذہب کا طالب علم ہوں۔ ہمارا مذہب کہتا ہے کہ عورت کی آبرو پر مر مٹو کیونکہ عورت قوم کی آبرو ہوتی ہے۔"

ہاجرہ کے سینے کا غبار نکل گیا تھا اور یہ غبار جیسے افضال نے نگل لیا تھا۔ افضال کے انداز میں وہی پیار اور وہی شفقت تھی جو اُس کے ماں باپ اپنے ساتھ لیے، برسوں گزرے قبروں میں جا سوتے تھے آج اُس کی تشنہ حسیں سکون پذیر ہوئیں اور کھویا ہُوا پیار مل گیا۔

"افضال جی!" — ہاجرہ نے جذبات سے بھرپور لہجے میں التجا کی — "مجھے اپنے گھر نوکر رکھ لو۔ تمہاری ہانڈی روٹی کرتے مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ تنخواہ بھی نہ دینا۔"

"نہ ہاجرہ!" — افضال نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا — "زمانہ بہت بُرا ہے۔ تم جہاں ہو وہیں رہو.... انسان انسان کے کام آتا ہے ہاجرہ! میں تمہارے ماں باپ کو قبروں سے نہیں نکال سکتا۔ تمہارے دُکھ بانٹ سکتا ہوں۔ تمہاری مصیبت کو اپنے سر لے سکتا ہوں۔ مجھے اپنا سمجھنا لیکن مجھے غلط نہ سمجھنا۔ میں خدا کے کلام میں ڈوبا ہُوا انسان ہوں۔"

ہاجرہ وہاں سے اٹھنا نہ چاہتی تھی۔ اُسے کسی کا ڈر نہ تھا۔ اُس کا دل بغاوت پر تُلا ہُوا تھا لیکن افضال کے اصرار پر وہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔ سینے میں برسوں کا رُکا ہُوا غبار نکل گیا تھا۔ اُسے باہر کی دنیا بدلی بدلی نظر آئی۔ گلیاں اور مکان ایسے دکھائی دینے لگے جیسے انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ فضا میں رُوح افزا نکھار تھا اور زمانے میں جیسے کوئی اور انقلاب آ گیا تھا۔

وہ گلی سے نکل کر کھُلی سڑک پر گئی تو دیکھا کہ صوبیدار اکبر علی وردی پہنے تانگے میں سوار ہو رہا تھا۔ ہاجرہ کو دیکھ کر تانگے سے اُتر آیا اور اُس کی طرف چل پڑا۔ ہاجرہ نے اُسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن اکبر علی نے اُسے روک لیا۔

"ہاجو!" — اکبر علی نے کہا — "میں فوج میں واپس جا رہا ہوں۔ شاید جنگ چھڑ جائے۔ تیری سرحدوں پر خطرہ ہے" — اُس کا لب و لہجہ بالکل ہی بدلا ہوا تھا جسے ہاجرہ محسوس نہ کر سکی۔

"تو جاؤ نا!" — ہاجرہ نے بے رُخی سے کہا — "میں نے کب روکا ہے" — اور طنزیہ بولی — "پاکستان کی فوج والوں کو سرحدوں کی رکھوالی کے لیے تم سے بڑھ کر اور کوئی شیر بہادر نظر ہی کہاں آیا ہو گا۔ دن بھر عورتوں سے چھیڑ خانی کرنے والے اعوان شریف کی عورتوں کے خون کا ضرور ہی بدلہ لیں گے" — اور وہ مُنہ پھیر کر چل دی۔

"ہاجو!" — اکبر علی نے کہا — "غلطی قصور بخش دینا۔ معلوم نہیں خدا کو کیا منظور ہے" — لیکن ہاجرہ جا چکی تھی۔

دوسرے دن تک ہاجرہ بھول چکی تھی کہ صوبیدار اکبر علی وردی پہنے ہوئے اُسے ملا تھا اور اُسے کچھ کہہ کر تانگے میں کہیں چلا گیا تھا۔ صرف ایک آدمی تھا جو اُس کے ذہن میں رچ بس گیا تھا۔ وہ افضال تھا۔ ہاجرہ کو تو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ ایک جوان لڑکی کا ایک جوان آدمی سے ملنا مناسب نہیں۔ اُسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ لوگ جو دو چار دن پہلے تک اُس کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے اور اُسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں وہ اب بھی اُسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ افضال اور ہاجرہ کا کوئی خونی رشتہ نہیں لیکن ہاجرہ اس معاشرے کے معیار اور پیمانے کے مطابق نارمل لڑکی نہیں تھی۔ یہ تو صرف جسم تھا جو وزیر آباد کی گلیوں میں چلتا پھرتا تھا یا لیفٹیننٹ اقبال کے گھر نوکری کرتا تھا۔ ہاجرہ کی روح کہیں اور تھی۔ اُس کی نگاہ میں افضال جوان آدمی نہیں تھا نہ وہ خوبرو تھا، ہاجرہ نے اُس میں صرف یہ کشش دیکھی تھی کہ اُس نے ہاجرہ کی عزّت کی حفاظت کی بات کی تھی اور اُس نے یہ بات بڑے ہی پیار سے انداز میں کی تھی۔

ہاجرہ پیار کی تلاش میں بھٹکنے والی روح تھی۔

افضال سے ملنے کا کوئی اور بہانہ نہ تھا۔ ہاجرہ نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ سودا سلف لانے کے لیے بازار جانے اور آنے کا راستہ لمبا کر لیا تھا۔ افضال کا کمرہ اس لمبے راستے میں آتا تھا۔

افضال کی جگہ کوئی اور آدمی ہوتا اور یوں تنہا رہتا تو لوگ ویسے ہی اُسے شکّی نگاہوں سے دیکھتے لیکن افضال مذہب میں ڈوبا ہُوا آدمی تھا جس کا زیادہ تر وقت جامع مسجد کے خطیب کی شاگردی میں گزرتا تھا۔ محلّے کے آٹھ دس بچّے اُس کے کمرے میں سپارے پڑھنے جایا کرتے تھے۔ افضال کا رکھ رکھاؤ اور لوگوں سے ملنے ملانے کا انداز اتنا پُر احترام تھا کہ اُس کے اخلاق اور کردار پر کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ فضا میں پاکستان اور بھارت کی پہلی جنگ کی بُو اتنی زیادہ پھیل گئی تھی کہ لوگوں نے اب اِدھر اُدھر دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہی لوگ جو ہاجرہ جیسی لڑکیوں کو کسی اور نظر سے دیکھا کرتے تھے اب انہی لڑکیوں کو وہ اپنی عزّت سمجھنے لگے تھے۔ وہ ہندو کی دشمنی کو جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہندو اچانک ہی یا محض اتفاق سے پاکستانیوں کا دشمن نہیں بن گیا تھا۔ یہ دشمنی بڑی پرانی تھی۔ یہ اُس روز شروع ہوئی تھی جس روز راجہ داہر کے قلعے پر محمد بن قاسم کی منجنیقوں کا پہلا پتھر گرا تھا۔ پھر یہ دشمنی اُس وقت اور پکّی ہو گئی تھی جب غزنی کے ایک مردِ مومن نے ہندوؤں کے بُت توڑ کر بُت خانے اُجاڑ ڈالے تھے اور پھر یہ دشمنی ایک قہر کی صورت اختیار کر گئی تھی جس روز ہندوستانی مسلمانوں نے "لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان" کا نعرہ لگایا تھا۔

ہندو نے پاکستان کو ختم کرنے کے لیے اٹھارہ برس اسلحہ بارود، لڑاکا طیارے اور جنگی بحری

جہاز اکٹھے کیے تھے۔ اُس نے تو اپنے ملک کو بارود خانہ بنا ڈالا تھا اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ ایک ہی ہلّے میں پاکستان کو نیست و نابود کر دے گا۔ وہ اس خوش فہمی میں حق بجانب تھا۔ اپنی جنگی طاقت آزمانے اور پاکستانیوں کا ردِّعمل اور موڈ پرکھنے کے لیے بھارتیوں نے رن کچھ میں پاکستانیوں کو للکارا۔ اُن کی توقعات کے بالکل اُلٹ پاکستانیوں کی تھوڑی سی نفری نے نہ صرف یہ کہ حملہ روک لیا بلکہ اُس علاقے کے تمام چھوٹے بڑے قلعوں پر پاک فوج کے جیالوں نے قبضہ کر لیا۔ بھارتیوں نے پورا ایک ڈویژن اپنی لاج رکھنے کے لیے جنگ میں جھونک دیا جسے ٹینکوں اور ڈویژن کے پورے توپ خانے کی پشت پناہی حاصل تھی۔ پاک فوج کے صرف ایک بریگیڈ نے دشمن کے پورے ڈویژن کو گھیرے میں لے لیا تب ہندو نے اپنا دوسرا حربہ استعمال کیا۔ اُس نے گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس موقع پر پاکستانی حکمرانوں کی ایک کمزوری اُبھر کر سامنے آگئی۔ انہوں نے فائر بندی قبول کر لی۔

پاکستان کے اس جانی دشمن نے اپنے ڈویژن کو بال بال بچا کر اعلان کر دیا کہ اب وہ پاکستان کو اپنی مرضی کے میدانِ جنگ میں لڑائے گا۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ دشمن ہمیں اپنی مرضی کے میدانِ جنگ میں للکار رہا تھا۔

یہ تو جنگی سطح کی باتیں ہیں جنہیں پاکستان کے شہری پوری طرح نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے سینوں میں ۱۹۴۷ء کی خونچکاں داستانیں ایک غبار بن کر بھری ہوئی تھیں۔ وہ اُس دشمن کو کیسے بھول سکتے تھے جس نے صرف مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی ستّر ہزار بیٹیاں اغوا کر لی تھیں اور قتلِ عام ایسا کیا تھا کہ ستلج اور بیاس مسلمانوں کے خون کے دریا بن گئے تھے۔ توقع نہیں تھی کہ پاکستانی یوں بارود کی طرح پھٹ پڑیں گے اور وہ پلک جھپکتے مردانِ حُر بن جائیں گے لیکن روایات جو مسلمانوں کے خون میں رچی بسی چلی آ رہی ہیں وہ آتش فشاں پہاڑ میں رُکے ہوئے لاوے کی طرح اُبل آئیں۔ یہی تو ہاجرہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے اور کیا ہو گیا ہے اُن نوجوانوں کو جو اُسے قدم قدم پر روکتے تھے۔ اس انقلاب کو وہ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ اب لوگوں کو ذہنی طور پر اتنی مہلت نہیں مل رہی کہ وہ اس پر غور کریں کہ ہاجرہ افضال کے کمرے میں اگر چند منٹ کے لیے جا رُکتی ہے تو کیوں۔ اگر لوگ غور کرتے تو بھی ہاجرہ کو لوگوں کی پروا نہیں تھی۔

ایک روز وہ پھر افضال کی گلی سے گزری۔ اُس کا دروازہ کھلا تھا اور وہ تین چار بچّوں کو سپارے کا سبق دے رہا تھا۔ ہاجرہ کو دیکھ کر افضال کے ہونٹوں پر تبسّم آگیا۔ ہاجرہ کھڑی اُسے دیکھتی ہی رہی۔

"آؤ ہاجرہ!" — افضال نے پوچھا — "بیٹھو گی؟"

ہاجرہ کے ماتھے پر شکن نمودار ہوتے اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے گردن کو کچھ ایسا خم دیا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اس کمرے میں کیوں آگئی ہے۔

"قرآن مجید پڑھتی ہو؟" — افضال نے پوچھا۔

ہاجرہ کی مُسکراہٹ بجھ گئی اور اُس کے چہرے پر مایُوسی کی ہلکی سی جھلک آگئی۔ اُس نے نہایت آہستہ سے سر کو دائیں بائیں ہلا دیا۔

"تم پڑھاؤ گے؟" —— ہاجرہ نے بڑی پیاری سی آواز میں پوچھا اور افضال کا جواب سنے بغیر بولی —"پر مجھے وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ یہ تو ادھر سے گزرتے تمہارے پاس آجاتی ہوں... افضال جی! سُنا ہے ہندوؤں کے ساتھ بڑی زور کی لڑائی ہوگی۔ پھر کیا ہوگا افضال جی؟"

"جو اللہ کو منظور ہوگا" —— افضال نے جواب دیا —"تم لڑائی سے ڈرتی ہو؟"

"میں اُس دشمن سے نہیں ڈرتی جس نے ہمیں ہمارے وطن سے نکال دیا تھا" —— ہاجرہ نے کہا —"اگر ہماری فوج دلیری سے لڑے تو پھر میں بہت خوش ہوں گی.... لیکن افضال جی! میرے مالکوں کا بیٹا اقبال اور صوبیدار اکبر علی بھی لڑنے کے لیے گئے ہیں۔ یہ لوفر لفنگے کیا لڑیں گے!"

"یہ اللہ کی سرزمین ہے ہاجرہ!" —— افضال نے کہا —"اپنے اللہ پر بھروسہ رکھو اور لڑنے والوں کے لیے دعا کرتی رہا کرو.... اب جاؤ"

ہاجرہ نے اُسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ جانا نہ چاہتی ہو لیکن اُسے جانا تھا۔



دو تین دن گزر گئے۔

ہاجرہ کو اور وزیرآباد کے لوگوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے کمانڈو جانبازوں نے مقبوضہ کشمیر میں اپنی جانوں پر کھیل کر بھارتی فوج کی یہ حالت کر دی تھی کہ تیل، پٹرول، گولہ بارود اور راشن کے ذخیرے تباہ کر دیئے تھے۔ فوجی نقل و حرکت کے لیے کوئی ایک پُل بھی سلامت نہیں رہنے دیا تھا۔ بھارتی فوج نے پہاڑوں کی بلندیوں پر جو پوسٹیں بنا رکھی تھیں وہ بھی تباہ کر دی تھیں۔ مقبوضہ کشمیر میں ہمارے چھاپہ ماروں نے بھارتی فوج کو اُس کی اپنی بارکوں میں قید کر دیا تھا۔ اب بھارت کی اس دہشت زدہ اور مفلوج فوج کا رشتہ بھارت سے اس طرح کاٹنا تھا کہ اسے کسی قسم کی مدد اور کمک نہ مل سکے۔

وہ مقام اکھنور تھا جس پر قبضہ کر لینے سے بھارت کے لیے کشمیر کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔

پاکستانیوں کو بیدار کرنے کے لیے خدا نے ایک موقع پیدا کیا تھا۔ زندہ اور باوقار قومیں ایسے مواقع خود ہی پیدا کر لیا کرتی ہیں۔ دشمن کو دشمن کہتے چلے جانے سے وہ کمزور نہیں ہو جایا کرتا۔ دشمن پر نظر رکھی جاتی ہے اور جوں ہی نظر آتا ہے کہ وہ اپنے عزائم کی تکمیل کی تیاریاں کر رہا ہے تو اُس پر یا تو وسیع پیمانے پر حملہ کر دیا جاتا ہے یا جنگی پیمانے پر سرحدی جھڑپیں شروع کر دی جاتی ہیں۔

پاکستان کو تو دشمن نے خود ہی موقع دیا تھا کہ وہ دیکھے کہ اُس کے اندر جذبۂ حُب الوطنی اور ملّی وقار رہ بھی گیا ہے یا نہیں۔ پاکستان کے ایوانِ حکومت میں یا پاک فوج کی ہائی کمانڈ میں معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے حکمرانوں کو قائل کر لیا کہ دشمن کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ضروری ہو گیا ہے۔ خُدا نے حکمرانوں کے دماغ میں سے کرسی کی محبّت نکال کر وطن کی محبت ڈال دی اور اُنہوں نے دشمن کا منہ بند کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ بھارت کے اُس وقت کے وزیرِاعظم نے کہا تھا کہ وہ پاکستان کو اپنی پسند کے میدانِ جنگ میں گھسیٹ کر لڑائے گا لیکن پاکستانیوں نے اُس جگہ وار کر دیا جس کی دشمن کو توقع ہی نہیں تھی۔ یہ تھا چھمب جوڑیاں سیکٹر۔

چھمب جوڑیاں سیکٹر میں بھارت نے جو دفاعی لائن تیار کر رکھی تھی اسے وہ ناقابلِ تسخیر سمجھتا تھا۔ یہ فرانس کی میگنٹ لائن جیسا مضبوط دفاع تو نہیں تھا لیکن پاک فوج کو نفری کی کمی اور اسلحہ بارُود کی کمتری کی

وجہ سے بھارت کے سیاسی اور فوجی لیڈر بہت کمزور سمجھتے تھے۔ ایسا سمجھنے میں وہ حق بجانب تھے۔ وہ اسلحہ بارود کی برتری اور نفری کی افراط کو جنگی قوّت کہتے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پاکستانی چھمب جوڑیاں سیکٹر جیسے آہنی دفاع کے ساتھ آن ٹکرائیں گے۔



۳۱ اگست اور یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کی درمیانی رات پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج نے دشمن کی اس مضبوط دفاعی لائن پر حملہ کر دیا۔ دشمن کا یہ دفاع چھوٹی بڑی قلعہ بندیوں اور دو دو تین تین منزلہ سیمنٹ کے بنکروں کی صورت میں تھا۔ یہ کئی میل دُور تک پھیلا ہُوا تھا اور دور پیچھے تک بھی گیا ہُوا تھا۔ اس دفاعی لائن کی مختلف پوسٹوں کو آپس میں لمبی خندقوں سے ملایا گیا تھا۔ اس سے دشمن کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ اُس کے ٹروپس ایک پوسٹ سے نکل کر دوسری پوسٹ تک اس طرح جا سکتے تھے کہ حملہ آوروں کو اس نقل و حرکت کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ بنکر اس قدر مضبوط تھے کہ چھوٹی اور بڑی توپوں کے گولے ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے لیکن پاکستانی اس حملے سے کچھ دن پہلے ہی بھارت کے اس دفاع کا بہت کچھ بگاڑ چکے تھے۔ پاکستان کی توپ خانہ رجمنٹیں رات کے اندھیرے میں توپیں دور آگے لے جاتیں اور گولا باری کر کے سحر کی تاریکی میں واپس آجاتی تھیں۔ پاک فوج کی یہ کارروائی غیر معمولی طور پر جرأت مندانہ تھی۔ توپ خانے کے او۔ پی جان کی بازی لگا کر دُور آگے چلے جاتے تھے اور اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دے کر صحیح اور کارگر گولا باری کراتے تھے۔

۳۱ اگست ۱۹۶۵ء تک مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی جو ڈیڑھ دو لاکھ فوج تھی اُسے ہمارے کمانڈو جانبازوں نے بیکار کر دیا تھا۔ ادھر ہمارے توپ خانے نے چھمب جوڑیاں کے دفاع کو بہت حد تک توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔ جب پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج نے حملہ کیا تو بھارتیوں کا دفاع پاکستانیوں کی پیش قدمی کو روکنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ بنکر کیا ٹوٹے کہ بھارتیوں کا مورال ہی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ بنکر کا ایک نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔ اس میں بیٹھ کر لڑنے والے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سپاہی نے سر سے پاؤں تک زرہ بکتر پہن رکھی ہو۔ بنکر میں صرف ایک گرنیڈ پھٹنے سے یا صرف دو تین گولیاں بنکر کے اندر جانے سے بنکر کے اندر والے سپاہی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ بھاگ کر جب بنکر سے نکلتے ہیں تو اُن کی ذہنی کیفیّت اُس سپاہی جیسی ہوتی ہے جس کی زرہ بکتر اُتار دی گئی ہو۔ زرہ بکتر اُتر جانے کی صورت میں سپاہی کنکریوں سے بھی ڈرتا ہے۔ کھلے میدان میں پیشقدمی کرنے والے حملہ آور پہلے ہی دلیر ہوتے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر موت کو قبول کر کے آتے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں بنکروں سے نکلے ہوئے سپاہی خوفزدہ ہوتے ہیں۔ اُن میں لڑنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ نکل بھاگنے یا ہتھیار ڈالنے کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن میں بنکروں سے نکلنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ ان کے بنکر اُن کے مقبرے بن جاتے ہیں۔

بنکروں کے اس نفسیاتی پہلو کے مظاہرے چھمب جوڑیاں سیکٹر میں دیکھے گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بنکروں کے دفاع کو توڑنا آسان کام ہے۔ بنکروں کے دفاع پر حملہ کرنا جلتے تنور میں کود جانے کی مانند ہوتا ہے —— پاکستان کے سرفروش جس طرح اس آتشِ نمرود میں کُود گئے تھے اس سے

دشمن پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ اُس کا لڑنے کا دم خم ٹوٹ گیا۔

پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج کا حملہ برق رفتار تھا۔ بھارت کے کمانڈروں کی چیخ و پکار وائرلیس سیٹوں پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ اگلے روز یعنی یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو دشمن نے اپنی پسپا ہوتی فوج کے سوال میں جان ڈالنے اور پاؤں جمانے کے لیے اپنی فضائی طاقت کا یہ مظاہرہ کیا کہ دن کے پچھلے پہر چھ لڑاکا بمبار طیّارے ہمارے جانبازوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بھیج دیئے۔ اُنہوں نے ہمارے ٹروپس پر راکٹ برسائے اور مشین گن فائرنگ بھی شروع کر دی۔ پاک فوج کے ان ٹروپس نے اپنے فضائی بیڑے کو اطلاع دی۔ اتفاق سے پاک فضائیہ کے دو ہوا باز گجرات کی فضا میں کہیں معمول کی پرواز پر تھے۔ انہیں اپنے وائرلیس سسٹم پر آواز سنائی دی — "دشمن کے طیّارے ہم پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ جلدی پہنچو"۔

پاک فضائیہ کے ان دونوں ہوابازوں نے چھمب سیکٹر کا رخ کر لیا۔ وہ ایسا معرکہ لڑنے جا رہے تھے جس میں اُن کی شکست یقینی تھی کیونکہ بھارت کے طیّارے جدید تھے۔ اُن کی رفتار آواز کی رفتار تک پہنچتی تھی اور اُن کی فائر پاور بھی زیادہ تھی۔ پاک فضائیہ کے ان دو ہوا بازوں کے پاس سیبر طیّارے تھے جو بھارت کے طیّاروں کی نسبت خاصے سست رفتار تھے۔ اُس وقت تک سیبر کو قدیم طیّارہ کہا جانے لگا تھا لیکن ہمارے ہوا باز اس عقیدے کے ساتھ جا رہے تھے کہ طیّارہ نہیں، طیّارے میں بیٹھا ہُوا ہوا باز لڑا کرتا ہے۔ اُن دونوں نے بھارت کے چھ ہوا بازوں کو جا للکارا۔ فضا طیّاروں کی مشین گنوں سے گرجنے اور گونجنے لگی۔ چند منٹوں میں معرکے کا فیصلہ ہو گیا۔ بھارت کے چھ میں سے چار طیّارے ہمارے ہوا بازوں کا نشانہ بن گئے۔ اُن کے پرخچے چھمب کی فضا میں بکھر گئے۔ دشمن کے باقی دو طیّارے بھاگ نکلے۔

پاک فضائیہ کے ان دونوں ہوا بازوں نے اپنی فوج کے مورچوں پر فاتحانہ غوطہ لگایا۔ مورچے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے پھٹنے لگے۔ اپنے یہ دو طیّارے ایسا کام کر آئے تھے جیسے خدا نے پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج کے جانبازوں کے سروں پر اپنا ہاتھ رکھ لیا ہو۔ یہ دونوں ملکوں کے فضائی بیڑوں کا پہلا معرکہ تھا۔ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے پاک فضائیہ کے لیے جرأت کی ایک مثال اور ایک روایت قائم کر دی۔

ہمارے جانبازوں کے حوصلے اور زیادہ مضبوط ہو گئے۔ اُدھر دشمن نے جب دو کے ہاتھوں اپنے چھ طیّاروں کا یہ انجام دیکھا تو اُس کے حوصلے میں ذرا سا جو دم خم رہ گیا تھا وہ بھی نہ رہا۔



مِلّتِ پاکستان کو ابھی تفصیل سے نہیں بتایا گیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے اور ہمارے کتنے ہی جانباز پاکستان اور کشمیر کی آن پر جانیں قربان کر چکے ہیں۔ صدائے کشمیر ریڈیو صرف یہ بتاتا تھا کہ کشمیر کے حریّت پسندوں نے مقبوضہ کشمیر میں گوریلا جنگ شروع کر دی ہے اور وہ بھارت کی فوج کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ پاکستان کے ریڈیو اور اخباروں نے سرکاری ذرائع سے معمولی سی خبریں دیں کہ پاک فوج اور آزاد کشمیر فوج نے مقبوضہ کشمیر کی فائر بندی لائن پر کچھ چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے لیکن اُس وقت تک چھمب سیکٹر

سے بھاگے ہُوئے بھارتی سُورمے راستے میں اپنے پندرہ اچھے بھلے ٹینک، نیز بالکل صحیح حالت میں توپیں، بے انداز اسلحہ اور ایمونیشن، دیگر جنگی سامان اور لاشوں کے انبار چھوڑ گئے تھے۔

پاکستان کے شہریوں کو ابھی یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ بھارت کی وہ کثیر تعداد فوج جس کی افراط پر اُس کے سیاسی اور فوجی لیڈروں کو ناز تھا دُور پیچھے جوڑیاں تک پہنچ چکی ہے۔ جوڑیاں کا دفاع ایک بلندی پر تھا۔ اُس مقام کا نام ٹرونٹی ہے۔ یہ دفاع اس لیے ناقابلِ تسخیر لگتا تھا کہ بلندی پر تھا اور دوسرے اِس لیے کہ وہاں بے انداز ٹینک شکن اسلحہ اس طرح پوزیشن میں رکھا ہُوا تھا کہ کسی طرف سے بھی اس دفاع پر ٹینک کامیاب حملہ نہیں کر سکتے تھے لیکن پاک فوج اور آزاد کشمیر کے جانبازوں نے اپنے طیّاروں کی مدد سے یہ دوسرا مضبوط مورچہ بھی توڑ لیا۔ اب بھارتی بھاگے تو انہوں نے اکھنور جا دم لیا۔

اخباروں میں لوگوں سے یہ اپیل کی جاتی تھی کہ کشمیر سے آنے والے مہاجرین کے لیے کپڑوں اور بستروں کی ضرورت ہے۔ آگے سردی کا موسم آ رہا تھا۔ لوگوں نے نئے گدّے، رضائیاں، سویٹریں اور گرم کپڑے اس طرح جمع کر دیئے کہ ٹرک بھر بھر کر راولپنڈی اور آزاد کشمیر جانے لگے۔ کشمیر سے پناہ گزینوں کا ایک ریلا ۴۸-۱۹۴۷ء میں آیا تھا۔ اس قسم کا ایک اور ریلا اگست ستمبر ۱۹۶۵ء میں آنا شروع ہو گیا۔ ہمارے کمانڈو آپریشن کی سزا مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کو ملی۔ اُن کی بستیوں کی بستیاں جلا دی گئیں۔ اُن کے بچّے سنگینوں اور گولیوں سے شہید کیے گئے اور اُن کی بیٹیاں اغوا کر لی گئیں۔ اس کے باوجود جب کشمیری پناہ گزین سرحدوں پر آ کر دیکھتے تھے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجیں کشمیر پر حملہ کر رہی ہیں تو وہ اپنے دُکھ اور مصائب بھول جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اب ان کا وطن بھارتی استبداد سے آزاد ہو جائے گا۔ ان میں بعض سرحدوں پر آ کر اپنی فوج کے پاس رُک جاتے اور کہتے تھے کہ کشمیر فتح کرو یا اعلان کر دو کہ کشمیر کے ساتھ پاکستان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستان میں "کشمیر بزورِ شمشیر" کا نعرہ لگتا ہے تو مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں کے دو تین گاؤں نذرِ آتش کر دیئے جاتے ہیں۔

اب تو ایسے لگتا تھا جیسے پاکستانی کشمیر فتح کر کے ہی دم لیں گے لیکن پاکستان کی سیاست نے فوج کے جذبے پر اس طرح پانی پھیر دیا کہ اُس کیفیّت میں جب دشمن صحیح معنوں میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اکھنور میں بھی اُس کے پاؤں نہیں جمیں گے، پاکستان کے بادشاہ نے اپنا ایک منظورِ نظر جرنیل چھمب سیکٹر کی کمانڈ لینے کے لیے صرف اس لیے بھیج دیا کہ اتنی بڑی فتح کا سہرا جو پہلے ہی حاصل کی جا چکی تھی، اس جرنیل کے سر بندھے۔ ڈویژن کا چارج لینے دینے میں تیرہ گھنٹے ضائع ہو گئے۔ میدانِ جنگ میں ایک ایک منٹ قیمتی ہوتا ہے۔ تیرہ گھنٹوں میں دشمن نے اکھنور میں اپنا دفاع مضبوط کر لیا اور بے انداز کمک اکھنور کے دفاع میں مورچہ بند کر دی۔ اس کے علاوہ اُسی رات اپنی بے پناہ جنگی طاقت پاکستان کی سرحد پر لے آیا۔



پانچ ستمبر ۱۹۶۵ء دن کے ایک بجے ہاجرہ کے گھر والے کھانا کھا چکے تھے اور ہاجرہ برتن اٹھا رہی تھی۔ ریڈیو پاکستان سے اعلان ہُوا — "ایک ضروری اعلان سُنیئے" — ضروری اعلان یہ تھا کہ آزاد کشمیر فوج نے پاک فوج کی مدد سے چھمب سیکٹر میں بھارت کے ایک مضبوط فوجی مقام جوڑیاں پر قبضہ کر لیا ہے۔

لیفٹیننٹ اقبال کا باپ چونک اٹھا۔ گھر کی عورتیں اُسے دیکھنے لگیں۔

"اب کیا ہوگا؟" — اقبال کی ماں کے مُنہ سے جیسے سسکی نکل گئی۔

"جنگ" — اقبال کے باپ نے کہا — "ایسا ہونا ہی تھا۔"

"اللہ نہ کرے" — اقبال کی ماں نے کہا — "میرے اقبال کا کیا بنے گا؟ معلوم نہیں وہ ہے کہاں۔"

"ابّا جان!" — اقبال کی ایک بہن نے کہا — "آپ بھائی جان اقبال کو تار دے دیں کہ امی سخت بیمار ہیں۔ جلدی پہنچو۔ اس طرح انہیں چھٹی مل جائے گی۔"

"ہاں ہاں تار دے دو" — اقبال کی ماں نے کہا — "بلکہ لکھ دو کہ تمہاری ماں مرگئی ہے میں نے سُنا ہے کہ اس طرح فوجیوں کو فوراً چھٹی مل جاتی ہے۔ اُسے لکھو کہ لمبی چھٹی لے کر گھر آجائے۔"

اقبال کا باپ اپنی بیوی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرے مُنہ کی طرف کیا دیکھنے ہو" — اقبال کی ماں نے دبدبے سے کہا — "ابھی جاؤ اور تار دے آؤ۔"

"میں تمہارے مُنہ کی طرف دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم کس ملک کی ماں ہو" — باپ نے کہا — "خدا نے تم سے پاکستان کی وہ قیمت نہیں لی جو سرحد پار سے آنیوالوں سے لی تھی۔ ہزارہا اقبال شہید ہو گئے تھے۔"

"تو کیا اپنے اکلوتے بیٹے کو شہید کراؤ گے؟" — ماں نے طنز بھرے غصّے سے پوچھا۔

"نہ بیگم صاحبہ!" — اقبال کے باپ نے کہا — "اُسے گھر لا کر تمہاری گود میں لٹا دوں گا۔"

"ابّا جان!" — اقبال کی چھوٹی بہن نے کہا — "فوج سے ایک آدمی کم ہو گیا تو کیا فرق پڑ جائے گا؟

دُوسرے ملکوں کے ساتھ لڑائی لڑنے سے حاصل ہی کیا ہوتا ہے؟" — دوسری بہن نے کہا — "خواہ مخواہ اپنے جوان آدمی مارے جاتے ہیں۔"

"تم دونوں میری بیٹیاں ہو" — اقبال کے باپ نے کہا — "مجھے ایسی بات کہنی تو نہیں چاہیئے لیکن نہ کہنے سے تم کچھ سمجھو گی بھی نہیں .... اگر قوم کے جوان اپنی جان اور خون کی قربانی نہ دیں تو تم دونوں اور تم جیسی ہماری لاکھوں بیٹیاں دُشمن کی عیاشی کا ذریعہ بن جائیں۔ اگر ہر بہن اس طرح سوچتی کہ اُس کا بھائی فوج میں نہ ہُوا تو کیا فرق پڑ جائے گا تو آج نقشے پر پاکستان کا نام ونشان نہ ہوتا .... زمانہ ایسا بدلا ہے کہ لوگوں کی سوچیں ہی بدل گئی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کا بچہ اپنے ملک اور اپنے مذہب پر قربان ہونے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ اقبال اگر شہید ہو گیا تو میرے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی۔"

"تمہارے مُنہ میں خاک" — اقبال کی ماں بولی — "شہید ہوں میرے بیٹے کے دُشمن۔"

"تمہارے لئے تو میں ایک ہی دُعا کرتا ہوں" — اقبال کے باپ نے کہا — "خدا کرے اس گھر پر انڈیا کا ایک بم گرے اور صرف تم زندہ رہو۔ پھر تم سمجھ جاؤ گی کہ مائیں اپنے بیٹوں کو کیوں شہید کراتی ہیں۔"

یہ کہہ کر باپ باہر نکل گیا۔

ہاجرہ اُن سب کی باتیں سن رہی تھی اور اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اقبال کے کردار سے اچھی طرح واقف تھی۔ دل ہی دل میں اُس نے دُعا کی کہ ایک گولی اقبال کے سینے سے بھی پار ہو جائے۔ اس دھرتی سے ایک گناہگار کا بوجھ تو کم ہو جائے گا۔ اُسے خیال آرہا تھا کہ اس قسم کی ماں کا بیٹا ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ

اقبال کو شہادت کے رتبے کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔



ہاجرہ اس گھر کے کسی فرد سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ریڈیو نے یہ جو ضروری اعلان کیا ہے یہ کیا تھا اور اس میں کیا ضروری پن تھا لیکن اس اعلان نے گھر میں ماتم کی سی فضا پیدا کر دی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی، کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ ایسے میں اُسے افضال کا خیال آگیا لیکن فوری طور پر افضال کے پاس جانے کا کوئی بہانہ نہیں تھا۔ یہ بہانہ اُسے شام سے کچھ دیر پہلے مل گیا۔ اُسے بازار سے کچھ لانا تھا۔ وہ حسب معمول افضال کی گلی میں چلی گئی۔ اب تو لوگوں کے انداز بالکل ہی بدل گئے تھے۔ لوگوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی۔ ایک گلی میں اُسے پانچ چھ آدمی کھڑے نظر آئے جن میں دو نوجوان تھے۔ وہ پاکستان اور ہندوستان کی لڑائی کی باتیں کر رہے تھے۔ ہاجرہ اُن کے قریب سے گذری۔ کسی نے اُسے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ افضال کے کمرے میں جا پہنچی افضال اُسے اکیلا مل گیا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

"افضال جی!" — ہاجرہ نے اُس سے پوچھا — "آپ نے بھی دوپہر کو ریڈیو کا اعلان سنا ہوگا۔"

"سنا تھا ہاجرہ!" — افضال نے کہا۔

"یہ کیا اعلان تھا؟" — ہاجرہ نے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے تم میری باتیں بھول گئی ہو" — افضال نے کہا۔

"میں کچھ بھی نہیں بھولی" — ہاجرہ نے کہا — "لیکن آج ریڈیو نئے نئے نام لے رہا تھا۔"

"چھمب اور جوڑیاں!" — افضال نے کہا — "میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔"

اپنے پاس بٹھا کر افضال نے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بہت سی باتیں تو وہ اُسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

"اب تمہارا کشمیر آزاد ہو جائے گا" — افضال نے کہا۔

"تو کیا میں واپس اپنے وطن چلی جاؤں گی؟" — ہاجرہ نے بچوں کے سے اشتیاق سے پوچھا — "اور یہ جو ہزاروں کشمیری یہاں جھگیوں اور احاطوں میں پڑے ہیں، کیا یہ بھی اپنے وطن کو چلے جائیں گے؟"

"ہاں ہاجرہ!" — افضال نے کہا — "تم جانا چاہو گی تو چلی جانا۔ وہ تمہارا اپنا وطن ہوگا۔"

"افضال جی!" — ہاجرہ نے افضال کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پوچھا — "تم بھی میرے ساتھ چلو گے؟"

"کہو گی تو چلا چلوں گا" — افضال نے جواب دیا اور اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

ہاجرہ اپنے آپ کو قوم کا اہم فرد سمجھنے لگی۔ اُس کے دل میں پاکستان اور کشمیر کا پیار پیدا ہو گیا اور افضال پاکستانی خودداری کی بڑی پیاری علامت بن گیا۔ اُس کی نظریں افضال کے چہرے پر جم گئیں۔ اُس پر خود سپردگی کی ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ اُسے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔ اُس کا سر اپنے آپ ہی افضال کے کندھے پر چلا گیا۔ افضال کی انگلیاں ہاجرہ کے ریشم جیسے بالوں میں رینگنے لگیں۔ ہاجرہ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ یہ مرد کے جسم کے پہلے مس کا اثر تھا یا اُس پیار اور اہمیت کا اثر تھا جو اُسے افضال نے دی تھی کہ ہاجرہ مدہوش سی ہو گئی۔ اُس کی انگلیاں افضال کے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں اُلجھ گئیں۔

"پاکستان" — کسی بچے نے چلّا کر کہا اور دس بارہ بچوں نے نعرہ لگایا — "زندہ باد" — ہاجرہ بدک کر افضال سے پرے ہٹ گئی۔ اُس کا دل اتنی زور سے تڑپنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ ہاجرہ کی وارفتگی اور خودسپردگی ایسے خوف کی صورت اختیار کرگئی جیسے وہ چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ افضال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"تم ناراض تو نہیں ہوتے افضال جی!"

"نہیں ہاجرہ!" — افضال نے کہا — "ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں لیکن ہاجرہ! میرے پاس اتنی زیادہ نہ آیا کرو"۔

"کہتی تو میں بھی یہی ہوں" — ہاجرہ نے کہا — "لیکن اپنے آپ کو آنے سے روک نہیں سکتی"۔

▼

شام کو جب ہاجرہ گھر والوں کو کھانا کھلانے کے لئے ڈونگوں میں سالن ڈال رہی تھی تو اُس کے جی میں آئی کہ ایک پلیٹ سالن افضال کو بھی دے آئے لیکن کیسے؟ گھر والوں کو کیا بتائے گی کہ سالن کسے دینے جارہی ہے؟ وہ افضال کے لیے چوری چھپے کھانا لے جاسکتی تھی لیکن اُس کا دل چوری پر آمادہ نہ ہوا۔ اُس کی اپنی بھوک جیسے مرہی گئی تھی۔ رات اُسے نیند بھی نہ آئی۔ ذرا سی دیر کے لیے آنکھ لگی تو خواب میں بھی اُس نے افضال کو دیکھا۔ آنکھ کھلی تو افضال کو ہی پلکوں میں چھپا دیکھا۔ رات کا آخری پہر تھا جب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

جب ہاجرہ کی آنکھ لگی اُس وقت رات گذر چکی تھی۔ سحر کی تاریکی ابھی گہری تھی — اِدھر ہاجرہ کی آنکھ لگی اُدھر لاہور کے سرحدی دیہات کے لوگ انڈین آرمی کے "جے کاروں" اور چھوٹے ہتھیاروں کے فائر سے ہڑبڑا کر جاگ اُٹھے۔ انڈین آرمی کے سُورمے جو پاکستان کو فتح کرنے آئے تھے سرحد کے نہتے دیہاتیوں کے گھروں میں گھُس کر ۱۹۴۷ء کی یاد تازہ کرنے لگے۔ اُنہوں نے مردوں کو الگ اور عورتوں کو الگ کرلیا۔ ان نہتے اور معصوم دیہاتیوں پر انڈین آرمی کے افسروں اور جوانوں نے ہر وہ ظلم کیا جو اُن کے دماغ میں آیا۔ یہی ہندو کی خصلت ہے۔ جنگجو قومیں نہتوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتیں لیکن ہندوؤں کے دلوں میں پاکستانیوں کی اس قدر نفرت بھری ہوئی ہے کہ وہ مسلمان کے دودھ پیتے بچے کو بھی قتل کرکے فخر اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔

بھارت نے بے پناہ جنگی قوت سے پاکستان پر حملہ کردیا تھا۔ کشمیر کو بچانے کے لیے بھارتیوں کے پاس یہی ایک حربہ تھا کہ پاکستان پر حملہ کردیتے۔ وہ اُنہوں نے کردیا۔ دشمن کا حملہ چونکہ اچانک تھا اور اس کی نفری اور جنگی قوت پاک فوج کی نسبت پانچ گنا سے زیادہ تھی اس لئے پہلے ہلّے میں ہمارے کئی افسر اور جوان شہید ہوگئے۔ سب سے زیادہ نقصان رینجرز کا ہُوا جن کے پاس صرف رائفلیں اور لائٹ مشین گنیں تھیں۔ دشمن کی یلغار بڑھتی آرہی تھی — اور وزیرآباد کا شہر گہری نیند سویا ہُوا تھا۔

▼

یہ چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح تھی۔ ہاجرہ علی الصبح اٹھی۔ اُس کے چہرے پر شب بیداری کا تاثر صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ناشتے کا سامان لینے کے لیے بازار چلی گئی۔ گلیوں میں آتے جاتے لوگوں کو ابھی معلوم نہیں ہُوا تھا کہ بھارت نے پوری طاقت سے لاہور پر حملہ کردیا ہے۔ دو جیٹ طیارے گرجدار زنّاٹے سے وزیرآباد کے اوپر سے گذر گئے۔ ہاجرہ نے طیارے تو کئی بار وزیرآباد کے اوپر سے گذرتے دیکھے تھے لیکن اُن کی آواز اس قدر

بھیانک نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دُور سے دو دھماکے سنائی دیئے۔

"جہازوں نے کہیں بم گرائے ہیں" — کسی کی بلند آواز سنائی دی — "یہ ہندوستان کے جہاز تھے"۔

شہریوں کے لیے ہوائی جہاز ہوائی جہاز تھا، وہ اپنے اور پرائے ہوائی جہاز کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ دو اور طیّارے زنّاٹے سے گذر گئے۔ وزیرآباد کے لوگ نہ پہلے طیّاروں کو پہچان سکے نہ بعد میں گذر جانے والے طیّاروں کو۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وزیرآباد سے پانچ ہی میل دُور دھونکل ریلوے سٹیشن پر جو مسافر گاڑی رُکی کھڑی تھی، انڈین ایئر فورس کے یہ طیارے اس مسافر گاڑی پر راکٹ اور مشین گن فائرنگ کرگئے ہیں۔ اس ہوائی حملے میں کئی مسافر زخمی اور چار شہید ہوگئے تھے۔ شہید ہونے والوں میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

انہی دو طیّاروں نے یا بعد میں آنے والے دو طیّاروں نے دھونکل کے قریب دو اور چھوٹے چھوٹے ریلوے سٹیشنوں — گکھڑ اور راہوالی — پر کھڑی ریل گاڑیوں پر راکٹ اور بم برسائے۔ پاک فضائیہ کے دو ہوا باز قریب کہیں اُڑ رہے تھے۔ انہیں پیغام ملا کہ دشمن کے طیارے ریلوے سٹیشنوں پر حملے کررہے ہیں۔ پاک فضائیہ کے دونوں ہوا باز وزیرآباد کی فضا میں پہنچ گئے اور انہیں دشمن کے طیارے نظر آگئے۔ پاکستانی ہوا باز ان پر جھپٹ پڑے۔ ذرا سی دیر میں اُنہوں نے دشمن کے ایک طیارے کو مار گرایا اور نہتے مسافروں کے خون کا انتقام لے لیا۔ دشمن کے باقی تین طیّارے بکھر کر اُس دیس کو بھاگ نکلے جس دیس میں گنگا بہتی ہے۔

وزیرآباد کے لوگوں کو کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ ایک ہولناک جنگ ایک ہی اُڑان میں اُن کے دروازے تک پہنچ گئی ہے۔ دھونکل، گکھڑ اور راہوالی کی طرف سے آنے والی بسوں کے مسافروں نے ریلوے سٹیشنوں پر انڈین ایئر فورس کے طیاروں کے حملے کی خبر وزیرآباد پہنچائی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر وزیرآباد کے گھر گھر میں پہنچ گئی۔ وزیرآباد کے ماحول میں ہیجان کا طوفان آگیا۔ ہر کسی پر غصّے اور انتقام کی ایسی کیفیت طاری ہوگئی جیسے ہر کسی کا کوئی قریبی عزیز قتل ہوگیا ہو۔ کئی لوگ دوڑتے ہوئے بسوں پر جا چڑھے اور ان تینوں ریلوے سٹیشنوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ نوجوان لڑکے اور طلبا سائیکلوں پر ہی ان سٹیشنوں کی طرف یوں چل پڑے جیسے یہ سائیکل ریس ہو۔ وزیرآباد کا ہر شہری بھک سے اُڑ جانے والا بارود بن گیا تھا۔

"کافروں نے ہمارے گھر میں آکر بم گرائے ہیں"۔

"ہندو کی یہ مجال!"

"کچل کر رکھ دیں گے"۔

"شہیدوں کے خون کے ایک ایک قطرے کا انتقام لیں گے"۔

اور ایسی ہی جلی کٹی غصیلی اور سخت جوشیلی آوازیں نعرے بن کر وزیرآباد کی گلیوں سے اُٹھ اُٹھ کر اُس فضا کو مرتعش کررہی تھیں جس میں سے تھوڑی دیر پہلے بھارت کے چار لڑاکا بمبار طیارے گذر گئے تھے۔ یہ احساس انہیں دیوانہ بنائے جارہا تھا کہ انہیں وطن کی آن پر کٹ مرنا ہے۔ وہ رہ رہ کر آسمان کی طرف یوں دیکھتے تھے جیسے انڈین ائیر فورس کے طیارے پھر آئیں گے اور وہ ان طیاروں کو فضا میں ہی بھسم کردیں گے — لیکن کس طرح! دشمن کے طیاروں کے پر شہری کس طرح نوچ سکتے ہیں؟

یہی ایک سوال تھا جو وزیرآباد کی فضا میں منڈلاتا پھر رہا تھا۔ لوگوں کی بے چین آنکھوں میں، جوش اور جذبے سے اکھڑی ہوئی سانسوں میں اور دل کی دھڑکنوں میں یہی ایک سوال کلبلا رہا تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا جو انہیں اس

سوال کا جواب دیتا۔ اُنھوں نے جنگ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُن کے ملک پر کبھی حملہ نہیں ہُوا تھا، لیکن ہر آدمی ہر عورت اور ہر بچہ جس کا شعور بیدار تھا محسوس کر رہا تھا کہ یہ جو کچھ ہُوا ہے اور ہو رہا ہے، یہ ان کے لیے نیا تو ضرور ہے لیکن عجیب اور غیر مانوس نہیں۔ جیسے ان کے ساتھ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہو، جیسے باطل نے پہلے بھی حق پر جھپٹا مارا ہو۔ ان لوگوں میں جو اپنی تاریخ سے واقف تھے وہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلام اور کفر کا ایک اور معرکہ ہے اور یہ اُن معرکوں کی ایک کڑی ہے جو چودہ سو سال سے لڑے جا رہے ہیں۔ بعض نے اسے ایک اور صلیبی جنگ کہا۔

جو لوگ کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے، اُنہیں از خود ہی اشارے ملنے لگے کہ اس صورتِ حال میں اُنہیں کیا کرنا چاہیے۔ کسی نے کہہ دیا کہ سڑک پر فوجی ٹرک لاہور کی طرف جا رہے ہیں۔ لوگ پھول، پھل، شربت، طرح طرح کی بوتلیں، انگور کی پیٹیاں، مرغیاں، انڈے، روٹی اور برف کے بلاک اُٹھاتے اُس سڑک پر جا پہنچے جو شاہراہِ پاکستان کہلاتی ہے۔ اُنھوں نے فوج کا ایک ٹرک دیکھا تو اُسے روک لیا، پورا کنواتے دیکھا تو اس کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ وہ جو کچھ ساتھ لاتے تھے، فوجی ٹرکوں میں پھینکنے لگے۔

”خدا کے لیے ہمیں نہ روکو“ —— فوجی چلّا چلّا کر کہتے تھے —— ”رُکنے کا وقت نہیں۔ ہم مر گئے تو تم محاذ پر جانا“

لوگوں نے وقت کی ضرورت اور فوجی ڈسپلن کی پروا نہ کی۔ وہ اپنے جذبوں کی تسکین کر رہے تھے۔ کئی نوجوان ٹرکوں پر چڑھ بیٹھے کہ ہم بھی محاذوں پر جائیں گے۔ عورتیں دور کھڑی دوپٹے پھیلا کر فوجیوں کے لیے دعا مانگ رہی تھیں —— ”شاستری مُردہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔ پاک فوج زندہ باد“ کے نعرے بموں کی طرح پھٹ رہے تھے۔ اب فوجی ٹرک چلے تو اُن کی چال ہی نرالی تھی اور فوجیوں کے چہرے جذبہ حب الوطنی سے دمکنے لگے تھے۔



ہاجرہ نے اُس روز بازار میں سودا سلف خریدتے کچھ زیادہ ہی وقت لگا دیا۔ وہ لوگوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی، لیکن گھر آئی تو وہاں مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ گھر والوں سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اُسے یہی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ وہ تو سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وزیر آباد کے بڑے بڑے دانشمندوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ انڈین ائر فورس کے لڑاکا بمبار طیاروں نے ان چھوٹے چھوٹے ریلوے سٹیشنوں پر کھڑی نہتی ریل گاڑیوں کو کیوں نشانہ بنایا ہے۔ یہ بھارت کے جاسوسوں کا کمال تھا۔ وزیر آباد کے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُن کے فلک شگاف نعرے اُن سرگوشیوں کو نہیں دبا سکتے جو اسی شہر میں سے اُٹھ اُٹھ کر سرحد پار بھارت کی انٹیلی جنس تک پہنچ رہی تھیں۔ اتنی دُور تک یہ سرگوشیاں نعروں سے بھی بلند آواز میں سنائی دے رہی تھیں۔

بھارت کے یہ طیارے خود نہیں آتے تھے، بلاتے گئے تھے۔ سحر کی تاریکی میں لاہور ریلوے سٹیشن سے ایک مال گاڑی روانہ ہوئی تھی جس میں فوجی سامان اور گولہ بارود بھرا ہُوا تھا۔ اس گاڑی کی منزل سیالکوٹ تھی۔ اسے وزیر آباد کے راستے سیالکوٹ تک پہنچنا تھا۔ بھارت کے جاسوسوں نے سرحد پار اس گاڑی کی روانگی اور اس کی جنگی اہمیت کی اطلاع دے دی تھی۔ اس گاڑی کو راستے میں تباہ کرنے کے لیے انڈین ائر فورس کے طیارے ایسے وقت بھیجے گئے جو صبح طلوع ہونے کا وقت تھا۔ بھارت کے جاسوسوں نے بالکل صحیح اطلاع بھیجی تھی، لیکن اس اطلاع پر عمل کرنیوالوں سے کچھ کوتاہی ہوگئی۔ حملہ آور طیارے اُس

وقت آئے جب یہ مال گاڑی وزیر آباد ریلوے سٹیشن پر کھڑی تھی یا کہیں رُکے بغیر وقت سے پہلے خطرے سے نکل گئی تھی۔ جب بھارت کے ہوا باز آئے تو اپنے اصل شکار کو نہ پا کر اس علاقے میں جہاں کہیں کوئی ریل گاڑی کھڑی دیکھی اُنھوں نے اُسی پر راکٹ یا بم گرا دیتے۔ انہیں توقع تھی کہ وہ گاڑی انہی میں سے کوئی ایک ہوگی۔

صرف وزیر آباد میں ہی نہیں، تمام تر پاکستان میں لوگوں کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پتہ چلا کہ محاذ کے زخمیوں کے لیے خون کی ضرورت ہے۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اور مریض بھی ہسپتالوں اور ریڈ کراس کے مرکزی دفتروں میں جا پہنچے اور اپنی رگوں سے خون نکلوا کر خون کے تالاب جمع کر دیتے۔ وزیر آباد کی تو یہ کیفیت تھی کہ جن کے پاس سکوٹر، موٹر سائیکل یا گاڑی تھی وہ اپنے ساتھ جتنے بھی آدمیوں کو بٹھا سکتے تھے بٹھا کر خون دینے کے لیے لاہور چلے گئے۔ وہ لڑکیاں جو برقعوں میں مستور اور چار دیواری میں بند رہتی تھیں اور وہ لڑکیاں جو بال کٹواتے تنگ لباس میں نیم عریاں نظر آتی تھیں، ایک مرکز پر جمع ہو گئیں۔

”ہمیں کوئی کام بتاؤ“ —— ان سب کا ایک ہی مطالبہ تھا —— ”ہمیں اُن ہسپتالوں میں بھیج دو جہاں محاذ کے زخمیوں کو لایا جاتا ہے“

نوجوان جو راہوں میں کھڑے ان لڑکیوں سے چھیڑ خانی کو جینے کا مقصد سمجھتے تھے اور جن کا کردار لذّت پرستی سے مرکب تھا وہ انہی لڑکیوں کے دوش بدوش شہری محاذ پر یکجا ہو گئے —— جنس مٹ گئی، مرد مٹ گیا، عورت مٹ گئی اور ایک فرد نے جنم لیا جس کا نام پاکستانی تھا۔ تمام تر جذبات اور احساسات انڈین ائر فورس کے پہلے حملے سے ایمان کی بھٹی میں پگھل کر ایک نئے سانچے میں ڈھل گئے جسے جذبہ حریّت کہتے ہیں۔

پاکستان مردانِ حُر کا وطن بن گیا۔

کسی نے کہہ دیا کہ وطن کے دفاع کے لیے پیسہ چاہیئے تو لوگوں نے عیاشیاں اور روزمرّہ کی ضروریات بھی ملتوی کر دیں اور اپنی توفیق سے بڑھ کر بنکوں میں روپے پیسے کے انبار لگا دیتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی بچیوں کے جہیز کے زیورات دفاعی فنڈ کے حوالے کر دیتے۔ جس کے پاس پیسہ نہ تھا اُس نے آٹے کا کنستر ہی دے دیا۔ جگہ جگہ قطاریں نظر آنے لگیں —— خون دینے کے لئے قطاریں، پیسے جمع کرانے کے لیے قطاریں، فوجیوں کے لئے تحفے تحائف دینے کے لیے قطاریں، شاہراہ پاکستان کے دونوں طرف فوجیوں کو نعرے لگا لگا کر رخصت کرنے کے لئے قطاریں۔

قوم قطار اندر قطار منظم ہو گئی۔ قوم نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔

شام سے کچھ پہلے ہاجرہ کو بازار جانا پڑا۔ یہ تو وہ تین چار دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ اُسے چھیڑنے والے اُس سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ اُس نے ایک اور انقلاب دیکھا۔ کہیں سے کسی فلمی گیت کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پنواڑی کی دکان کے سامنے سے گذری تو اُس کے ریڈیو سے ہاجرہ کو جوشیلا ترانہ سنائی دیا۔

اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا

اللہ اکبر اللہ اکبر

وہ جدھر بھی گئی اُسے جنگی ترانے سنائی دیتے۔ وہ ایک گلی میں سے گذر رہی تھی تو [illegible] چار

عورتیں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ ہاجرہ اُن کے قریب سے گذری تو ایک عورت کہہ رہی تھی ــ "ہم بے غیرت تو نہیں۔ ہندو کافروں کی بوٹی بوٹی کر دیں گی"۔

"ہم نے بیٹے گلیوں میں آوارہ پھرنے کے لیے تو نہیں جنے" ــ ایک عورت نے کہا۔

ہاجرہ کے جسم نے جھرجھری لی اور اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا دل غیر قدرتی سی چال سے دھڑک رہا ہے۔ وہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اُس کے ذہن میں انوکھی انوکھی باتیں آ رہی تھیں لیکن اُسے بات کرنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ اُس نے اپنے اندر بے چینی محسوس کی اور وہ آگے بڑھ گئی۔

ہاجرہ آگے گئی۔ دو نوجوان لڑکے آ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بالٹیاں اور بیلچے تھے۔ اُسے چھیڑنے والوں کی فہرست میں یہ دونوں نوجوان شامل تھے۔ یہ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکی گونگی ہے۔ ہاجرہ انہیں دیکھ کر ایک طرف ہو گئی۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ ان دونوں میں کوئی تبدیلی آئی ہو گی، لیکن وہ اس طرح اُس کے قریب سے گذر گئے جیسے اُنہوں نے اُسے دیکھا ہی نہ ہو۔ اُن دونوں کے قدموں میں تیزی اور چہروں پر ایسا تاثر تھا جیسے اُن کے گھر کو آگ لگ گئی ہو۔

ان کے پیچھے پیچھے تین اور لڑکے جو انہی جیسے نوجوان تھے دوڑتے آتے۔ دو نے ایک سٹریچر پکڑ رکھا تھا اور تیسرے کے پاس ایک بکس تھا۔ ہاجرہ انہیں بھی اچھی طرح پہچانتی تھی اور دل ہی دل میں انہیں گالیاں دیا کرتی تھی، مگر آج یہ لڑکے اُسے اتنے پیارے لگے کہ وہ انہیں روک کر دو چار باتیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک اور لڑکا دوڑتا آیا۔ ایک آدمی نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

"اے۔ آر۔ پی پوسٹ پر سامان اکٹھا کر رہے ہیں" ــ لڑکے نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا "معلوم نہیں کس وقت شہر پر بمباری ہو جاتے۔ زخمیوں کو ملبے سے نکالنے کے لیے سامان پورا ہونا چاہیئے"۔

ہاجرہ اُس کے قریب رُک گئی۔

"ہاجو!" ــ اس لڑکے نے ہاجرہ کے پاس رُک کر کہا ــ "تم ڈری ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ دل مضبوط رکھو بم گریں تو گھبرانا نہیں۔ اللہ مالک ہے۔ کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ ہو بھی گیا تو ہم سنبھال لیں گے .... چناب کے پُل پر جہازوں کو مار گرانے والی توپیں اور مشین گنیں لگ گئی ہیں"۔

ہاجرہ کے جی میں آئی کہ اس لڑکے کا مُنہ چُوم لے حالانکہ اس لڑکے نے ایک بار اس کا دوپٹہ کھینچ کر سر سے اتار دیا تھا۔ آج یہ تمام لڑکے اُسے افضال کی طرح اچھے لگنے لگے۔ اُس کے جی میں آئی کہ وزیر آباد کے ہر گھر میں جائے اور اپنے جیسی جوان لڑکیوں سے کہے ــ "بم گریں تو گھبرانا نہیں۔ لڑکے سنبھال لیں گے"۔



چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کی دوپہر تک دشمن کی اس طوفانی یلغار کو روک لیا گیا تھا لیکن ابھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بھارتی لشکر نہر کے پار ہی رُکا رہے گا۔ بھارتی حکومت نے پاکستانی قوم کا جذبہ مجروح کرنے کے لیے ایک تو اپنے ریڈیو سے یہ بے بنیاد خبر نشر کی تھی کہ انڈین آرمی لاہور پر قابض ہو گئی ہے، ہندو لیڈروں نے دوسرا کمال یہ کر دکھایا کہ برطانیہ کے نشری ادارے بی بی سی سے بھی یہی خبر نشر کرا دی۔ دشمن اٹھارہ برسوں سے پاکستان کو ختم کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بھارت کے پہلے وزیر خارجہ سردار پٹیل نے جسے ہندو مردِ آہن کہتے تھے، پاکستان کے معرضِ وجود میں آتے ہی ڈنکے کی چوٹ کہا تھا ــ "ہم

پاکستان کو اس قابل بننے ہی نہیں دیں گے کہ وہ ہمارا ایک بھی وار سہہ سکے"۔

مہاتما گاندھی تو یہی کہتے کہتے مر گیا ــ "پاکستان کے وجود کو بھارت کی تاریخ کسی قیمت پر تسلیم نہیں کر سکتی"۔

بھارت کے سب سے پہلے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے جسے ہندو مہاتما گاندھی کے بعد کا درجہ دیتے تھے، کہا تھا ــ "ہم دریاؤں اور نہروں کا پانی بند کر کے پاکستان کو ریگستان بنا ڈالیں گے"۔

بھارت کے ان حکمرانوں نے اٹھارہ برس اپنی رعایا کو بھوکا ننگا رکھ کر چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کے حملے کے لیے اسلحہ بارود جمع کیا تھا۔ اُنہوں نے لوگوں کی خُون پسینے کی کمائی پر ظالمانہ ٹیکس لگا کر فرانس، برطانیہ اور رُوس سے جدید لڑاکا بمبار طیارے خریدے تھے۔ امریکہ کو چین کا بھوت دکھا کر دُور مار توپیں لی تھیں اور امریکہ کے جنگی ماہرین سے مونٹین ڈویژن تیار کرائے تھے۔ ہمارے دشمن نے دس لاکھ فوجیوں کو چھ ستمبر ۱۹۶۵ء کے لیے ہی پالا پوسا تھا۔ امریکہ نے بھارتیوں کو اسلحہ بارُود کے وہ بند بکس بھی دے دیئے تھے جو پاکستان کی فوجی امداد کے لیے الگ رکھے ہُوتے تھے۔

پاکستان اور اسلام کے اس دشمن کو اپنی اس بے پناہ جنگی طاقت پر اس قدر ناز اور کامل یقین تھا کہ انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل چوہدری نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ نو بجے صبح تک لاہور پر قبضہ کر لے گا اور بارہ بجے لاہور میں جشنِ فتح منائے گا۔ اُس نے اپنے کمانڈروں سے کہا تھا کہ وہ انہیں لاہور جمخانہ میں وہسکی پلائے گا۔

اِدھر لاہور کے دفاع میں لڑنے والے ڈویژن کے کمانڈر نے "آرڈر آف دی ڈے" دیا ــ

"پاکستانیو! آخری سپاہی تک، آخری گولی تک لڑو، سنگینوں سے، خالی ہاتھوں سے، ناخنوں سے لڑو۔ اپنے وطن کا ایک انچ بھی دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو"۔

کفر کی اس یلغار کے سامنے بی۔ آر۔ بی نہر بڑی تمکنت سے بہہ رہی تھی۔ یہ پہلی بڑی نہر ہے جو پاکستانیوں نے کسی ملک کی مدد کے بغیر اور بغیر کسی مشینری کے اپنے ہاتھوں کھودی تھی۔ اس نہر میں پاکستانیوں کا اپنا پسینہ، اپنی کمائی اور اپنا جذبہ حُبّ الوطنی رواں دواں تھا۔ سکولوں کالجوں کے لڑکوں نے دفتروں کے چھوٹے بڑے افسروں، کلرکوں اور چپڑاسیوں نے، دکانداروں اور کسانوں نے، سکولوں کالجوں کے اساتذہ اور تانگہ بانوں نے مِل کر یہ نہر کھودی تھی اور اس پر بڑے ہی پکے پُل بنائے تھے۔ پاکستان کے ایک بہت بڑے خطّے کو جسے نہرو ریگستان بنانا چاہتا تھا، بی۔ آر۔ بی نے سبزہ زار بنا دیا تھا۔

آج اس کی روانی میں دشمن کی توپوں اور ٹینکوں کے گولے پھٹ رہے تھے اور ٹینک اس نہر کو پھلانگنے کے لیے پُلوں کی طرف دھاڑتے چلے آ رہے تھے۔ نہر کا پانی اُچھل اُچھل کر دشمن کے گولوں کو ٹھنڈا کرتا چلا جا رہا تھا اور پُلوں پر پاک فوج کے جیالوں نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ وہ نہر جو پاکستانیوں نے اپنا پسینہ بہا کر کھودی تھی۔ آج ان سے خون کے نذرانے مانگ رہی تھی۔ پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ ہری کھیتیوں میں سے گزرتی یہ نہر پاک فوج کے لیے اپنی بہن کی مانگ بن گئی تھی اور اس مانگ کی لاج رکھنے کے لیے پاک فوج کے پیادہ دستے دشمن کے ٹینکوں کے سامنے گوشت پوست کی بارودی سرنگیں بن گئے تھے۔

لاہور پر دشمن کے جن تین ڈویژنوں اور دو بریگیڈوں نے حملہ کیا تھا، ان کے کور کمانڈر نے اعلان کیا تھا —"ہم لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے ساٹھ سے اسّی فیصد نفری مروا دیں گے۔"

اِدھر پاکستانی سرفروش لاہور کو بچانے کے سَو فیصد مرنے کی قسم کھا کر لڑ رہے تھے۔

▼

لیفٹیننٹ اقبال بیدیاں سیکٹر میں ایسٹ بنگال رجمنٹ کی ایک بٹالین کے ساتھ تھا۔ وہ ابھی سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ اکیڈمی سے ٹریننگ ختم کر کے وہ ابھی ابھی آیا تھا۔ اس ٹریننگ نے اس کے جسم کو تو فوجی بنا دیا تھا لیکن ذہنی لحاظ سے وہ ابھی تک کالج کا آوارہ طالب علم تھا جس نے باپ کے روپے پیسے پر اوباش پن کے سوا کچھ سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا فوج میں بھرتی ہو جانا محض فرار تھا۔ وہ ٹریننگ کے دوران بھی اوباش اور کھلنڈرا رہا تھا۔ ان آرمڈ کمبیٹ (بے ہتھیار لڑائی) اور بیونٹ فائٹنگ (سنگین بازی) کا انسٹرکٹر اُسے اکثر کہا کرتا تھا —"مسٹر! سپاہی گیری تمھارے بس کی بات نہیں۔ یہیں سے گھر چلے جاؤ اور کسی سینما میں گیٹ کیپری کر لو۔ تنخواہ بھی مل جایا کرے گی اور دن میں تین شو مفت دیکھ لیا کرو گے .... تمہیں نہ اپنے جسم پر کنٹرول ہے نہ دماغ پر اور چلے آئے ہو لفٹین بننے۔ تم تو چار لانگریوں کی بھی کمانڈ نہ کر سکو گے۔ کہیں جنگ میں جانا پڑا تو دشمن کے پہلے ہی شیل کے دھماکے سے اپنا نام نمبر بھی بھول جاؤ گے۔"

اقبال اس طرح کی لعن طعن اور ڈانٹ ڈپٹ خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا کرتا تھا۔ اُس نے پاس آؤٹ ہونے کا تہیّہ کر رکھا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ادھر سے نکالا گیا تو اور کیا کرے گا۔ وہ کسی جذبے سے فوج میں بھرتی نہیں ہُوا تھا۔ وہ گیا ہی لفٹین بننے تھا — اور وہ لفٹین بن کر ایسٹ بنگال رجمنٹ میں آ گیا۔ وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ کیا بنا، شہزادہ بن گیا۔ وہ فوجی کم اور افسر زیادہ تھا۔

پوری کی پوری بٹالین مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی تھی جس میں اقبال کے علاوہ تین چار اور افسر مغربی پاکستان کے رہنے والے تھے۔ مشرقی پاکستان کے چھوٹے چھوٹے، دُبلے دُبلے، سانولے سانولے اور بعض سیاہ کالے سپاہی اور عہدیدار وغیرہ اُسے سلیوٹ کیا کرتے تو اُس کی گردن مہاراجوں اور نوابوں کی طرح تن جایا کرتی تھی۔ وہ انہیں بنگال کے مچھیرے اور دھان اُگانے والے کسانوں سے بڑھ کر کوئی اہمیّت نہیں دیتا تھا۔

"یہ عجیب مذاق ہے" — اقبال نے اس بٹالین میں آتے ہی مغربی پاکستان کے ایک لیفٹیننٹ سے کہا تھا —"ندیوں اور جوہڑوں کے پانی میں پلنے والی مخلوق کو ہماری حکومت نے خاکی وردی میں لپیٹ کر مغربی پاکستان کی خشکی پر لا پھینکا ہے۔ وقت پڑا تو اس بٹالین کی حفاظت کے لیے ہمیں پنجاب رجمنٹ کی دو پلٹنیں ساتھ بھیجنی پڑیں گی۔"

"زبان بند رکھو یار!" — اس پنجابی لیفٹیننٹ نے اقبال سے کہا تھا —"ایسی بات پھر منہ سے نہ نکالنا۔ ہمارے ساتھ بنگالی افسر بھی ہیں۔ یہ بنگالی اگر تیرے پیچھے پڑ گئے تو قبر تک تمھاری جان نہیں چھوڑیں گے۔"

"لیکن انہیں لڑائے گا کون؟" — اقبال نے کہا۔ —"وہ وقت آیا تو یہ ہمیں بھی مروائیں گے۔"

اور وہ وقت آ گیا۔ آیا بھی ایسا اچانک کہ خود اقبال کو سنبھلنے کی مہلت نہ ملی حالانکہ آفیسرز میس میں

افسر یہی باتیں کرتے تھے کہ پاکستان نے کشمیر میں جو کمانڈو آپریشن شروع کیا ہے یہ دونوں ملکوں کی بڑی خونریز جنگ کا باعث بنے گا۔ یکم ستمبر کے روز جب اُس کی بٹالین کو آدھے گھنٹے کے نوٹس پر سرحد پر پہنچنے کا حکم ملا تھا تو بھی وہ اس طرح خوش و خرّم رہا تھا جیسے بٹالین پکنک پر جا رہی ہو۔

"لیفٹیننٹ اکرم!" — اقبال نے چند ہی روز پہلے اپنے ایک لیفٹیننٹ دوست سے کہا تھا —"اس ویک اینڈ پر وزیر آباد جاؤں گا۔ اپنی نوکرانی سے فلرٹ کرنے کو دل بیتاب ہو رہا ہے۔ کم بخت جتنی خوبصورت ہے اُتنی ہی اکھڑ ہے" — اور اُس نے اس لیفٹیننٹ کو ہاجرہ کے حسن و شباب کی ایسی تفصیلات سنائی تھیں کہ اس کا دوست تڑپ اُٹھا تھا۔

"پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو اقبال!" — لیفٹیننٹ اکرم نے اُسے کہا تھا —"نوکرانی ہی ہے نا! تمھاری خالہ تو نہیں۔ کار کا بندوبست میں کر لوں گا۔"

دونوں نے ہاجرہ کو کسی نہ کسی بہانے ہفتے کی شام کو لاہور لانے کا پروگرام طے کر لیا اور ایک ہوٹل بھی منتخب کر لیا تھا لیکن چھمب جوڑیاں کی طرف پیشقدمی شروع ہوتے ہی اُس فوج کا جو بیرکوں میں تھی، بیرکوں سے تھوڑی سی دیر کے لیے بھی غیر حاضر ہونا بند کر دیا گیا تھا۔

▼

بلیک آؤٹ کی تاریکی بہت گہری تھی۔ شام کے کھانے کے بعد اقبال کے باپ نے ہاجرہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔ دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ چڑھا ہُوا تھا۔ پھر بھی اقبال کے باپ نے بلب نہ جلایا۔ اُس نے ایک موم بتی جلا کر کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔

"بیٹھو ہاجرہ!" — اقبال کے باپ نے ہاجرہ کو چارپائی پر بٹھا کر مشفقانہ لہجے میں کہا —"ہم نے تمہیں کبھی نوکرانی نہیں سمجھا۔ تم ہماری عزّت ہو اور اس گھر کی عزّت تمھاری عزّت ہے" — وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور اُس نے سر جھکا لیا۔ ہاجرہ اُس کے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اقبال کے باپ نے سر اُٹھا کر ہاجرہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"صاحب جی!" — ہاجرہ نے مسکین سے لہجے میں پوچھا —"مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

"ہاں ہاجرہ!" — اقبال کے باپ نے کہا —"میں حیران ہوں کہ تم جیسی شریف لڑکی ایسی غلطی کیوں کر رہی ہے۔"

"مجھے بتاؤ نا صاحب جی!" — ہاجرہ کے لہجے میں ایسا انکسار تھا جیسے وہ ابھی رو پڑے گی۔

"وہ جو اُس محلّے میں ایک جوان سا مولوی رہتا ہے" — اقبال کے باپ نے پوچھا —"اُس کے ساتھ تمھارا کیا تعلق ہے؟ .... میں نے سنا ہے تم اُس کے پاس جاتی ہو۔"

"ہاں صاحب جی!" — ہاجرہ نے اب ذرا جرأت سے جواب دیا —"میں وہاں سے گزرتے کبھی کبھی اُس کے پاس بیٹھ جاتی ہُوں .... بس یہی اُس کے ساتھ تعلق ہے۔"

"یہ تو ٹھیک نہیں ہاجرہ بیٹی!" — اقبال کے باپ نے کہا —"لوگ شک کرتے ہیں۔"

"وہ بھی یہی کہتا ہے" — ہاجرہ نے معصوم سے لہجے میں کہا —"اُس کا نام آپ کو پتہ ہو گا، افضال ہے۔ میں جب اُس کے کمرے میں جاتی ہوں تو وہ میرے ساتھ بڑی اچھی باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمھارا

یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔"

"لوگ باتیں بنا چکے ہیں"— اقبال کے باپ نے کہا — "مجھے آج ایک آدمی نے کہا ہے کہ آپ کی نوکرانی اُس آدمی کے پاس جاتی ہے.... تم جانتی ہو ہمارا گھرانہ کتنا شریف اور نیک نام ہے۔ اپنے ساتھ تم ہمیں بھی بدنام کر رہی ہو.... اچھا یہ بتاؤ کہ اُس نے خود تمہیں بلایا تھا یا تم اپنے آپ ہی اُس کے کمرے میں چلی گئی تھیں؟"

ہاجرہ کے ساتھ گھر کے ہر فرد کا سلوک بڑا اچھا تھا لیکن اقبال کے باپ کا انداز تو بہت ہی پیارا تھا۔ ہاجرہ کو تو وہ اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے جب ہاجرہ اور اپنے خاندان کی رُسوائی کی بات کی تو ہاجرہ نے اپنی مخصوص معصومیّت سے بتا دیا کہ افضال کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات کس طرح ہُوئی تھی اور وہ کتنی مرتبہ اُس کے کمرے میں جا چکی ہے۔

"صاحب جی!"— ہاجرہ نے کہا — "وہ تو مولوی ہے۔ مذہب کا بہت پکّا ہے۔ میں اپنی آپ کو بتاؤں کہ میں جب اُس کے کمرے میں جاتی ہوں تو اُس وقت میں اپنے آپ کو جوان لڑکی نہیں سمجھتی .... آپ کہتے ہیں کہ یہ بُری بات ہے تو میں اُس کے پاس نہیں جایا کروں گی۔ اُس راستے سے گزرنا ہی چھوڑ دوں گی لیکن یہ بات ضرور کہوں گی کہ جو باتیں لوگ کرتے ہیں وہ میں نے کبھی سوچی ہی نہیں۔"

ہاجرہ کے [illegible] میں آئی کہ وہ اقبال کے باپ سے یہ بھی کہہ دے کہ اپنے بیٹے اقبال سے پوچھیں کہ میرا ایمان اور چال چلن کیسا ہے، لیکن وہ اس ڈر سے یہ بات نہ کہہ سکی کہ اقبال کا باپ نہیں مانے گا، اُلٹا اُسی کی بے عزّتی کر دے گا۔



اقبال کا باپ ہاجرہ کو پیار سے سمجھانا چاہتا تھا کہ جسے وہ غلطی نہیں سمجھتی وہ بہت بڑی غلطی ہے لیکن اُس کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ اقبال کی ماں اور اُس کی دونوں بہنیں کمرے میں اس طرح آئیں جس طرح بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا۔

"اسے آپ کے لاڈ نے خراب کیا ہے"— اقبال کی ماں نے اقبال کے باپ سے غصیلی آواز میں کہا — "اسے اپنے پاس کیوں بٹھا رکھا ہے؟"

"ذرا آرام سے بات کرو"— اقبال کے باپ نے کہا — "میں اس سے وہی بات پوچھ رہا ہوں۔"

"پوچھنے سے کیا ہوتا ہے؟"— اقبال کی ماں نے کہا — "یہ اپنے کرتوت مانے گی تھوڑا ہی۔ اس کے سر پر آپ دو جوتے کیوں نہیں مارتے۔ یہ تو یہی کہے گی کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔"

"بھولی بھالی صورت دیکھو"— اقبال کی بڑی بہن شمع نے کہا — "اور کرتوت دیکھو۔ رُسوا اور بدنام کرنے کو اسے ہمارا ہی گھر ملا تھا!"

"بے ہودہ باتیں مت کرو شمع!"— اقبال کے باپ نے کہا — "اس شخص کو میں جانتا ہوں۔ وہ مذہب پرست انسان ہے اور محلّے کے بچّوں کو قرآن مجید پڑھاتا ہے۔"

"ہم نے ایسے کئی مولوی دیکھے ہیں"— اقبال کی ماں نے کہا — "وہ اسے پیسے دیتا ہو گا۔ وہ جوان بھی ہے اور اکیلا بھی رہتا ہے۔"

"سن ری ہاجو!"— شمع نے کہا — "اب پتہ چلا کہ تو اُس راستے سے گزری بھی ہے تو چُٹیا سے

پکڑ کر گھر سے باہر نکال پھینکوں گی.... ابّا جان! آپ اس کے ساتھ لاڈ پیار چھوڑ دیں۔ مجھے تو ڈر ہے یہ کوئی اور گُل نہ کھلا بیٹھے۔"

"اللہ کی قسم بی بی جی!"— ہاجرہ نے روتے ہُوئے کہا — "مجھے آپ کے گھر کی عزّت کا خیال ہے یا نہیں، مجھے اپنی عزت کا پورا پورا خیال ہے۔"

"پھر اُس مسٹنڈے کے پاس کیا لینے جاتی ہے تُو؟"

"تُو نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہم نے تجھے اپنی بیٹی بنا کے رکھا ہُوا ہے"— اقبال کی ماں نے ہاجرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور سر کو زور زور سے ہلا کر کہا — "اور تُو ہے کہ ہماری عزّت خاک میں مِلا رہی ہے"— اقبال کی ماں اپنے خاوند سے مخاطب ہو کر بولی — "اس جیسی لڑکیوں کا کیا ہے! جس نے چار پیسے ہاتھ میں دے دیئے اُسی کا دل خوش کرنے بیٹھ گئیں۔ گھر گھر نوکری کرنے والیوں کی عزّت ہوتی ہی کہاں ہے۔"

ہاجرہ نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر بڑی زور سے مارے اور سر کو ہاتھوں میں تھام کر سر جھکا لیا۔ وہ اتنی روئی کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ ایک بار پھر اُس کے ذہن میں اقبال آیا لیکن اُس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اقبال کے باپ کو تو بولنے کی مہلت ہی نہیں مِل رہی تھی۔ وہ بولنے لگتا تھا تو اس کی بیوی یا اُس کی دونوں بیٹیاں اکٹھی بول پڑتی تھیں۔

"ہاجرہ بیٹی!"— اقبال کے باپ نے بڑی مشکل سے بات کرنے کا موقع نکالا اور بولا — "قسم کھاؤ کہ تم آئندہ اُس شخص کے ہاں نہیں جاؤ گی۔"

"نہیں جاؤں گی صاحب جی!"— ہاجرہ نے سسکتے ہُوئے کہا — "لیکن قسم نہیں کھاؤں گی۔ میں خدا سے کہوں گی کہ تُو اگر میرا خدا ہے تو انصاف کر۔"



اگلی شام ہی اقبال کی بڑی بہن شمع شام کے کھانے کے بعد کسی سہیلی کا نام لے کر ماں سے کہنے لگی کہ اُس نے آج بلایا تھا۔ کہتی تھی کہ دوسری لڑکیاں بھی آئیں گی اور تم بھی آ جانا۔

"رات کا وقت ہے بیٹی!"— ماں نے کہا — "ہر طرف اندھیرا ہے۔ گلیاں سنسان ہیں۔ اس وقت نہ جاؤ۔"

"میں بہت جلدی آ جاؤں گی امّی!"— شمع نے بچّوں کی سی ضد کرتے ہوئے کہا — "وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

شمع ماں کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتی باہر نکل گئی۔ اس سہیلی کا گھر دُور نہیں تھا۔ ماں کو ڈر تھا کہ لڑکی کنواری ہے اور ابھی اس کا بچپنا گیا نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکیوں کے ساتھ باہر نکل جائے۔

شمع کو گئے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اس کی ماں نے ہاجرہ سے کہا کہ وہ اُسے سہیلی کے گھر سے بلا لائے۔ ہاجرہ شمع کی اس سہیلی کو جانتی تھی۔ وہ چلی گئی اور یہ جواب لائی کہ شمع کی سہیلی گھر میں ہے لیکن شمع وہاں نہیں تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ شمع ادھر آئی ہی نہیں۔ ماں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"اپنے باپ کو ابھی پتہ نہ چلنے دینا کہ شمع باہر نکل گئی ہے"— اقبال کی ماں نے اپنی چھوٹی لڑکی اور ہاجرہ سے کہا — "میں خود جا کر دیکھتی ہُوں۔ وہ شیخوں کی بیٹی کے ہاں چلی گئی ہو گی۔"

ماں باہر چلی گئی اور آدھے پونے گھنٹے بعد اس حالت میں واپس آئی کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی اور اس کا سر چکرا رہا تھا۔ شمع کو گئے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ شمع کی شادی ہونے والی تھی۔ ماں کے دل میں اس قسم کے وسوسے آئے کہ وہ کسی کے ساتھ چلی ہی نہ گئی ہو۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ تاریک فضا میں دو تین طیاروں کا گونجدار زنّاٹہ سنائی دیا۔ یہ پاک فضائیہ کے بمبار طیارے تھے جو رات کے وقت دشمن کے کسی ٹھکانے پر بمباری کے لیے بہت کم بلندی پر اُڑتے جا رہے تھے۔ ان کی آواز بڑی ہی خوفناک تھی۔ اقبال کی ماں اپنے خاوند کے پاس دوڑی گئی اور اُسے بتایا کہ شمع باہر نکل گئی تھی۔ تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ ابھی تک واپس نہیں آئی نہ ہی وہ کسی سہیلی کے گھر گئی ہے۔ باپ اچھل کر اٹھا۔

"اُسے ڈھونڈنے کہاں جاؤں؟" — اقبال کے باپ نے کہا — "تھوڑی دیر اور دیکھ لو۔ اگر نہ آئی تو میں تھانے جا کر پولیس کو اطلاع کروں گا۔... تم نے اُسے اس وقت جانے ہی کیوں دیا تھا؟"

"بس ضد کر کے نکل گئی" — اقبال کی ماں نے جواب دیا۔

پھر سب پر سنّاٹا طاری ہو گیا۔

اس سنّاٹے میں دستک سنائی دی۔ ماں اس خیال سے دروازہ کھولنے کے لیے دوڑی گئی کہ شمع آگئی ہے لیکن وہ ایک پولیس کانسٹیبل تھا۔ اُس نے اقبال کی ماں سے کہا کہ کسی مرد کو باہر بھیجو۔

اقبال کا باپ گیا۔ کانسٹیبل نے اُس سے اس کا نام پوچھا۔

"کیا شمع آپ کی بیٹی ہے؟" — کانسٹیبل نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" — اقبال کے باپ نے پوچھا — "شمع میری بیٹی ہے.... کہاں ہے وہ؟"

"تھانے میں" — کانسٹیبل نے جواب دیا — "آپ میرے ساتھ چلیں اور اُسے شناخت کریں۔"

"وہ تھانے میں کس طرح پہنچ گئی ہے؟" — اقبال کے باپ نے پوچھا — "وہ ٹھیک تو ہے؟"

"جی ہاں" — کانسٹیبل نے جواب دیا — "وہ بالکل ٹھیک ہے بلکہ ہماری اور آپ کی نسبت زیادہ ٹھیک ہے۔ آپ تھانے چلیں۔"

"وہ تھانے کس طرح پہنچ گئی ہے؟" — اقبال کی ماں نے پوچھا۔

"پولیس کی گشت نے اُسے ریلوے لائن سے پکڑا ہے" — کانسٹیبل نے جواب دیا — "اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ وہ بھاگ گئے۔ اس لڑکی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑی گئی۔ پولیس کو فوج کی طرف سے بڑا سخت حکم ملا ہے کہ ریلوے لائن اور ریلوے سٹیشن پر ہر وقت نظر رکھو کیونکہ اس علاقے میں سابوتاژ کا بہت خطرہ ہے۔ ہمیں بڑا پکا شک ہے کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ جو آدمی تھے وہ دشمن کے تخریب کار یا جاسوس تھے۔ اگر آپ کی بیٹی اَن پڑھ ہوتی تو ہم اسے فوراً چھوڑ دیتے۔ وہ کالج میں پڑھی ہوئی لڑکی ہے۔ اُسے ہم اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ کو تھانے میں لڑکی کی صرف شناخت کے لیے بلایا گیا ہے۔"

شمع کی ماں اور بہن نے رونا شروع کر دیا۔ شمع کا باپ کانسٹیبل کے ساتھ چل پڑا۔

جس وقت سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کا باپ چوہدری کرامت پولیس کانسٹیبل کے ساتھ اپنی بیٹی شمع

کو لینے کے لیے تھانے جا رہا تھا اُس وقت اُس کا بیٹا اقبال بیدیاں سیکٹر میں نہر کے کنارے اپنی پلاٹون کے ساتھ پوزیشن میں تھا۔ اُس کی پلاٹون نے ابھی ایک بھی راؤنڈ فائر نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس پلاٹون کے سامنے دشمن ابھی واضح طور پر نہیں آیا تھا یعنی اس پلاٹون کو اپنا ٹارگیٹ ابھی پوری طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس پلاٹون کی خاموشی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اُن کا پلاٹون کمانڈر سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال خاموش تھا۔ وہ خاموش تو تھا لیکن بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اس کی بھاگ دوڑ اپنی پلاٹون کی پوزیشنوں تک محدود تھی۔ اُس کا وائرلیس آپریٹر اُس کے ساتھ ساتھ بھاگ دوڑ رہا تھا۔ وہ اپنے کمپنی کمانڈر کا پیغام سنتا اور اقبال کو سنا دیتا تھا۔ ہر پیغام اقبال کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں اضافہ کرتا تھا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کی پلاٹون کا نائب صوبیدار بدر الحق کچھ دیر اس کے ساتھ رہا تھا اور اُس کا منہ دیکھتا رہا تھا۔ وہ آخر اپنی پلاٹون کے پاس چلا گیا اور اُس نے پلاٹون حوالدار سے کہا تھا کہ یہ پنجابی چھوکرا پلاٹون کو مروا دے گا۔

"فکر نہیں صاحب!" — بنگالی حوالدار نے نائب صوبیدار بدر الحق سے بنگالی زبان میں کہا — "ہم اس چھوکرے کے حکم کا انتظار نہیں کریں گے۔ پنجاب کا ڈیفنس ہماری ذمہ داری ہے ہم یہ نہیں کہلوانا چاہتے کہ بنگالیوں نے پنجاب کا ڈیفنس نہیں کیا تھا.... ہماری نظر دشمن پر ہے صاحب! دشمن ابھی سامنے نہیں آ رہا۔"

"کیسے آئے گا!" — نائب صوبیدار بدر الحق نے کہا — "ابھی ہماری تین پوسٹیں نہر کے آگے ہیں۔ وہ دشمن کو نہر تک نہیں آنے دیں گے۔"

انڈین آرمی نے ایک حملہ واہگہ سیکٹر پر کیا تھا، دوسرا قصور سیکٹر پر اور اُس کا تیسرا حملہ بیدیاں سیکٹر پر تھا۔ بیدیاں لاہور اور قصور سیکٹر کا جنکشن پوائنٹ تھا۔ وہاں بی۔ آر۔ بی پر ایک سائفن تھا۔ دشمن نے بیدیاں کی طرف پیش قدمی کر کے توپ خانے کی بے تحاشہ گولا باری کی تھی جو ابھی تک وقفے وقفے سے جاری تھی۔ لاہور اور قصور کے دفاع میں لڑنے والے دونوں ڈویژن کمانڈروں نے چھ ستمبر کی شام تک محسوس کر لیا تھا کہ بیدیاں پر دشمن نے جو حملہ کیا ہے یہ دراصل دھوکہ ہے۔ اُس کا اصل ٹارگیٹ واہگہ تھا جہاں وہ اپنا پورا دباؤ ڈال کر اُس سیکٹر کا دفاع توڑنا چاہتا تھا۔

دشمن کے دباؤ کا دوسرا سیکٹر قصور کا تھا۔ دشمن یہ دھوکہ دے کر کہ وہ بیدیاں سائفن سے لاہور کی طرف نکلنا چاہتا ہے، قصور اور لاہور کے دفاع میں لڑنے والوں کو بیدیاں سیکٹر میں اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسے امید تھی کہ پاک فوج کے یہ ٹروپس بیدیاں سیکٹر میں اکٹھے ہو جائیں گے تو وہ واہگہ سیکٹر سے آسانی سے لاہور میں داخل ہو جائے گا۔ ہمارے ڈویژن کمانڈر اس دھوکے کو بھانپ گئے۔ انہوں نے لاہور اور قصور سے توجہ نہ ہٹائی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ بیدیاں سائفن کے آگے سرحد کی طرف زمین ٹینکوں کے قابل نہیں۔ اس علاقے میں دلدل جگہ جگہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ٹینک بوگ ڈاؤن کرانے کے لیے بیدیاں سائفن کی طرف لے آتے۔ اس کے باوجود بیدیاں کے دفاع میں کوئی کسر رہنے نہیں دی گئی تھی۔

بیدیاں سائفن کے دفاع کے لیے جو نفری مورچہ بند تھی وہ بہت تھوڑی تھی۔ بیشک یہ دھوکہ ہی تھا لیکن دشمن بیدیاں کے لیے دو ڈویژن لایا تھا جنہیں ٹینک رجمنٹوں کی اور کم و بیش پانچ سو چھوٹی بڑی توپوں کی مدد حاصل تھی۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ سائفن کے دفاع میں مورچہ بند تھی۔ چھ ستمبر کا دن گزر گیا تھا رات گزرتی جارہی تھی۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کی پلاٹون نے ایک بھی راؤنڈ فائر نہیں کیا تھا جس سے دفاع میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ فرق نہ پڑنے کی وجہ یہ تھی کہ سائفن سے آگے یعنی سرحد اور بی۔آر۔بی کے درمیان اس ایسٹ بنگال رجمنٹ کی دو تین پوسٹیں تھیں۔

ایسٹ بنگال رجمنٹ میں تمام نفری بنگالیوں کی تھی۔ چند ایک افسر غیر بنگالی تھے۔ انہی بنگالیوں کے متعلق لیفٹیننٹ اقبال نے کہا تھا کہ مچھلی اور چاول کھانے والے یہ مچھیرے سوائے بھاگنے کے کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اقبال ہی نہیں، پاک فوج میں اکثر لوگوں کی رائے کچھ ایسی ہی تھی کہ بنگالی پنجابیوں اور پٹھانوں کے سے جوش و خروش سے نہیں لڑ سکیں گے۔ وہ دلیل یہ دیتے تھے کہ بنگالی لڑنے والے ہوتے تو انگریز ان کی رجمنٹیں ضرور بناتے۔ انگریزوں نے دوسری جنگ عظیم میں ایسے آدمیوں کو بھی بھرتی کر لیا تھا جو طبی لحاظ سے اگلے مورچوں میں لڑنے کے قابل نہیں تھے لیکن اُنہوں نے بنگالیوں کو انفنٹری اور ٹینک رجمنٹوں میں بھرتی نہیں کیا تھا۔ فوج میں جو بنگالی بھرتی کیے گئے تھے انہیں دفتروں میں یا سپلائی کور میں لگایا گیا تھا اس طرح بنگالی صرف ہیڈ کوارٹروں میں تھے

بنگالیوں کو پہلی بار پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد انفنٹری کے لیے بھرتی کیا گیا اور ان کی الگ رجمنٹ کھڑی کی گئی جس میں چار، پانچ پلٹنیں تھیں۔ اس رجمنٹ کو ایسٹ بنگال رجمنٹ کہا گیا۔ خالصتاً بنگالیوں کی یہ پلٹنیں قائدِ اعظم کے ذاتی حکم سے کھڑی کی گئی تھیں اور ان پلٹنوں کی رجمنٹ کو رجمنٹل کلر (پرچم) قائدِ اعظم نے اپنے ہاتھوں دیا تھا۔ اس موقع پر قائدِ اعظم نے کہا تھا کہ بنگالی پنجابیوں اور پٹھانوں کی طرح جنگجو ہیں اور یہ بھی اسلام کی اُنہی عسکری روایات کے امین ہیں جن کے پنجابی اور پٹھان ہیں۔ قائدِ اعظم نے کہا تھا کہ وقت آنے پر بنگالی ثابت کر دکھائیں گے کہ وہ پاکستان کے ہر مسلمان کی طرح مردِ مومن ہیں اور اتنی جرأت اور شجاعت رکھتے ہیں کہ اسلام کی درخشندہ روایات کو زندہ رکھیں۔

آگے چل کر ایسٹ بنگال رجمنٹ کو بنگال ٹائیگرز کہا گیا تھا۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ پاک فوج کی نظریں بنگال ٹائیگرز پر لگی ہوئی تھیں کہ وہ قائدِ اعظم کی توقعات پر کہاں تک پورے اُترتے ہیں۔



یہ پہلا موقع تھا کہ ایسٹ بنگال رجمنٹ کی اس بٹالین کو جس کی ایک پلاٹون کا کمانڈر سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال تھا، دشمن کے سامنے آنے کا موقع ملا۔ بنگالیوں کا مقابلہ ایک بریگیڈ سے تھا۔ ان پر ۶ ستمبر کی صبح سے اتنی شدید گولا باری ہو رہی تھی کہ اُس صبح کے سورج کو طلوع ہوتا وہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ اتنی شدید گولا باری کا مطلب ہوتا ہے کہ حملہ آ رہا ہے لیکن دن گزر گیا، رات بھی گزر گئی اور حملہ نہ آیا۔ یہی وہ دھوکہ تھا جسے پاک فوج بھانپ گئی تھی۔

گولوں کی باڑیں پاکستان کے بنگالیوں کے مورچوں کے پیچھے، دائیں، بائیں اور درمیان گر رہی تھیں۔ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ گولا باری مورچوں کو تباہ کر دے۔ اتنی زیادہ گولا باری کا یہی فائدہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ جن مورچوں پر کی جاتی ہے، وہاں مورچوں سے کوئی سر نہیں اٹھاتا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ مسلسل دھماکے

پہلے دماغ کو ماؤف کرتے ہیں، پھر دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ کان بند ہو جاتے ہیں اور کانوں میں سیٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ مورچوں میں بیٹھے ہوئے جوانوں پر موت کا خوف سوار ہو جاتا ہے۔ ذہن میں یہی ایک ڈراونا خیال رہتا ہے کہ ابھی ایک گولا سر پر آ پھٹے گا۔ گولا باری زیادہ دیر جاری رہے تو جوانوں کے مزاج میں غصہ اور چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے جو اُن کا اپنا خون جلانے لگتا ہے۔ اس سے آگے پاگل پن ہوتا ہے جسے شیل شاک کہتے ہیں۔ یہ اعصابی نظام ٹوٹ پھوٹ جانے سے ہوتا ہے۔

ایسٹ بنگال رجمنٹ کے جوان گولا باری کے ان ظالم اثرات میں سے گزر رہے تھے۔ اُن کے لیے یہ دنیا مسلسل دھماکے اور گرد و غبار بن گئی تھی۔ پھٹتے گولوں کے لال گرم ٹکڑوں اور ان کے اُڑائے ہوئے پتھروں کی چیخیں اور زنّاٹے بنگالیوں کے جذبے اور قوتِ برداشت کا بڑا ہی سخت امتحان لے رہے تھے۔ گرد و غبار میں بارُود کی جو بدبُو تھی، وہ متلی پیدا کر رہی تھی۔ دشمن ان کے اعصاب توڑ رہا تھا تاکہ اُس کی انفنٹری اور ٹینک حملہ کریں تو مزاحمت کرنے والے ہوش و حواس میں نہ ہوں۔ ہمارے دشمن کے پاس بے دردی سے پھونکنے کے لیے بے اندازہ گولا بارود تھا جو اُس نے اسی روز کے لیے اکٹھا کیا تھا۔

ایسٹ بنگال رجمنٹ کے مورچوں سے چار پانچ آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بلند ہوتی تھیں۔ یہ بنگالی زبان کی للکار تھی — "ہوش میں رہنا جوان.... دشمن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا" — یہ صوبیداروں اور نائب صوبیداروں کی للکار تھی جو مورچے میں دبکے ہوئے جوانوں کے حوصلے اور جذبے کو زندہ و بیدار رکھے ہوئے تھی۔

وہ دھماکوں، زنّاٹوں، چیخوں اور گرد و غبار کا طوفان تھا جس میں دبلے پتلے، سانولے سانولے بنگالی ثابت قدم رہنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے اُوپر سے عقب سے آنے والے اپنے توپ خانے کے گولے چیختے چنگھاڑتے گزر رہے تھے۔ یہ توپ خانوں کا معرکہ تھا لیکن اِس طرف توپ خانے کی صرف ایک فیلڈ رجمنٹ تھی اور اُدھر ڈویژن کا توپخانہ تھا۔ اس معرکے میں مشرقی پاکستان کے اُن جوانوں کے اعصاب جنہیں سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال نے مچھیرے کہا تھا، پس رہے تھے۔

"پاکستان" — مورچوں سے کسی نے نعرہ لگایا اور زمین کے اندر سے ایک گرجدار دھماکہ اُٹھا — "زندہ باد" — پھر "پاکستان زندہ باد" کے نعرے تھم نہ سکے، گرجتے ہی رہے۔ ان نعروں نے جذبے اور مورال کو بہت تقویت دی۔

بنگالی جوانوں نے تو اپنا جذبہ قائم رکھا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کا مورال کانپ رہا تھا۔ اُس کے پاس جذبہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ فاکس ہول کی طرز کے مورچے میں سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔ اُس نے اپنے وائرلیس آپریٹر کو اس طرح اپنے قریب بٹھا رکھا تھا کہ گولے کے ایک دو ٹکڑے اُس کے فاکس ہول میں آجائیں تو وائرلیس آپریٹر کو لگیں۔

"سر!" — وائرلیس آپریٹر نے اقبال سے کہا — "کمپنی ہیڈ کوارٹر رپورٹ مانگتا ہے"۔

"او کے بول دو" — اقبال نے آپریٹر سے کہا اور بڑبڑایا — "کیسی منحوس گھڑی تھی جب میں کالج سے بھاگ کر بھرتی دفتر جا پہنچا تھا"۔

آپریٹر اُس سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ کمپنی ہیڈ کوارٹر رپورٹ مانگتا ہے اور اُس نے ہر بار "او کے

بول دو" ایسے لہجے میں کہا تھا جیسے اُس کے سر کے ساتھ ریوالور کی نالی لگا کر اُس سے یہ الفاظ کہلوائے جا رہے ہوں۔ اُس کی پلاٹون کا تو سب اچھا تھا لیکن اپنے متعلق اُس کی رپورٹ کچھ اور تھی جو وہ اپنے کمپنی کمانڈر کو نہیں دے سکتا تھا۔

اُس نے اپنے فاکس ہول مورچے میں بیٹھے بیٹھے اُوپر دیکھا۔ گولا باری اچانک رُک گئی تھی۔ اُسے اپنا نائب صوبیدار بدرالحق مورچے پر کھڑا نظر آیا۔ اقبال نے بدرالحق کے چہرے کو بڑی غور سے دیکھا۔ اُسے اس چہرے پر خوف کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہ آئی بلکہ اس بنگالی نائب صوبیدار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اقبال جھینپ گیا۔

"آپ اتنی جلدی مورچے سے باہر کیوں آ گئے ہیں؟ ـــ لیفٹیننٹ اقبال نے کہا ـــ "شیلنگ پھر شروع ہو جائے گی"

اور شیلنگ پھر شروع ہو گئی۔ نائب صوبیدار بدرالحق وہیں کھڑا رہا۔

"آپ فوراً نیچے چلے جائیں" ـــ لیفٹیننٹ اقبال نے حکم کے لہجے میں کہا۔

"اقبال شاب! ـــ بدرالحق نے کہا ـــ "ایسا آرڈر ہم کو نہیں دیو۔ ہم نیچے جائے گا تو جوان اور نیچے چلا جائے گا اور پلاٹون کا مورال بھی نیچے چلا جائے گا..... ہم باہر سے نعرہ مارا چھے ـــ پاکستان ـــ جوان نعرہ مارا چھے ـــ زندہ باد ـــ کمپنی کا سب نائب صوبیدار اور صوبیدار لوگ باہر ہے"

"نیچے جاؤ" ـــ سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال نے اب کے بڑے افسروں کے لہجے میں سخت حکم دیا ـــ "آپ مارے گئے تو....."

"ہم مارا نہیں جائے گا شاب! ـــ بدرالحق نے کہا ـــ "ہم شہید ہو گا"



گولا باری پہلے کی طرح شدید تھی۔ اقبال نے سر نیچے کر لیا جیسے اُس کے جوانوں کے ہاتھوں کھودا ہوا یہ گڑھا اُسے موت سے بچائے گا۔ یہ گڑھا جسے کتابی زبان میں فاکس ہول کہتے تھے اُس کی قبر بھی بن سکتا تھا۔ امکان یہی نظر آ رہا تھا۔ بدرالحق اسی گڑھے میں اُتر گیا۔

"شاب! ـــ بدرالحق نے اقبال سے کہا ـــ "ہم آپ سے تھوڑا بات کرے گا"

"کیا بات کرے گا؟" ـــ لیفٹیننٹ اقبال نے کہا ـــ "معلوم ہوتا ہے آپ ابھی تک شاک میں ہیں۔ یہ جنگ ہے، ایکسرسائز نہیں ہے۔ آپ اس کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ آپ ڈر نہیں رہے اور آپ....." اقبال بدک کر چُپ ہو گیا کیونکہ قریب ہی دو تین گولے اکٹھے پھٹے تھے۔ اُن کی اُڑائی ہوئی مٹی اقبال کے مورچے میں گری تھی۔

"سر نیچے کرو بدرالحق صاحب!"

بدرالحق ہنس پڑا۔ اُس نے سر نیچے نہ کیا۔

"بولو، کیا بات کرنی ہے" ـــ اقبال نے کہا۔

"اقبال شاب!" ـــ نائب صوبیدار بدرالحق نے کہا ـــ "یہ پاکستان ہم نے بنایا۔ اوس ٹیم آپ ماں کا دودھ پیتا تھا۔ ہم اوس ٹیم شولہ شترہ شال کا تھا۔ آپ کالز میں ایڈمیشن لیا۔ ہم دش کلاش پڑھا۔ ہم ویشٹ بنگال کا رہنے والا تھا۔ اُدھر ہندو جیاستی تھا اور مسلمان بہت تھوڑا۔ ہم قائداعظم کے آرڈر سے نعرہ لگایا

کہ ہم پاکستان بنائے گا۔ اُدھر ہندو ہمارا دشمن، برٹش ہمارا دشمن۔ ہندوؤں نے ہم کو جبانی روکا۔ اوش نے بولا، کانگریش میں آؤ۔ ہم بولا، ہم مشلمان ہے۔ وہ کافر جیاستی تھا۔ اوش نے ہم پر بہت زیادہ جیاستی کیا"

نائب صوبیدار بدرالحق گولا باری کی قیامت میں، جس سے لیفٹیننٹ اقبال بدکتا اور ڈرتا تھا، بڑے اطمینان سے اقبال کو بتا رہا تھا کہ اس نے یہ پاکستان کس طرح حاصل کیا تھا۔ اقبال پر تو اس بنگالی نائب صوبیدار کا رُعب صرف اس وجہ سے ہی بیٹھ گیا تھا کہ وہ اتنی زیادہ گولا باری میں اتنے زیادہ اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔ بدرالحق ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہا تھا لیکن وہ اپنا مطلب واضح کر لیتا تھا

"اقبال صاحب! ـــ نائب صوبیدار بدرالحق اُسے اردو اور بنگالی ملا کر کہہ رہا تھا ـــ "پاکستان کی قدر و قیمت وہی جانتے ہیں جنہوں نے اس کے حصول کے لیے بے دریغ قربانیاں دی تھیں۔ یہ پودا جو آج تناور درخت بن چکا ہے، ہم نے اپنی نوجوانی میں اپنے ہاتھوں لگایا اور اسے اپنے اور اپنے بچوں کے خون سے سینچا تھا۔ میں آپ کو چھوٹا سا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ مغربی بنگال میں ہندو چونکہ اکثریت میں تھے اس لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو طرح طرح کے لالچ دیتے تھے کہ وہ کانگریس کی حمایت کریں اور دوسری طرف وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے۔ انہیں قتل کرتے اور اُن کے گھروں کو آگ لگا دیتے تھے۔ انگریز اُن کے ساتھ تھا۔ حکومت اُن کے ساتھ تھی۔ انگریز کی پولیس انہی کا ساتھ دیتی تھی۔ مارے جاتے تو مسلمان۔ بلوے اور دنگا فساد میں گرفتار ہوتے تو مسلمان۔ لیکن مسلمان اپنے اس مطالبے اور اس نعرے سے دست بردار نہیں ہوتے تھے کہ ہم پاکستان بنا کے رہیں گے"

دشمن نے گولا باری ایک بار پھر روک دی۔ اقبال بدرالحق کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے کچھ اس قسم کا شک ہونے لگا کہ اُس کے نائب صوبیدار کا دماغ گولا باری سے شاید بیکار ہو گیا ہے۔ اُس کی نظر میں یہ پاگل پن ہی تھا کہ سر پر دشمن کے گولے پھٹ رہے تھے اور یہ نائب صوبیدار اس طرح کہانی سُنا رہا تھا جیسے وہ پارک میں بیٹھا ہوا ہو۔

"اقبال صاحب!" ـــ نائب صوبیدار بدرالحق کہہ رہا تھا ـــ "آپ میرے افسر ہیں۔ اگر آپ اسے گستاخی سمجھیں تو مجھے معاف کر دینا لیکن میں نے جو باتیں فارورڈ ایریا میں آنے سے پہلے اپنے جوانوں سے کی تھیں وہ میں آپ کے ساتھ بھی کروں گا"

"نائب صاحب!" ـــ لیفٹیننٹ اقبال نے کمانڈروں کے لہجے میں کہا ـــ "باہر جا کر پلاٹون کو چیک کرو اور رپورٹ دو..... آپ نے اس طرح باتیں شروع کر دی ہیں جیسے ہم یہاں میلے پر آئے ہوئے ہیں۔ جا کر دیکھیں۔ اگر کوئی جوان زخمی یا شہید نہیں ہوا تو جوان ڈرے ہوئے ضرور ہوں گے۔ اُن کا حوصلہ مضبوط کریں"

"میں آپ کو یہیں رپورٹ دے دیتا ہوں" ـــ نائب صوبیدار بدرالحق نے کہا ـــ "ایسٹ بنگال رجمنٹ کا کوئی جوان ڈرا ہوا نہیں ملے گا..... آپ میرے کمانڈر ہیں لیکن اس وقت میں آپ کو اپنا بچہ سمجھتا ہوں۔ میں کل صبح سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ ڈرے ہوئے ہیں۔ میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں کیونکہ میں فوجی ڈسپلن کے خلاف بات کر رہا ہوں لیکن اقبال صاحب! یہ چھاؤنی نہیں اور یہ

پر بیڈ گراؤنڈ نہیں ۔ یہ فیلڈ ہے اور دشمن پوری طاقت سے ہمارے سر پر چڑھا آرہا ہے ۔"

سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال نے نائب صوبیدار بدرالحق کے مُنہ کی طرف دیکھا اور اُس پر ایسا تاثر طاری ہوگیا جیسے بدرالحق اُس کا باپ ہو اور وہ اُسے ہر خطرے سے بچا لے گا ۔

" اقبال صاحب !" — بدرالحق نے کہا — " خوف کو دل پر نہ بیٹھنے دیں ۔ خوف ایسی چیز ہے جو دماغ کو بھی بیکار کرتی ہے اور جسم کو بھی ۔ آدمی اپنے آپ کو کمزور سمجھنے لگتا ہے ۔ میں آپ کو ایک واقعہ سنانے لگا تھا ..... ۱۹۴۶ء ۔ ۴۷ میں ایک طرف کانگریسی ہندوؤں کے جلوس نکلتے تھے ، دوسری طرف مسلم لیگ کے مسلمانوں کے ۔ کوئی ہتھیار اپنے پاس رکھنا جرم تھا ۔ چھوٹا سا چاقو بھی پاس رکھ کر کوئی باہر نہیں نکل سکتا تھا ۔ ہندوؤں نے اعلان کیا کہ مسلمانوں نے اب جلوس نکالا تو ہندو اُن پر حملہ کریں گے ۔ مسلمانوں نے بہت بڑا جلوس نکالا ۔ جلوس میں جتنے نوجوان تھے یا طلباء تھے اُن سب نے مسلم لیگ کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے اُٹھا رکھے تھے جو بانسوں کے ساتھ لگے ہوتے تھے ۔ جھنڈا اٹھانا ممنوع نہیں تھا .....

" ہندوؤں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے پاس ہتھیار تو کوئی ہو نہیں سکتا اس لئے وہ ہندوؤں کا بڑا آسان شکار ہوں گے ۔ پولیس ہندوؤں کا ساتھ دیتی تھی ۔ مسلمانوں کا جلوس جب ہندو آبادی میں سے گذر رہا تھا تو ہندوؤں نے ڈنڈوں ، خنجروں اور چاقوؤں سے مسلح ہو کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا ۔ مسلمانوں کے جلوس میں جو ڈیڑھ دو ہزار نوجوان اور طلباء تھے وہ ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد ہندو زخمی ہو کر بھاگ گئے اور بہت سے اتنے شدید زخمی ہوئے کہ وہ گر پڑے ۔ مسلمان نہتے نہیں تھے ۔ اُن کے پاس جھنڈیوں اور جھنڈوں والے جو بانس تھے وہ دراصل برچھیاں تھیں ۔ بانسوں کے جو سرے جھنڈوں میں چھپے ہوتے تھے انہیں نوجوانوں نے تراش کر برچھیوں کی اَنیوں کی طرح بنا رکھا تھا ۔ میں بھی اُس جلوس میں شامل تھا ۔ میں بھی ایسے ہی ایک بانس سے مسلح تھا جس پر سبز جھنڈے کا پردہ پڑا ہُوا تھا اور جو اندر سے برچھی کی طرح نوکدار تھا ۔ کئی ہندو مر گئے تھے ....

" اقبال صاحب ! میں نے آپ کو یہ بات اس لئے سنائی ہے کہ آپ سمجھ جائیں کہ جو ڈر گیا وہ مارا گیا ۔ اگر ہم یا ہمارے لیڈر ہندوؤں سے ڈر جاتے تو آج ہم آزاد پاکستانی نہ ہوتے بلکہ ہندوؤں کے غلام ہوتے ۔ نہ آپ لفٹیننٹ ہوتے نہ میں نائب صوبیدار ہوتا ..... ہم نے پاکستان بنا تو لیا لیکن ہندوؤں نے مغربی بنگال میں ہم سے ظالموں کی طرح انتقام لیا ۔ کلکتہ کی گلیاں اور سڑکیں مسلمانوں کی لاشوں سے بھر گئی تھیں ۔ اُس وقت ہم نہتے تھے ۔ آج ہمارے پاس رائفلیں ہیں ، مارٹر گنیں ہیں ، توپیں ہیں ، ٹینک اور طیارے ہیں ۔ ہمارا سب سے زیادہ مضبوط ہتھیار ہمارا جذبہ ہے ۔ انڈیا والے اسے مورال کہتے ہیں ، لیکن ہم اسے جذبۂ ایمان کہتے ہیں ۔ آج ہندو نے ہمیں پھر للکارا ہے " —— نائب صوبیدار بدرالحق بولتے بولتے چپ ہو گیا ۔ اُسے ہچکی سی آئی ۔ اُس پر رقت طاری ہو گئی تھی ۔ اُس نے جذباتی سے لہجے میں کہا — " جس ہندو سے ہم کبھی نہیں ڈرے تھے اُس سے ہم آج بھی نہیں ڈریں گے ۔ اُس کی پوری بٹالین کا مقابلہ صرف ہماری پلاٹون کرے گی " — بدرالحق نے اقبال کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیمی سی آواز میں بولا — " مت ڈریں صاحب ! ہم آپ کے ساتھ ہیں ۔ آپ ساری عمر یاد رکھیں گے کہ بنگالیوں نے پنجاب کو کس طرح بچایا تھا ۔ ہمیں ٹائیگر کہتے ہیں ۔ ہم ثابت کر دیں گے کہ ہم ٹائیگر ہیں ۔"



اُس وقت تک ایسٹ بنگال رجمنٹ ثابت کر چکی تھی کہ یہ واقعی ٹائیگر بٹالین ہے ۔ بنگالیوں کی اس بٹالین کی ایک کمپنی تین الگ الگ پوسٹوں کی صورت میں نہر کے سرحد والے کنارے سے آگے مورچہ بند تھی ۔ دشمن نے چھ ستمبر کی صبح سے ہی ان تینوں پوزیشنوں پر حملے شروع کر دیئے تھے ۔ جن پوزیشنوں میں تیس چالیس جوان تھے اُن پر دشمن نے پوری پوری بٹالین سے حملے کئے ۔ بنگالیوں نے ہمت نہ ہاری ۔ دماغ کو حاضر رکھ کر اُنہوں نے دشمن کو نہر اور سائفن سے دُور رکھا ۔ دشمن ان پوسٹوں کو کچلنے کے لیے ٹینک بھی لایا ، لیکن پاکستان کے ان بنگالیوں نے ٹینکوں کو بھی روک لیا ۔ اُن کے پاس ٹینک شکن گنیں (آر آر) بہت تھوڑی تھیں ، لیکن اُنہوں نے انہی سے دشمن کا آہنی غرور توڑ دیا ۔

ان اگلی پوزیشنوں میں لڑنے والے پورے جذبے سے لڑ رہے تھے ، لیکن اُن کی معرکہ آرائی انسانی استعداد کی سطح سے بلند تھی ۔ اُنہیں پیچھے آ جانے کا حکم دیا گیا ۔ پیچھے ہٹنا بھی آسان نہیں تھا کیونکہ دشمن سر پر آیا ہُوا تھا ۔ فضا میں گولیاں اُڑ رہی تھیں ۔ ٹینکوں کے گولے پھٹ رہے تھے ۔ اس آگ میں سے زندہ نکل کر آنا ممکن نہ تھا ۔ انہیں پیچھے ہٹانے کی ضرورت یہ تھی کہ ڈیفنس کو ایک جگہ اکٹھا کرنا تھا ۔ ان میں سے دو پلاٹونیں اپنی پوزیشن سے نکل آئیں ۔ دشمن نے انہیں کچلنے کے لیے ٹینک دوڑا دیئے لیکن ان جوانوں نے موریچوں کے بغیر جم کر مقابلہ کیا ۔ پیچھے بھی ہٹتے آتے اور دشمن کو بھی روکے رکھا ۔

تیسری پوسٹ میں بارہ چودہ جوان تھے جن کا کمانڈر ایک حوالدار تھا ۔ یہ حوالدار اپنی پوسٹ چھوڑنے کی بجائے دشمن پر کارگر فائر کراتا رہا تاکہ دوسری پلاٹونیں آسانی سے پیچھے چلی جائیں ۔ اس کے بعد اس حوالدار نے اپنی پوسٹ چھوڑ کر پیچھے آنے سے انکار کر دیا ۔ اُس نے اُس وقت بھی پوسٹ نہ چھوڑی جب اُس کے جوانوں میں صرف تین زندہ رہ گئے تھے ۔ وہ مسلسل لڑتا رہا ۔ سائفن کو دشمن سے بچانے کے لیے اور سائفن کا راستہ بند رکھنے کے لیے صرف یہ حوالدار اپنے تین جوانوں کے ساتھ موجود تھا اور وہیں رہا ۔ اُسے پیچھے آنے کا حکم تو مل گیا تھا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کی ذمہ داری کس قدر نازک ہے ۔ اُس نے یہاں تک کیا کہ اپنی بٹالین کی مارٹر پلاٹون کو فائر آرڈر دے کر دشمن پر مارٹر گنوں کی گولہ باری کراتا رہا ۔ اس طرح ان چار بنگالیوں نے دشمن کو سائفن کے قریب نہ آنے دیا ۔ اُسے جب کمپنی کمانڈر کی طرف سے پیچھے آنے کا حکم ملتا تھا تو وہ ایک ہی جواب دیتا تھا کہ وہ پیچھے آ گیا تو دشمن آگے آ جائے گا ۔



جنگِ ستمبر عجیب جنگ تھی ۔ مسلمانوں کے لیے یہ عجیب نہیں ہونی چاہیئے تھی کیونکہ عسکری جذبہ جو مسلمان کے لہو میں صدیوں سے رواں دواں چلا آ رہا ہے ، وہ اسے ہر لمحہ جہاد کے لیے تیار رکھتا ہے ۔ یہی جذبہ تھا جس نے جنگِ ستمبر میں شجاعت اور حب الوطنی کے ایسے مظاہرے کرائے کہ دنیا دنگ رہ گئی ۔ اقوام عالم ، خصوصاً وہ اقوام جو ہندوستانیوں کی ہمنوا تھیں اور جو ہندوستانیوں کے حق میں بہتر سمجھتی تھیں کہ پاکستان کا خاتمہ ہو ، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ پاکستانی اس بے جگری سے اپنے وطن کا دفاع کریں گے کہ ایک پاکستانی دس ہندوؤں کا مقابلہ کرے گا ۔ جنگی مبصّر بھی حیران رہ گئے تھے ۔

حقیقت یہ ہے کہ خود پاکستانی حیران رہ گئے تھے کہ اُنہوں نے کیا کر دکھایا ہے ۔ وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے اقتدار پرست سیاسی لیڈروں نے اور اقتدار میں آنے والے نت نئے حکمرانوں نے

قوم کو قوم رہنے ہی نہیں دیا تھا، بلکہ قوم کو انسانیت کے درجے سے بھی گرا دیا تھا۔ انسان مویشی بن چکے تھے۔ پولیس اور جرائم پیشہ لوگوں میں گہرا رشتہ پیدا ہو چکا تھا۔ امریکہ کی دی ہوئی مالی امداد اور قرضے اربابِ اقتدار و اختیار کے گھروں میں جا رہے تھے۔ معاشرہ بے اطمینانی، بے انصافی اور عدم مساوات کا شکار ہو کر افراد میں بٹ گیا اور افراد میں مروّت نہ رہی، باہمی پیار نہ رہا اور اُن کی سوچیں پیٹ کی نذر ہو گئی تھیں۔

ایسی معاشرتی کیفیت قومی جذبوں کو کہاں زندہ رہنے دیتی ہے لیکن ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح قوم یوں اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے لاش میں جان پڑ گئی ہو۔ جیسے مسمار کی ہوئی عمارت کا ملبہ از خود عمارت بن گیا ہو۔ جذبے جاگ اُٹھے اور شعلے بن گئے۔

بیداری اور بے جگری کی یہی کیفیت پاک فوج، فضائیہ اور بحریہ میں بھی پیدا ہو گئی۔ پاک فوج کی شجاعت کا تو یہ عالم تھا جیسے جسم نہیں روحیں لڑ رہی ہوں۔ یہ جذبۂ حُب الوطنی کی انتہا تھی کہ بعض محاذوں پر افسروں اور جوانوں نے فوجی قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر دیا۔ ہر افسر اور جوان یہ سوچ کر اپنے وطن کا دفاع کر رہا تھا کہ لڑنے کے لیے وہ اکیلا رہ گیا ہے اور وطن کے دفاع کی ذمہ داری اُس اکیلے پر آ پڑی ہے۔

یہ مظاہرے کئی محاذوں پر ہوتے۔ بیدیاں کے محاذ پر سائفن سے آگے ایسٹ بنگال رجمنٹ کی جو پوسٹیں تھیں وہاں بھی یہی مظاہرہ ہُوا۔ ایک پوسٹ کے حوالدار نے پیچھے آنے سے انکار کر دیا۔ فوج میں ایسی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ جونیئر کمانڈر اپنے ہیڈ کوارٹر کے احکام کی پروا نہ کریں، لیکن یہ جذبۂ حب الوطنی کی شدت تھی جس کے آگے وطن کے یہ سرفروش بے بس ہو گئے تھے۔ جب یہ حوالدار بھی اپنے باقی ماندہ جوانوں کے ساتھ شہید ہو گیا تو پتہ چلا کہ اُس نے پیچھے آنے سے انکار کیوں کیا تھا۔ اُن کے ساتھ وائرلیس کا ملاپ ٹوٹ گیا تھا۔ اُس کے تقریباً نصف گھنٹہ بعد دشمن کے ٹینک اور اُس کی انفنٹری آگے بڑھتی نظر آئی۔ بعد میں یہ معلوم ہُوا تھا کہ دشمن کے اس حملے کو اس بنگالی حوالدار نے اپنے چند ایک جوانوں کے ساتھ روکا ہُوا تھا۔ یہ جانباز آخری جوان تک لڑے۔ دوسری دو پوسٹوں میں سے ایک پوسٹ کی نفری پیچھے آ چکی تھی۔ دوسری پوسٹ کے جوان ابھی رینگتے ہوئے اور آڑ لیتے ہوئے پیچھے آ رہے تھے۔ دشمن نے اُنہیں دیکھ لیا تھا۔ اُس نے بڑی مشین گنوں کا فائر اُن پر مرکوز کر دیا تھا۔ جب دشمن نے ایڈوانس کیا تو ان بنگالی جوانوں نے دیکھ لیا۔ انہیں فوراً واپس آ جانا چاہیے تھا تاکہ نہر کی رکاوٹ کو سامنے رکھ کر اور محفوظ پوزیشنوں میں آ کر دشمن کا مقابلہ کرتے لیکن اُنہوں نے از خود ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ اُنہیں واپس نہیں جانا چاہیے۔ اُنہوں نے وہیں پوزیشنیں لے لیں۔ اُن کے پاس رائفلوں کے علاوہ دو مشین گنیں تھیں۔ راکٹ لانچر بھی تھے اور ایک جیپ تھی جس پر آر آر لگی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے وہیں سے دشمن کا مقابلہ شروع کر دیا۔

اپنے توپخانے کے دو او۔ پی بہت آگے گئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے دشمن کو بڑھتے دیکھا تو اپنے توپخانے کو فائر آرڈر دیا۔ حملہ کم و بیش دو انفنٹری پلٹنوں کا تھا جن کے ساتھ ٹینکوں کے دو سکواڈرن تھے اور انہیں ڈیڑھ دو سو چھوٹی بڑی توپوں کی گولہ باری کا چھاتہ حاصل تھا۔

ایسٹ بنگال رجمنٹ کے ساتھ جو توپخانہ تھا وہ پوری رجمنٹ نہیں تھی۔ صرف دو بیٹریاں تھیں۔ اُن کے پاس فیلڈ گنیں تھیں۔ دشمن کی جو طاقت تھی اُس کے مقابلے کے لئے میڈیم گنوں کی ضرورت تھی لیکن یہ پاکستانیوں کی بے مائیگی تھی کہ اُن کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ اُس سے زیادہ سے زیادہ کام لینے

کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ یہ تو سوچ ہی نہیں رہے تھے کہ اُن کے پاس کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ وہ جذبے سے سرشار تھے اور اسی کے زور پر لڑ رہے تھے۔ نعرے جو بدر کے میدان میں گرجے تھے اُن کی بازگشت بیدیاں کے محاذ پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ بدر اور بیدیاں شانہ بشانہ نظر آتے تھے۔ دشمن کی سینکڑوں توپوں کے گولے بنگالیوں پر وہ اثر نہ کر سکے جو اتنی تیز اور شدید گولہ باری کیا کرتی ہے۔

نائب صوبیدار بدرالحق نے سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال سے کہا کہ دشمن کا بڑا سخت حملہ آ رہا ہے۔ اقبال نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی حالت ڈرے ہوئے بچے جیسی تھی۔



اقبال کے گھر میں پہلے ہی ماتم کی فضا طاری ہوئی تھی۔ جنگ کے دوسرے ہی روز یہ خبر اقبال کے گھر بھی پہنچ گئی تھی کہ شہیدوں کی لاشیں لاہور سے آ رہی ہیں اور اُن کے گھروں کو جا رہی ہیں۔ وہ ایک فوجی ٹرک تھا جس میں دو شہیدوں کی لاشیں لے جائی جا رہی تھیں۔ لوگوں نے اس ٹرک کو روک لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا شہر اپنے شہیدوں کو دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آیا ہو۔ لوگ پھول لا لا کر ٹرک کے اندر پھینک رہے تھے۔

جب یہ خبر اقبال کے گھر پہنچی تو اُس کی ماں کا دل ڈوبنے لگا۔ اقبال کی چھوٹی بہن نے رونا شروع کر دیا جیسے فوجی ٹرک میں اقبال کی لاش آئی ہو۔ شہیدوں کی لاشیں تو چلی گئیں، لیکن ماتم اقبال کے گھر ہونے لگا۔ جس روز اقبال کو اپنے فاکس ہول سے اس لئے نکلنا پڑا کہ دشمن کا بڑا طاقتور حملہ آ رہا تھا اُس روز اُس کے گھر صحیح معنوں میں ماتم ہو رہا تھا کیونکہ اُس کی بہن شمع رات کو ریلوے لائن سے پکڑی گئی تھی اور وہ تھانے میں تھی۔ تھانے سے ایک کانسٹیبل آیا اور اقبال کے باپ کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ تھانے لے گیا کہ اُس کی بیٹی تھانے میں ہے۔ باپ چکراتا ہُوا تھانے پہنچا۔

تھانہ بلیک آؤٹ کی تاریکی میں ڈوبا ہُوا تھا۔ کانسٹیبل اُسے ایک کمرے میں لے گیا جس میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں کے شیشوں پر کالے رنگ کے موٹے کاغذ چڑھے ہوئے تھے۔ وہاں ایک تھانیدار اور اُس کے پاس پاک فوج کا ایک کیپٹن بیٹھا ہُوا تھا۔ اقبال کے باپ نے ان دونوں کو گھبراہٹ اور خوفزدگی کے عالم میں سلام کیا اور تھانیدار کے اشارے پر وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا نام چوہدری کرامت علی ہے؟" — تھانیدار نے پوچھا۔

"جی" — کرامت علی نے جواب دیا اور کیپٹن کی طرف دیکھ کر بولا — "میرا بیٹا فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ ہے .... محمد اقبال۔ وہ لاہور کے کسی محاذ پر ہے۔"

"کس یونٹ میں ہے؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"ایسٹ بنگال رجمنٹ میں۔"

"اِدھر دیکھئے" — کیپٹن نے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

چوہدری کرامت نے پہلے اُدھر نہیں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو کونے میں بنچ پر ایک جوان لڑکی بیٹھی تھی جس کا سر جھکا ہُوا تھا اور دوپٹہ اتنا آگے آیا ہُوا تھا کہ اُس کا چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔

"کیا یہ آپ کی بیٹی ہے؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"یہ اپنا نام شمع بتاتی ہے" — تھانیدار نے کہا۔

چوہدری کرامت آہستہ آہستہ اٹھا اور لڑکی کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ لڑکی کا جُھکا ہوا چہرہ گھونگھٹ میں چھُپا ہوا تھا۔ چوہدری کرامت نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور اُسے اچھی طرح دیکھا۔ وہ اپنے آپ کو کوئی فریب نہ دے سکا۔ وہ اُسی کی بیٹی شمع تھی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اُس نے اس قدر زور سے اپنی بیٹی کے مُنہ پر تھپڑ مارا کہ لڑکی بینچ سے فرش پر جا پڑی۔ چوہدری کرامت کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اور زیادہ پیٹے گا۔ کیپٹن تیزی سے اُٹھا اور دونوں کے درمیان آگیا۔ اُس نے تھانیدار سے کہا کہ لڑکی کو باہر بھیج دو۔ تھانیدار نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے کہا کہ لڑکی کو باہر بٹھائے اور اُس کے پاس موجود رہے۔ کیپٹن نے چوہدری کرامت کو بازو سے پکڑا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ چوہدری کرامت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"چوہدری صاحب!" — تھانیدار نے کہا — "آپ کے جذبات کو ہم بڑی اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ کسی جوان اور بالغ لڑکی کا کسی آدمی کے ساتھ رات کو گھومنا پھرنا کوئی ایسا سنگین جُرم نہیں کہ لڑکی کو یا دونوں کو حراست میں لے لیا جائے لیکن چوہدری صاحب! یہ حالات ایسے ہیں کہ میرا باپ بھی اگر مشکوک حالت میں گھومتا پھرتا نظر آجائے گا تو میں اُسے بھی حراست میں لے لوں گا۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کی بیٹی کا چال چلن اچھا ہے یا بُرا لیکن جس حالت میں اور جن حالات میں یہ پکڑی گئی ہے وہ ایسے ہیں کہ شک رفع کئے بغیر اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔"

"آپ نے اسے کہاں سے پکڑا ہے؟" — چوہدری کرامت نے مری ہُوئی آواز میں پُوچھا۔

"تھوڑی دیر پہلے ریلوے لائن سے" — تھانیدار نے جواب دیا — "ریلوے لائن پر پولیس کی گشت رہتی ہے۔ آپ کی بیٹی کے ساتھ دو آدمی تھے۔ یہ شک بھی ہے کہ وہ دو نہیں تین تھے۔ گشت کے کانسٹیبلوں نے انہیں بلایا۔ ایک آدمی ایک طرف بھاگ گیا۔ دو دوسری طرف نکل گئے۔ آپ کی بیٹی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی لیکن کانسٹیبلوں نے اسے پکڑ لیا۔ آپ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستانی ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں شاہ صاحب!" — چوہدری کرامت نے کہا — "میں جانتا ہوں انڈیا کے جاسوس سارے پاکستان میں موجود ہیں۔"

"صرف جاسوس نہیں چوہدری صاحب!" — کیپٹن نے کہا — "سب سے بڑا خطرہ سابوتاژ کا ہے۔ سابوتاژ شاید آپ سمجھتے ہوں۔ تخریب کاری کو کہتے ہیں۔ مثلاً ریلوے لائن کسی جگہ سے اکھاڑ دینا، پل تباہ کر دینا۔ کوئی فوجی گاڑی آ رہی ہو تو اُس کے نیچے بم رکھ دینا وغیرہ۔ آپ کے قریب چناب کا پل ہے۔ اگر یہ پل تباہ ہو جائے تو نہ ہم لاہور کے محاذ کو سپلائی اور کمک دے سکتے ہیں نہ سیالکوٹ کو۔ اس کے علاوہ وزیرآباد کی ایک فوجی اہمیت ہے۔ یہ سیالکوٹ اور لاہور کا جنکشن سٹیشن ہے" — کیپٹن نے آہ لی اور ذرا خاموش رہ کر بولا — "آپ چونکہ پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لئے میں آپ سے ایسی بات کر سکتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ انڈیا وزیرآباد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ سیالکوٹ سیکٹر میں اُس نے ٹینکوں سے حملہ کیا ہے۔ اُس کے جنگی قیدیوں سے اور اُن کاغذات سے جو اُن کے تباہ شدہ ٹینکوں سے برآمد ہوئے ہیں یہ انکشاف ہُوا ہے کہ انڈین آرمی سیالکوٹ کے راستے وزیرآباد تک پہنچے گی اور پاکستان کو دو حصّوں میں کاٹ دے گی۔ یہاں سے انڈین آرمی

لاہور کی طرف پیش قدمی کرے گی اور ہمارے لاہور کے دفاع کو توڑ دے گی .... آپ غور فرمائیں یہ کتنا خطرناک پلان ہے۔ اس پلان سے آپ وزیرآباد کی اہمیت کا اندازہ کریں۔ ہم تو یہاں کے ہر ایک آدمی کو شکی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ بھی سوچیں کہ میں یہاں کیوں آ بیٹھا ہوں۔ جاسوسی کے محاذ پر لڑنا میرا کام ہے۔ وزیرآباد جاسوسوں اور تخریب کاروں کے خطرے میں ہے۔"

"چوہدری صاحب! یہ بھی سوچیں" — تھانیدار نے کہا — "جنگ کے پہلے روز دھونکل، راہوالی اور گکھڑ کے ریلوے سٹیشنوں پر انڈیا کے ہوائی جہازوں نے جو حملے کئے تھے وہ مسافروں کو مارنے کے لئے نہیں کئے تھے۔ یہاں کے جاسوسوں نے ایک خاص مال گاڑی کی نشاندہی کی تھی۔ انڈیا کے ہوائی جہاز اس گاڑی کو تباہ کرنے آتے تھے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں جناب!" — چوہدری کرامت نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "لیکن میری بیٹی جاسوس نہیں ہو سکتی نہ اس کا کسی جاسوس کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ یہ باہر گھومنے پھرنے والی لڑکی بھی نہیں۔"

"اور یہ شریف لڑکی بھی نہیں چوہدری صاحب" — تھانیدار نے کہا — "اگر یہ گھریلو قسم کی بھلی لڑکی ہوتی تو رات کے وقت شہر سے اتنی دُور ریلوے لائن پر مردوں کے ساتھ نہ گھوم پھر رہی ہوتی۔"

"شاہ صاحب!" — کرامت نے تقریباً روتے ہوئے کہا — "یہ کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ آپ میری عزت کا خیال کریں۔"

"چوہدری صاحب!" — کیپٹن نے میز پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر کہا — "محاذوں پر ہمارے جوان جانیں قربان کر رہے ہیں۔ ٹانگیں اور بازو کٹوا رہے ہیں۔ میں خاکی وردی پہن کر ادھر اس ڈیوٹی پر بیٹھ کر صرف اس لیے ایک مشکوک لڑکی کو کیسے چھوڑ دوں کہ یہ صرف ایک شہری کی عزت کا سوال ہے۔ یہ لڑکی بہت بڑی تباہی کا اور نہ جانے کتنی قیمتی جانیں لینے کا باعث بن سکتی ہے۔ آپ ایک فوجی افسر کے باپ ہیں۔ آپ کی بیٹی کی ذرا سی حرکت آپ کے اپنے بیٹے کی موت کا باعث بن سکتی ہے، بلکہ اُس کی پوری یونٹ کو تباہ کرا سکتی ہے۔"

"نہیں کپتان صاحب! نہیں" — چوہدری کرامت نے رقت سے دبی ہوئی آواز میں اپنے سر کو دائیں بائیں ہلا ہلا کر کہا — "میری بیٹی پر کوئی اور الزام عائد کر دیں، میں سر جھکا لوں گا، یہ جاسوس نہیں ہو سکتی۔"

"پھر آپ اسے کہہ دیں کہ ہمیں بتا دے کہ اس کے ساتھ کون تھا" — تھانیدار نے کہا — "میں ایک بیہودہ سی بات کہنا چاہتا ہوں جو آپ کو بُری لگے گی۔ اگر آپ کی بیٹی جاسوس نہیں اور وہ کسی دوسرے مقصد کے لئے گھر سے نکلی تھی تو اس کے ساتھ ایک آدمی ہونا چاہیے تھا۔ اس عمر کی لڑکی تین آدمیوں کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے ساتھ کون تھا۔ یہ کہتی ہے کہ کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ وہاں کیا کر رہی تھیں تو کہتی ہے کہ ویسے ہی نکل گئی تھی .... یا تو آپ یہ ثابت کر دیں کہ آپ کی بیٹی میں کوئی دماغی خرابی ہے جس کے زیرِ اثر وہ کبھی کبھی باہر نکل جاتی ہے۔"

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا شاہ صاحب!" — چوہدری کرامت نے کہا — "اس میں کوئی دماغی خرابی نہیں۔ یہ جدھر بھی گئی تھی اپنے ہوش و حواس میں گئی تھی۔ میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر آپ کو یقین

ہے کہ میری بیٹی جاسوسوں کے کسی گروہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے تو مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ دوں"۔

"جذباتی باتیں نہ کریں چوہدری صاحب!" — کیپٹن نے کہا — "ہمارا سامنا ایک بہت بڑی اور بڑی ہی خطرناک حقیقت سے ہے۔ کسی ایک جاسوس کو پکڑ کر اُسے قتل نہیں کر دیا جاتا۔ اُس نے اُس کے تمام ساتھیوں کی نشاندہی کرانی جاتی ہے .... اگر لڑکی نے یہ نہ بتایا کہ اُس کے ساتھ کون لوگ تھے تو آپ کے گھر کی بھی تلاشی ہوگی"۔

چوہدری کرامت نے کیپٹن کے منہ کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھیں یوں ٹھہر گئیں جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو یا اُس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی ہو۔

"آپ پولیس انسپکٹر ہیں" — چوہدری کرامت نے تھانیدار سے کہا اور کیپٹن کی طرف دیکھ کر کہنے لگا — "اور آپ فوج کے کیپٹن ہیں۔ آپ دونوں کو بہت اتھارٹی حاصل ہے لیکن آپ دونوں اسی معاشرے کے افراد ہیں جس کا میں ہوں۔ میری ایک عرض سن لیں اور میری کچھ مدد کریں۔ اس لڑکی کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ لڑکے والے وزیر آباد کے رہنے والے نہیں۔ اگر یہ خبر پھیل گئی کہ میری بیٹی پکڑی گئی ہے اور تھانے میں ہے تو لوگوں کو آپ جانتے ہیں، وہ لڑکے والوں تک خبر پہنچا دیں گے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لڑکا فوج میں لیفٹیننٹ ہے"۔

"محترم!" — کیپٹن نے کہا — "یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ لڑکی سے کہیں کہ ہمیں بتا دے اس کے ساتھ کون کون تھا"۔

"یہ مجھے نہیں بتائے گی" — چوہدری کرامت نے کہا — "آپ خود پوچھ لیں" — اُس نے ذرا سوچ کر کہا — "وہ میرے سامنے نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ جو جذبہ آپ میں ہے وہ مجھ میں نہیں۔ آپ اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے جب ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ پولیس کی آنسو گیس سے آج تک میری آنکھیں خراب ہیں۔ میں پانچ مہینے جیل میں بند رہا تھا۔ حوالات میں انگریزوں کی پولیس نے مار مار کر میری اور میرے ساتھیوں کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ پاکستان بن گیا تو مجھے رہائی ملی تھی"۔

"اُس وقت کی کہانیاں اگر آپ اپنی اولاد کو سناتے تو آج آپ اِس حالت میں تھانے نہ بیٹھے ہوتے" — تھانیدار نے کہا — "بہرحال آپ کی یہ باتیں آپ کی بیٹی کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکتیں"۔

"اگر آپ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو باہر بیٹھیں" — کیپٹن نے کہا — "آپ گھر جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ آپ کی بیٹی کو ہم کب فارغ کریں گے .... فارغ کریں گے بھی یا نہیں"۔

چوہدری کرامت یوں اٹھا جیسے اُس کے کندھوں پر اُس کی اولاد کے گناہوں کا سارا بوجھ ڈال دیا گیا ہو یا جیسے وہ ایک ہی جست میں نوّے برس کا ضعیف بوڑھا ہو گیا ہو۔ وہ تھانیدار کے دفتر سے نکلا اور بلیک آؤٹ کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

★

"لے آؤ اُسے" — کیپٹن نے تھانیدار سے کہا۔

"میں اُسے اندر بھیج دیتا ہوں" — تھانیدار نے اُٹھتے ہوئے کہا — "پہلے آپ اپنا طریقہ آزمالیں۔ میں اُسے آپ کے پاس چھوڑ جاؤں گا .... لیکن کیپٹن طارق!" — تھانیدار نے مسکرا کر کہا — "لڑکی خوبصورت ہے اور آپ ابھی نوعمر ہیں۔ اگر لڑکی جاسوس ہوئی تو آپ پر جادو چلا جائے گی۔ جاسوس عورتوں کے قصے آپ نے سُنے ہوں گے"۔

"شاہ صاحب!" — کیپٹن طارق نے ہنستے ہوئے کہا — "اگر جنگ نہ ہوتی تو میں شاید کچھ وقت کے لیے اس لڑکی کا جادو قبول کر لیتا لیکن اب قصہ کچھ اور ہے۔ مجھ جیسے لیفٹیننٹ اور کیپٹن محاذوں پر لڑ رہے ہیں کٹ رہے ہیں ٹینکوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ مجھے وہاں ہونا چاہیے تھا لیکن میرا محاذ یہ ہے۔ ابھی تو اپنا ایمان زیادہ عزیز ہے .... آپ فکر نہ کریں۔ اُسے لے آئیں"۔

تھانیدار شمع کو کیپٹن کے کمرے میں داخل کر کے چلا گیا۔ کیپٹن طارق نے شمع کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ ہر لحاظ سے پُرکشش لڑکی تھی اور نوجوان بھی تھی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ کیپٹن طارق نے اُسے اپنے سامنے کُرسی پر بٹھا لیا۔

"کیا فائدہ آنسو بہانے کا" — کیپٹن طارق نے کہا — "صرف اس سوال کا جواب دے دو کہ تم وہاں کیا کر رہی تھیں اور تمہارے ساتھ کون تھا"۔

وہ خاموش رہی۔ کیپٹن اُسے دیکھتا رہا۔

"تم نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تمہارا بڑا بھائی فوج میں لیفٹیننٹ ہے؟" — کیپٹن طارق نے پوچھا — "تم نے تو یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہارا باپ کتنا معزّز آدمی ہے اور وہ تمہارے رشتے کے لیے پریشان ہو رہا ہے"۔

شمع کا سر جُھکا رہا۔ وہ کچھ بھی نہ بولی۔

"کب تک چُپ رہو گی؟" — کیپٹن طارق نے کہا — "ہم تمہارے بولنے کا انتظار نہیں کریں گے۔ تم جس جگہ بیٹھی ہوئی ہو، یہاں پتھروں جیسے سخت چور اور ڈاکو بھی بول پڑتے ہیں"۔

"میں چور تو نہیں" — شمع نے سر اٹھا کر دبی ہوئی آواز میں کہا — "میں نے کہیں ڈاکہ بھی نہیں ڈالا"۔

"تم جاسوس ہو" — کیپٹن طارق نے کہا — "تم اپنے ملک کو ڈنک مار رہی ہو"۔

شمع یوں تڑپی جیسے اُس کے جسم کے ساتھ بجلی کی ننگی تار لگا دی گئی ہو۔ اُسے پہلی بار جاسوس کہا گیا تھا۔

"نہیں" — اُس نے کربناک آواز میں کہا — "مجھ پر ایسا ذلیل الزام نہ لگائیں"۔

"تم جاسوس ہو" — کیپٹن طارق نے دانت پیس کر دھیمی سی آواز میں کہا — "میں نے پہلے اس لیے تمہیں جاسوس نہیں کہا تھا کہ تم خود مان جاؤ گی لیکن تم سمجھتی ہو کہ تمہارے آنسو تمہیں بے گناہ ثابت کر دیں گے .... شمع! اب مجھ سے شرافت کی توقع نہ رکھنا"۔

"مجھ پر بدچلنی کا الزام عائد کر دو" — شمع نے کہا — "مجھے چور کہہ لو۔ جو جی میں آتے کہہ لو، خدا کے لیے مجھے جاسوس نہ کہو"۔

"پھر تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟" — کیپٹن طارق نے پوچھا — "اپنے یار سے ملنے گئی تھیں؟"

"ہاں!" شمع نے سر ہلا کر آہستہ سے کہا — "یہ الزام صحیح ہے ...... لیکن ...... لیکن اُسے آپ بُرے لفظوں میں یار نہ کہیں۔ میں اُسے ملنے گئی تھی۔"

"اُسے یا اُنہیں؟" — کیپٹن طارق نے کہا — "کانسٹیبل کہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ تین آدمی تھے۔"

"میرے ساتھ ایک ہی تھا" — شمع نے کہا — "ہم دونوں لائن کے ایک طرف کھڑے تھے اور دو آدمی لائن کے ساتھ ساتھ دوسری طرف جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہم دونوں وہاں سے چل پڑے۔ آگے سے پولیس کے دو سپاہی آ رہے تھے۔ ایک نے للکار کر کہا — خبردار۔ بھاگنا نہیں۔ وہیں رُک جاؤ۔ — وہ دو آدمی لائن سے ہٹ کر دوڑ پڑے۔ انہیں بھاگتے دیکھ کر میں جس کے ساتھ تھی، وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں اُس کی خاطر یہ خطرہ مول لے کر گھر سے نکلی تھی۔ اُس نے اتنا بھی نہ کیا کہ مجھے اپنے ساتھ لے کر بھاگتا۔ میں بھی بھاگنے لگی لیکن سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا اور تھانے لے آئے۔"

"تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی؟"

"اپنی بے عزتی سے ڈرتی تھی" — شمع نے جواب دیا اور چند سیکنڈ چُپ رہ کر بولی — "آپ خود نوجوان ہیں۔ معلوم نہیں آپ نے شادی کی ہے یا نہیں۔ آپ میرے جذبات کو سمجھتے ہونگے۔ اُس کے ساتھ میرا تعلق وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"پہلے اُس کا نام اور ایڈریس بتاؤ" — کیپٹن طارق نے کہا — "اُس کے بغیر میں تمہیں رہا نہیں کر سکوں گا۔"

شمع نے نام بھی بتا دیا ایڈریس بھی۔

کیپٹن طارق نے اُسی وقت تھانیدار کو بلا کر اس آدمی کا نام اور ایڈریس دیا اور کہا کہ اُسے فوراً تھانے لایا جائے۔



"آپ نے مجھے جاسوس کیوں سمجھ لیا ہے؟" شمع نے پوچھا۔

"جاسوسوں کے سروں پر سینگ نہیں ہوتے شمع!" — کیپٹن نے کہا — "وہ مجھ جیسے ہوتے ہیں۔ تم جیسے ہوتے ہیں۔ انہیں اسی طرح شک میں پکڑا جاتا ہے۔ وہ اتنے کچے نہیں ہوتے کہ فوراً تسلیم کر لیں کہ وہ جاسوس ہیں۔ میں تم سے بھی توقع نہیں رکھتا کہ فوراً تسلیم کر لو گی کہ تم جاسوس ہو۔"

"خدا کے لیے مجھے ......"

"شمع! پہلے میری بات سن لو" — کیپٹن طارق نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے بے چین سے لہجے میں کہا — "تم اگر غیر مسلم ہوتیں تو اس وقت تک یہاں تمہارا حلیہ کچھ اور ہو چکا ہوتا۔ چونکہ تم مسلمان باپ کی بیٹی اور ایک لیفٹیننٹ کی بہن ہو اس لیے میں کوشش کروں گا کہ تم صرف باتوں سے مان جاؤ۔ نہیں مانو گی تو تم تصور میں نہیں لا سکتیں کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔"

شمع کچھ کہنے لگی تھی۔ کیپٹن طارق نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چُپ کرا دیا۔

"جاسوس کا کام کیا ہوتا ہے؟" — کیپٹن طارق نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا

"ادھر کے فوجی راز اُدھر پہنچانا۔ ریل گاڑیاں اسلحہ بارود، تیل پٹرول اور دیگر فوجی سامان سے لدی ہوئی محاذوں کی طرف جاتی ہیں۔ جاسوس اور تخریب کار ان گاڑیوں کو اپنے ہوائی جہازوں سے یا ان کے راستے میں بم یا ڈائنامیٹ رکھ کر تباہ کراتے ہیں ...... تم اپنے جوان بھائی کو تصور میں لاؤ۔ اُسے ایمونیشن نہیں پہنچتا۔ اُس کی یونٹ کی گاڑیوں کو پٹرول نہیں ملتا تو وہ دشمن کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ دشمن کی مشین گنوں کی گولیاں اُس کے جسم سے پار ہو جائیں گی۔ یا گرینیڈ یا توپ کا گولہ اُس کے قریب پھٹ کر اُس کے جسم کے ٹکڑے بکھیر دے گا۔ تمہیں اپنے بھائی کی لاش بھی نہیں ملے گی ...... تم اگر فوجیوں کو اپنے بھائی نہیں سمجھتیں تو اپنے بھائی کو تو بھائی سمجھو۔ کیا تم اپنے بھائی کو دشمن سمجھتی ہو؟"

"نہیں" — شمع نے تڑپ کر کہا — "میں پاکستان کی بیٹی ہوں۔ میں کسی فوجی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتی۔"

"سنا ہے جس کے ساتھ تمہاری شادی ہو رہی ہے وہ بھی فوجی ہے" — کیپٹن طارق نے کہا — "لیفٹیننٹ ہے شاید!"

شمع نے آہ لی اور بولی — "اسی شادی نے مجھے خراب کیا ہے۔ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔ میں نے اس لڑکے کو دیکھا نہیں۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ لیفٹیننٹ ہے لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ میں اُسے جانتی ہوں جو ریلوے لائن پر میرے ساتھ تھا۔"

"کب سے؟"

"میں اُس وقت فسٹ ایئر میں پڑھتی تھی" — شمع نے جواب دیا — "بس اُس سے محبت ہو گئی اور ہم نے شادی کے وعدے کر لیے ...... خدا جانتا ہے کہ ہماری محبت پاک رہی ہے۔ اُس کے والدین نے میرا رشتہ مانگا تھا لیکن میرے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ہم پھر بھی ملتے رہے۔ میں نے اپنی امی سے کہا تھا کہ میں اسی کے ساتھ شادی کروں گی لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ ابو بھی نہیں مانتے تھے۔ میں نے اپنی پسند کے اس لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کا اور کورٹ میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"آج رات تم گھر سے بھاگ رہی تھیں؟"

"نہیں جی!" — شمع نے جواب دیا — "یہ ہماری ویسے ہی ملاقات تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ جنگ کی وجہ سے لوگ رات کو باہر نہیں نکلتے۔ بلیک آؤٹ ہوتا ہے رات کو آ جانا۔ رات کو میں امی سے جھوٹ بول کر گھر سے نکل گئی اور وہ مجھے مل گیا جہاں اُسے ملنا تھا۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے ریلوے لائن کی طرف چلے گئے۔ ہمیں کہیں چھپ کر بیٹھنا نہیں تھا۔ ہم واپس آ رہے تھے۔"

کمرے کا دروازہ کھلا۔ تھانیدار اندر آیا اور کیپٹن طارق کو بتایا کہ وہ لڑکا آ گیا ہے۔

"لے آئیں اُسے!" — کیپٹن نے کہا — "آپ بھی آ جائیں۔"

تھانیدار ایک نوجوان کو اندر لایا۔

"یہ تھا؟" — کیپٹن طارق نے شمع سے پوچھا۔

"جی!"

"کیوں جوان!" — کیپٹن نے اُس سے پوچھا — "اس کے ساتھ تم تھے؟"

نوجوان نے شمع کی طرف دیکھا پھر کیپٹن طارق کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کا تاثر آ گیا۔

"بولو یار!"— کیپٹن نے اُسے کہا "گھبراتے کیوں ہو؟ تم سے تو یہ لڑکی دلیر ہے جس نے ساری بات سنادی ہے۔"

"نہیں جی!"— نوجوان نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "میں تو اس کے ساتھ نہیں تھا۔"

"اوئے رشید!" شمع نے حیرت سے کہا — "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں یہاں مجھ پر جاسوسی کا الزام لگ رہا ہے۔"

"نہیں جی.... نہیں جی"— نوجوان رشید نے خوفزدہ آواز میں کہا — "میں اس کے ساتھ نہیں تھا۔ میں.... میں.... خدا کی قسم، میں جاسوس نہیں ہوں۔ یہ اکیلی گئی ہوگی۔"

"کہاں گئی ہوگی؟"— کیپٹن نے پوچھا— "کہاں تھی یہ؟"

"ریلوے لائن پر"— رشید نے جواب دیا اور فوراً سنبھل گیا۔ ہکلا کر بولا— "مجھے کیا پتہ ہے یہ کہاں تھی۔"

کیپٹن طارق نے اُٹھ کر اُس کے منہ پر بڑے زور سے تھپڑ مارا۔ رشید گھوما تو دوسرا تھپڑ تھانیدار نے مارا۔

"بزدل!"— کیپٹن طارق نے اُس کے سر کے بال مٹھی میں لے کر جھٹکا دیا اور کہا— "تم اس کے ساتھ نہیں تھے تو تمہیں یہ کس طرح پتہ چلا ہے کہ اسے ہم نے ریلوے لائن سے پکڑا ہے؟" — کیپٹن نے تھانیدار سے کہا— "شاہ صاحب! اس کی تلاشی لیں اور اسے حوالات میں بند کر دیں پھر اس کے گھر کی تلاشی لیں گے۔"

رشید نے ہاتھ جوڑ دیئے اور وہ رونے لگا۔ کیپٹن طارق نے تھانیدار کو بتایا کہ شمع نے کیا بیان دیا ہے۔ دونوں نے شمع کی طرف دیکھا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

"اُوپر دیکھو شمع!"— کیپٹن طارق نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا— "کیا تم اس کمینے کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا ارادہ کئے ہوئے تھیں؟ کیا تم اسے مرد سمجھتی رہی ہو؟"— اُس نے رشید کا ایک کان پکڑ کر زور سے مروڑا اور پوچھا— "کیوں اوئے بے غیرت! کیا تو اسے گھر سے بھگا لے جاتا؟ تجھ میں اتنی جرأت ہے؟"

"یہ خود کہتی تھی"— رشید نے دوسری تیسری جماعت کے نالائق بچے کی طرح روتی ہوئی آواز میں کہا— "میں نے اسے گھر سے بھاگنے کو کب کہا تھا۔"

شمع نے اُسے جاہل عورتوں کی طرح گالیاں دینی شروع کر دیں۔ رشید شمع کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔

"سُن اوئے فلمی مجنوں!"— تھانیدار نے پیچھے سے رشید کی گردن پکڑ کر پوچھا— "اس کے ساتھ تم ریلوے لائن پر کیا کرنے گئے تھے؟"

"کچھ نہیں"— رشید نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا— "خدا کی قسم، اس سے پوچھ لو۔ اس کے ساتھ میری محبت پاک ہے۔ یہ اُس قسم کی محبت نہیں۔ خدا کی قسم۔"

"تم اس قابل ہو ہی کہاں کہ اُس قسم کی محبت کر سکو"— کیپٹن طارق نے اس کے بازو کو انگلیوں سے دباتے ہوئے کہا— "فلموں اور فلمی گانوں کے مارے ہوئے تم جیسے بیرو پاک محبت کے

سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ تم کاغذی گھوڑے! تم پاکستان کا نام کیا روشن کرو گے"— کیپٹن طارق ہنس پڑا اور بولا— "کمبخت سرکنڈا.... کہتا ہے یہ اُس قسم کی محبت نہیں۔ اوئے میری سُن!.... تو کسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کے قابل نہیں۔ میں تیری شادی فوج کے کسی لانگری کے ساتھ کراؤں گا۔ تم مردانہ کپڑے پہن کر بہروپئے بنے ہوئے ہو.... اس لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ کیوں آئے تھے؟"

رشید کیپٹن کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ تھانیدار نے پیچھے سے اُس کی گردن پر زوردار تھپڑ مار کر کہا جواب دو۔ رشید نے جواب دینے کی بجائے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔

"بول اوئے سٹیج ڈرامے کی ہیروئن!"— کیپٹن طارق نے رشید کے پیٹ میں انگلی چبھو کر پوچھا— "اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ کیوں آئے تھے؟"

"سپاہی آ گئے تھے نا!"— رشید نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"اور جس کے ساتھ تم پاک محبت کرتے تھے اسے سپاہیوں کے پاس چھوڑ آئے تھے؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"میں نے اسے کہا تھا بھاگ آؤ"— رشید نے جواب دیا — "یہ کہتی تھی مت ڈرو ہمیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"پھر تم اکیلے بھاگ آئے۔"

"اور کیا کرتا جی!"

"شاہ صاحب!"— کیپٹن طارق نے تھانیدار سے کہا— "ذرا دیکھیں، اس لڑکی کے والد صاحب باہر ہیں یا چلے گئے ہیں؟"

"وہ بیچارہ اُس وقت سے باہر بیٹھا رو رہا ہے"— تھانیدار نے کہا۔

"انہیں بلا لیں۔"



"اس لڑکے کو آپ جانتے ہیں؟"— چوہدری کرامت علی اندر آیا تو کیپٹن طارق نے اُس سے پوچھا— "آپ بیٹھ جائیں۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں بیٹا!"— چوہدری کرامت نے ہاری ہوئی اور مجبور سی آواز میں کہا— "ہمارے محلے کا لڑکا ہے۔"

"اس کے ماں باپ نے اس کے لیے آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا؟"

"ہاں بیٹا!"— چوہدری کرامت نے جواب دیا— "مانگا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیوں؟"

"آوارہ ہے جی!"— چوہدری کرامت نے جواب دیا— "آپ خود دیکھیں۔ یہ صرف خوبصورت ہے۔ باقی اسے دیکھ لیں۔"

کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک کانسٹیبل اندر آیا اور کہنے لگا کہ باہر دو عورتیں آئی ہیں۔ ایک اِس لڑکی کی ماں ہے۔ وہ رو رہی ہے اور بار بار اِدھر آتی ہے۔ رُکتی نہیں۔ اس کا کیا کریں؟

"بھیج دو اندر!" ـــ کیپٹن طارق نے کہا۔

شمع کی ماں کمرے میں آئی۔ اُس کے ساتھ ہاجرہ تھی۔ کیپٹن طارق کی نظریں ہاجرہ پر جم گئیں۔

"میری بیوی ہے" ـــ چوہدری کرامت نے کہا ـــ "اور یہ ہماری نوکرانی ہے۔"

چوہدری کرامت کو کانسٹیبل تھانے لے آیا تھا اور شمع کی ماں گھر بیٹھی پریشان ہوتی رہی جب رات بہت گزر گئی اور چوہدری کرامت واپس نہ آیا تو وہ ہاجرہ کو ساتھ لے کر تھانے آ گئی۔ اپنی بیٹی کو تھانے میں دیکھ کر وہ رو بھی پڑی، بیٹی کو کوسا بھی اور اُودھم بھی بپا کیا۔ اُس نے رشید کو دیکھا تو اُس نے اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"یہ تھا تیرے ساتھ؟" ـــ ماں نے رشید کی طرف اشارہ کر کے شمع سے پوچھا۔ شمع نے آہستہ سے سر ہلایا تو اس عورت نے رشید کو بلا رُک کے بے شمار گالیاں دے ڈالیں پھر اُس کے منہ میں ہاتھ دے دے کر کہنے لگی ـــ "تجھے ہم نے دھتکار دیا تھا پھر بھی تُو نے میری بیٹی کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ تو اصل بدمعاش ہے۔ تیری ماں کی بدمعاشیاں سارا شہر جانتا ہے" ـــ ماں نے تھانیدار سے کہا ـــ "یہ میری بیٹی کو ورغلاتا رہتا ہے۔"

"آپ کی بیٹی بچی تو نہیں" ـــ تھانیدار نے کہا ـــ "جوان اور بالغ لڑکی ہے۔ آپ صرف اسے گالیاں نہ دیں۔"

"صاحب جی!" ـــ ہاجرہ بول پڑی ـــ "یہ مجھے ہر روز چھیڑتا تھا۔ میں بازار جاتی ہُوں تو یہ رستے میں ضرور کھڑا ہوتا ہے۔ مجھے اشارے کرتا ہے اور پیسے بھی دکھاتا ہے۔ اس کے پاس بجلی کے بغیر چلنے والا ریڈیو ہوتا ہے جو ہر وقت گانے سناتا رہتا ہے۔"

"ان دنوں جب کافر بھی مسلمان ہو گئے ہیں، اس لڑکے نے اپنا رویّہ وہی رکھا ہُوا ہے" ـــ چوہدری کرامت نے کہا ـــ "اس کی بدمعاشیوں میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔"

رشید چپ چاپ کھڑا تھا۔ شمع سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چوہدری کرامت اور اُس کی بیوی رشید کے خلاف کبھی باری باری اور کبھی اکٹھے بول رہے تھے۔

تھانیدار اور کیپٹن طارق نے سب کو باہر نکال دیا۔ اُنہوں نے کچھ دیر آپس میں صلاح مشورہ کیا اور شمع کے باپ کو اندر بلایا۔

"ہم نے آپ کی عزت کا بہت خیال کیا ہے" ـــ کیپٹن طارق نے کہا ـــ "آپ اپنی بیٹی کو گھر لے جائیں۔ میں آپ سے مچلکہ لکھوا لوں گا جب اور جس وقت آپ کی بیٹی کو تھانے بلایا جائے آپ اسے تھانے لے آئیں۔ اس لڑکے کو ہم ابھی رہا نہیں کریں گے۔ ہمیں تفتیش کرنی ہے۔ میں آپ سے یہ توقع بھی رکھوں گا کہ آپ اپنی بیٹی کی نگرانی کریں گے۔ میں آپ کو شاید پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے پاکستان کی عزت اور سلامتی عزیز ہے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہُوا تو میں آپ کی عزت اور شرافت کی پروا نہیں کروں گا۔"

رشید کو اُنہوں نے مزید تفتیش کے لیے تھانے میں روک لیا اور شمع کو اپنے ماں باپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

★

دشمن کا بریگیڈ بیدیاں کے محاذ پر بڑھتا آ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ سائفن سے گزرنا چاہتا ہے۔ انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف نے اعلان کیا تھا کہ ٦ ستمبر صبح نو بجے وہ لاہور پر قبضہ کر چکا ہو گا اور وہ جم خانہ کلب میں وہسکی سے فتح کا جشن منائے گا لیکن جنگ کا تیسرا دن گزر رہا تھا اور جنرل چوہدری کی انڈین آرمی ابھی بی۔ آر۔ بی کے قریب نہیں آ سکی تھی۔ خاکی وردی والے سرفروشوں نے دشمن کے لیے لاہور کے وہ تینوں راستے بند کر دیئے جن سے اُس نے گزر کر لاہور پر قبضہ کرنا تھا۔

ایک راستہ باٹاپور کا تھا۔ دوسرا باٹاپور کے شمال میں بھینی کا پُل تھا اور تیسرا برکی۔ لاہور کے دفاع میں لڑنے والوں نے دشمن کے لیے یہ راستے اسی کی لاشوں سے بند کر دیئے تھے۔ دشمن کی ایسی ہیبت ناک قوت اور اتنی زیادہ نفری کو دیکھ کر جنگی مبصر سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مٹھی بھر پاکستانی لاہور کو بچانے کے لیے دشمن کو بی۔ آر۔ بی کے پار ہی روک سکیں گے مگر وہ ناممکن کو ممکن کر دکھا رہے تھے۔

ان مٹھی بھر جوانوں کے سر پر خُدا کا اور پیٹھ پر قوم کا ہاتھ تھا۔ لوگوں نے اپنی فوج کے لیے اور جو کچھ کیا سو کیا، اُنہوں نے محاذوں پر قرآنِ پاک کے چھوٹے سائز کے نسخے ہزاروں کی تعداد میں بھیج دیئے تھے۔ تقریباً ہر جوان کے گلے میں یا جیب میں قرآن کا نسخہ تھا۔

لاہور کا ایک دروازہ قصور بھی تھا۔ اسے ہمارے جانبازوں نے نہ صرف بند کر دیا تھا بلکہ دشمن کو پیچھے دھکیلتے ہُوئے اُس کے علاقے پر قابض ہو گئے تھے۔ اس طرح جنگ ہندوستان کی زمین پر چلی گئی تھی۔

اب بیدیاں سائفن رہ گیا تھا۔ دشمن اس راستے پر اپنی قسمت آزما رہا تھا۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ کو سائفن کے اگلے علاقے سے پیچھے ہٹا لیا گیا تھا۔ دشمن نے اسے شاید پسپائی سمجھ لیا تھا۔ اُس کا توپ خانہ قیامت کی گولا باری کر رہا تھا اور اُس کے ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور انفنٹری آگ اگلتی آ رہی تھی۔

نائب صُوبیدار بدرالحق نے سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال کو فاکس ہول سے نکال لیا تھا۔ ایک طرف اُس کا وائرلیس آپریٹر تھا جو اُسے بار بار کمپنی یا بٹالین ہیڈکوارٹر کا کوئی پیغام دیتا تھا، دوسری طرف نائب صُوبیدار بدرالحق اُسے چلا چلا کر بتا رہا تھا کہ دشمن جس شدت سے آ رہا ہے، اسے روکنا آسان نہیں ہو گا۔

"پلاٹون کا پوجیشن ٹھیک نہیں شاب!" ـــ بدرالحق نے کہا۔

"نائب صاحب!" ـــ اقبال نے چلا کر کہا ـــ "آپ میرا دماغ کیوں چاٹ رہے ہیں۔ پوزیشن ٹھیک نہیں ہے تو جاؤ اور ٹھیک کرو۔"

نائب صُوبیدار ہوا میں اڑتی گولیوں اور گولوں کے ٹکڑوں کو چیرتا گرد و غبار میں غائب ہو گیا گرد و غبار سے ایک نعرہ بلند ہُوا ـــ "پاکیشتان..... جندہ باد" ـــ اقبال کو اس نعرے نے ہلا ڈالا۔ اُسے ایسے لگا جیسے کسی نے اُسے دھکا دیا ہو۔ وہ نہر کی طرف دوڑا اور کنارے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس نے دُوربین آنکھوں سے لگائی تو اس کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ گرد و غبار میں اسے جو کچھ نظر آیا اس نے اُس پر گھبراہٹ طاری کر دی ـــ دشمن کے ٹینک کم و بیش چھ سو گز دور رک گئے تھے اور انفنٹری ٹینکوں سے تقریباً ایک سو گز آگے مورچے کھود رہی تھی۔ بکتر بند گاڑیاں آہستہ آہستہ آگے آ رہی تھیں۔ ان کی مشین گنیں اور ٹینکوں کی توپیں آگ اُگل رہی تھیں۔

"شاب! ـــــ اُسے اپنے قریب اپنے نائب صوبیدار کی آواز سنائی دی ـــــ "پلاٹون کو آگے کر دیا ہے"۔

"دشمن کا فائر پاور بہت زیادہ ہے" ـــــ اقبال نے کہا ـــــ "نہر پار کرے گا"۔

"شکے گا نہیں" ـــــ نائب صوبیدار نے غصیلی آواز میں کہا ـــــ "شکے گا نہیں شاب! پاور جیادتی ہے تو ہم بھی مشلمان ہے۔ پھیر آرڈر دے بو شاب!"

"فائر آرڈر!" ـــــ اُس نے زیر لب کہا اور اُسے یاد آ گیا کہ وہ پلاٹون کمانڈر ہے، اُسے دشمن کو دیکھنا اور پلاٹون کو فائر آرڈر دینا ہے۔ اُس نے دوربین سے دشمن کو دیکھا۔ اُسے جو ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور دشمن کے سپاہی مورچے کھودتے دکھائی دے رہے تھے، ان کا اُس نے نظروں سے اور ٹریننگ میں بتائے ہوئے طریقوں سے فاصلہ ناپا لیکن فائر آرڈر کے متعلق سوچا تو اُس نے اپنے ذہن کو خالی پایا۔ ٹارگیٹ انڈیکیشن اور فائر آرڈر جیسے اہم سبق اُس کے ذہن سے یوں صاف ہو گئے تھے جیسے کبھی پڑھے ہی نہیں تھے۔

"اقبال شاب!" ـــــ نائب صوبیدار بدرالحق نے اُس کے کان میں چلا کر کہا ـــــ "آڈر دے بو شاب..... ڈسٹنس بولو..... بولو..... بولو اقبال شاب"۔

"ڈسٹنس چھ سو..... آٹھ سو ہو گا" ـــــ اقبال نے یوں کہا جیسے اُس کے جسم اور دماغ کا رشتہ ٹوٹ گیا ہو۔

وہاں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ وقت غلط فائر آرڈر کا نہیں تھا اور وہ وقت غلط کمانڈ کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وقت کا تقاضا اور مطالبہ صرف ایک تھا ـــــ دشمن کو نہر کے اُس طرف روکو۔ جانیں قربان کر دو ـــــ پاکستان پر جو وقت آن پڑا تھا، وہ جانوں کے نذرانے مانگ رہا تھا۔

سیکنڈ لیفٹیننٹ اقبال نائب صوبیدار بدرالحق کے سامنے طفل مکتب تھا لیکن بدرالحق اقبال کے حکم کا پابند تھا۔ بدرالحق نے اپنے "شاب" کو دیکھا پھر دشمن کو دیکھا۔ دشمن کی فائر پاور دیکھی تو وہ اقبال کو اکیلا چھوڑ کر اپنی پلاٹون کی پوزیشن کی طرف دوڑ گیا۔ اُس نے کسی کے حکم کے بغیر پلاٹون کی کمانڈ لے لی۔

"نمبر ٹو پلٹون!" ـــــ وہ چلایا ـــــ "ڈسٹنس نو سو..... دشمن ایڈوانس کرتا..... اپنا ٹارگیٹ۔ اپنا ٹیم" ـــــ پھر اُس نے بنگالی میں چلا کر کچھ کہا۔ اُس کی پلاٹون کی مشین گنوں اور رائفلوں کے منہ کھل گئے۔ اس کے ساتھ ہی بنگالیوں نے فائر کے مسلسل دھماکوں سے بلند پاک فوج کا مخصوص نعرۂ حیدری لگایا۔

نائب صوبیدار بدرالحق نے دوڑ دوڑ کر بڑی مشین گنوں کی اور آر آر کی پوزیشن ذرا ذرا سی بدل دی۔ آر آر کے گنر دشمن کی بکتر بند گاڑیوں کو نشانہ بنانے لگے۔ نشانہ بنانا آسان کام نہیں تھا کیونکہ دشمن کی طرف سے اس قدر گولیاں اور اتنے زیادہ گولے آ رہے تھے کہ سر اوپر اٹھانا خودکشی تھی لیکن بنگال کے جوان پنجاب کے دفاع میں خودکش معرکہ لڑ رہے تھے۔ وہ سر اٹھاتے تھے، سامنے دیکھتے تھے، گرد میں دشمن کو ڈھونڈتے اور فائر کرتے تھے۔



اقبال کی حالت بھرے میلے میں بھٹکے ہوئے بچے کی سی ہو گئی۔ اس کی پلاٹون اُس کے نائب صوبیدار کے زیر کمان آ چکی تھی۔ وہ اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔ شرمندگی اُسے الگ پریشان کر رہی تھی۔ اس کی باقی بٹالین نہر کے کنارے دور دور تک بکھری ہوئی گرد میں چھپ گئی تھی۔ نظری ملاپ ٹوٹ چکا تھا۔ پلاٹون کا وائرلیس آپریٹر ایک گولے سے زخمی ہو گیا تھا لیکن بنگال کا یہ مسلمان زخموں کی پرواہ کیے بغیر اپنے سیٹ کو سنبھالے زخموں پر فیلڈ پٹی لپیٹ رہا تھا۔

اقبال نے بے بس ہو کر چاہا کہ وہ دھواں دھار گرد کی اوٹ میں اپنی دھاڑتی چنگھاڑتی پلاٹون کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اُس کے قریب ایک اور گولا پھٹا۔ وہ بدک کر آگے کو بھاگا اور نہر کے کنارے پر جا چڑھا۔ دشمن کے لیے وہ بڑا صاف ٹارگیٹ بن گیا لیکن پلک جھپکتے نہر کے کنارے سے پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ زمین دھماکوں سے لرز رہی تھی۔ پیچھے سے پاک آرٹلری کی توپیں دھاڑ رہی تھیں اور ان کے چیختے گولے اس کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

اُس کی نظریں بی آر بی کی روانی پر جم گئیں۔ اُس نے نہر میں کود جانا چاہا لیکن اُس نے دیکھا کہ نہر میں لاشیں بہی جا رہی تھیں۔ یہ تمام لاشیں بھینی اور باٹا پور کی طرف سے آ رہی تھیں۔ ان میں دو تین لاشیں خاکی وردی میں ملبوس تھیں۔ ان شہیدوں کا یہی کفن تھا۔ انہیں پکڑنے اور نہر سے نکالنے کی کسی کو ہوش نہیں تھی۔

بہتی ہوئی لاشوں میں دیہاتیوں کی لاشیں بھی تھیں۔ یہ بدنصیب سرحدی دیہات کے رہنے والے تھے جو وقت سے پہلے بھاگ نہ سکے۔ انہوں نے جنگ کے دوران تیر کر نہر پار کرنے کی کوشش کی تھی۔

ان لاشوں میں، اِس کنارے کے ساتھ ساتھ اقبال کو دو سفید سی گٹھڑیاں بہتی دکھائی دیں جب گٹھڑیاں اُس کے قریب سے گزریں تو اُس نے دیکھا کہ وہ ایک جواں سال عورت کی لاش تھی اور اس کے پہلو میں ننھے سے ایک بچے کی لاش بہی جا رہی تھی۔ اقبال کو معاً خیال آیا کہ ہندوستانیوں نے پاکستان کے سرحدی دیہات میں تباہی مچائی ہوئی ہے۔ اُسے تلخ سا خیال آیا کہ یہ کسی غیرت مند پاکستانی ماں کی لاش ہے جس نے اپنی آبرو بچانے کی خاطر اپنے بچے سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی ہو گی۔ اس کا خاوند شہید ہو گیا ہو گا۔ اس کے بھائی بھی ضرور شہید ہو گئے ہوں گے۔

لاش کی آنکھیں کھلی تھیں اور منہ کنارے کی طرف تھا۔ اقبال کو یوں لگا جیسے پاکستان کی یہ غیور ماں اُسے ہی دیکھ رہی ہو۔ بچے کی آنکھیں بند اور معصوم سے چہرے پر کرب انگیز تاثر تھا۔ منہ ماں کی طرف مڑا ہوا تھا۔ اقبال کے جسم نے جھرجھری لی۔ اُس نے محسوس کیا جیسے بچے نے نفرت سے اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا ہو۔ عورت کی لاش کی ٹھہری ہوئی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے اقبال سے کہہ رہی ہوں ـــــ "تجھ جیسے گبھرو جوانوں کے جیتے جی میں اکلوتے بچے سمیت ڈوب مری ہوں"۔

قیامت کی گولہ باری اور ایسٹ بنگال رجمنٹ کی بے پناہ جوابی فائرنگ کے فلک شگاف دھماکوں میں اقبال کو سرگوشی سنائی دی ـــــ "اقبال جی! بہنا آ سر انو کرانی کو چھیڑنا جا انم دی تو نہیں کسی بھائیوں والی بہن کو جا چھیڑو نا!"

ہاجرہ کی دو برس پرانی آواز اقبال کے لاشعور سے اُبھر کر اُس کے کانوں میں گونجی تو وہ تڑپ اُٹھا۔ ماں اور بچّے کی لاشیں بہتی آگے نکل گئیں۔ اقبال نے یقین کی حد تک محسوس کیا کہ وہ ہاجرہ کی لاش تھی۔ اُسے یہ بھی محسوس ہُوا جیسے ہاجرہ اُسے مرتے مرتے کہہ گئی ہو — "اقبال جی! تم ہندو ہو۔ ہندوؤں نے نہتّی مسلمان عورتوں کی آبرو لوٹی ہے۔ تم نے میری آبرو پہ حملہ کیا تھا۔ تم بھی ہندو ہو.... تم ہندو ہو۔"

اقبال کو چکر آنے لگے۔ ایک ہی راہِ فرار نظر آئی کہ نہر میں ڈوب مرے اور اُس کی لاش ان لاشوں کے ساتھ بہتی پاکستانیوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ وہ بھول گیا کہ وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ ہے۔ وہ بھگوڑا تھا۔ جنگ کی ہولناکی سے ہی نہیں وہ اپنے آپ سے بھی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ اچھل کر اٹھا اور نہر کے کنارے سے اُتر آیا۔ اُسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اُس کا نائب صوبیدار اور اُس کی پلاٹون کے جوان اقبال ہی کو نہیں ساری دنیا کو فراموش کر کے بلکہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر کے اُس دشمن پر آگ برسا رہے تھے جو بیدیاں کے راستے لاہور میں داخل ہونے کے لیے حملہ آور ہو رہا تھا۔



اقبال پیچھے آیا اور کچھ زیادہ ہی پیچھے آ گیا۔ پیچھے چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ گولوں کے دھوئیں کی گھٹاؤں میں اقبال کو نو دس برس کی ایک بچّی چیختی چلاّتی، تھر تھر کانپتی، تیز بھاگتی نظر آئی۔ وہ شاید قریب کے گاؤں میں کہیں چھپی رہی تھی۔ گاؤں تو دو روز ہُوئے خالی ہو گیا تھا مگر یہ بچّی جانے کہاں دبکی رہی تھی۔ اقبال جاگ اٹھا۔ اُس کے احساسات میں بھونچال سا آ گیا اور وہ بچّی کو اٹھا کر سینے سے لگا لینے کو دوڑا لیکن بھارتی توپ خانے کا ایک گولا بچّی سے ڈیڑھ دو گز کے فاصلے پر پھٹا۔ شعلہ چمکا۔ گرد اُڑی، پتھر اڑے، لوہے کے لال انگارہ ٹکڑے ننھے سے جسم کو چیرتے فضا میں بجھ گئے۔

اقبال اس گولے سے نہ ڈرا۔ وہ دوڑتا گیا مگر ننھی سی بچّی کا جسم خون کا لوتھڑا بن چکا تھا۔ بچّی کی آنکھیں کھلی تھیں اور اقبال کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ یہ ننھی ننھی دو آنکھیں، سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں پھر کروڑوں آنکھیں بن گئیں اور اقبال کو یوں لگا جیسے پاکستان کی لاکھوں معصوم بچیوں کی لاشوں کی آنکھیں اسے گھور رہی ہوں۔

اقبال کی سوچ اور فکر کے دھارے خشک ہو گئے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دوسرے لمحے چند گز دور ایک گولا پھٹا جس کا ذرا سا ٹکڑا اقبال کے گال پر آ لگا۔ وہ خوش نصیب تھا کہ ٹکڑا ذرا چھوٹا تھا اور ترچھا آیا تھا ورنہ دونوں گالوں کو چیرتا گزر جاتا۔ اقبال نے زخم کھا کر پروا نہ کی اور بچّی کی لاش پر جھکا۔ اقبال کے زخمی گال سے خون کے قطرے گرے اور بچّی کے خون میں جذب ہو گئے۔ اُس نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ کو دیکھا۔ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس نے بچّی کے خون کو دیکھا۔ بچّی کے خون کا رنگ بھی وہی تھا — لال سرخ، پاکستانی خون!

اقبال کے سینے میں ہولناک دھماکہ ہُوا۔ اُسے چکر سا آیا لیکن سنبھل گیا۔ جب وہ اُٹھا تو اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُسے بچّی کی لاش کے پاس بیٹھے ایک مدت گزر گئی ہو لیکن یہ سب کچھ ایک

ثانیے میں ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھا تو اس نے اپنے جسم میں انوکھی سی قوت محسوس کی۔ نہ اُسے خوف آ رہا تھا، نہ مر جانے کا خدشہ باقی تھا۔ گال کے زخم سے درد کی ٹیس اُٹھی۔ وہ تڑپا جیسے پاکستان کی کسی بہن نے اُس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو — اوباش اقبال مر گیا اور اِس کے وجود سے پاکستان کی آبرو پر مر مٹنے والے اقبال نے جنم لیا۔

اقبال پر ہیجانی کیفیّت طاری ہو گئی۔ اُسے بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں۔ اُسے فائر آرڈر اور ٹارگیٹ انڈیکیشن کے سبق بھی یاد آ گئے۔ اُسے یہ بھی یاد آ گیا کہ جنہیں اُس نے بنگال کے مچھیرے سمجھا تھا وہ دشمن کی ہولناک آتشیں اور آہنی قوت کے سامنے آگ کی دیوار بنے ہُوئے ہیں اور یہ بھی یاد آ گیا کہ اُس کی بٹالین کو "بنگال ٹائیگرز" کہتے ہیں۔ آج وہ سچ مچ کے ٹائیگر بن گئے تھے۔ اللہ کے شیر!

اقبال نے اپنی پلاٹون کے ڈیپلا ئے اور پوزیشن کا جائزہ لیا پھر دشمن کی طرف دیکھا۔ وہ دوڑ کر اپنے نائب صوبیدار کے پاس گیا۔ نائب صوبیدار میڈیم مشین گن فائر کر رہا تھا کیونکہ اس گن کے دونوں جوان شدید زخمی ہو گئے تھے۔

"نائب صاحب!" — اس نے کہا — "اس مشین گن اور آر آر کی پوزیشن ٹھیک نہیں۔ آپ...."

"آپ خود دیکھو شاب!" — نائب صوبیدار بولا — "یاسین گن سنبھالو۔ ہم اُدھر کو دیکھے گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" — اقبال نے کہا — "میں دیکھوں گا" — اور وہ دوڑ کر مشین گن اور آر آر والی جیپ کی پوزیشنیں بدلنے لگا۔ ذرا سی دیر میں اقبال نے تجربہ کار کمانڈر کی طرح پلاٹون کی مختصر سی نفری اور تھوڑے سے ہتھیاروں کو اس طرح ترتیب دے لیا کہ چند ایک جوان اور تھوڑا سا اسلحہ دشمن کا زیادہ سے زیادہ نقصان کرنے لگا۔ اسلحہ سے زیادہ تو بنگالیوں کا جذبہ لڑ رہا تھا۔ سانولے بنگالی مورچوں سے نکل نکل کر نہر کے کنارے کے اُوپر جا کر فائر کرنے کو تڑپ رہے تھے۔ اُن کے انداز اور ان کے نعروں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نہر پھلانگ کر بھارتیوں کے ساتھ دست بدست جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔

ایک راکٹ لانچر کے گنر کی پیشانی میں گولی لگی اور بنگال کا ایک شیر تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اقبال اُس کی طرف دوڑا اور شہید کی لاش کو بازوؤں پر اٹھا لیا۔ وہ لاش اٹھائے پیچھے گیا۔ اُدھر سے سٹریچر بیرر آ گئے۔ اقبال نے لاش کو سٹریچر پر ڈالا اور وارفتگی سے اُس کا ہاتھ چوم کر بازو اُس کے سینے پر رکھ دیا۔ لاش کو سٹریچر بیرر اٹھا لے گئے۔ اقبال نے اپنے سینے میں شعلہ سا جلتا محسوس کیا جس کی تپش سے وہ پاگل سا ہو گیا۔ وہ سپرنگ کی طرح اچھلتا کودتا اپنی پلاٹون کی پوزیشن تک آیا۔ دشمن کے ٹینکوں اور مارٹروں کے گولے اور مشین گنوں کی بوچھاڑیں نہر کے اس کنارے کو بے رحمی سے زد میں لیے ہُوئے تھیں۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ اگر بنگال رجمنٹ کے غازی پسپا ہو آتے تو جنگ کا کوئی بھی ماہر حیران نہ ہوتا لیکن بنگال ٹائیگرز کو یہ احساس دیوانہ کیے جا رہا تھا کہ پنجاب کی لاج اُن کے ہاتھ ہے۔ ذرا ہی دیر پہلے اُن کا حوالدار ساری پلاٹون کو للکار کر بنگالی زبان میں کہہ چکا تھا — "بنگالیو! تمہارے دائیں بائیں پنجابی اور پٹھان لڑ رہے ہیں۔ کوئی یہ نہ کہہ دے کہ بنگالی پنجاب کو نہیں بچا سکے" — اور نائب صوبیدار نے انہیں

کہا تھا ــــ "کسی اور طرف سے دشمن نہر پار کر لے تو پروا نہیں۔ ہماری پوزیشن سے دشمن نہر کے قریب نہیں آنا چاہیئے۔"



اقبال کی پلاٹون کے عہدیدار اور جوان حاضر دماغی اور شجاعت کے حیرت انگیز مظاہرے کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو آوازیں دے دے کر ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اقبال نے دشمن کی بکتر بند انفنٹری کی پوزیشنیں دیکھ کر اپنی آر آر کی جیپ کو ایک اور جگہ کر دیا۔ وہ نہر کے کنارے پر جاتا، دشمن کو دیکھتا اور آر آر فائر کراتا تھا۔

"شاباش آآڑے لو" ــــ اُس کے حوالدار نے گلا پھاڑ کر اسے کہا ــــ "نیلنگ میں دشمن کو جیا ستی تارگیٹ مت نئیں دیو۔" لیکن اقبال نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے بتائے ہوئے ٹارگیٹ پر آر آر والوں نے گولے فائر کر کے دشمن کے ایک ٹینک کو آگ لگا دی اور ایک ٹینک کا ٹریک توڑ دیا۔ ٹینک کی گنیں فائر کرتی رہیں مگر وہ ہلنے کے قابل نہ رہا۔ آر آر کی ایک ڈائریکٹ ہٹ سے وہ بھی تباہ ہو گیا۔ اس کے کریو کو ٹینک سے کودتے دیکھا تو مشین گن نے انہیں دو بوچھاڑوں میں ٹینک کے قریب ہی ٹھنڈا کر دیا۔

انڈین ایئر فورس کے دو بمبار طیارے خاصی بلندی پر آئے اور بی آر بی کے سائفن پر ایک ایک ہزار پاؤنڈ کے چار بم گرا گئے۔ بم بکھر کے پھٹے۔ دو سائفن سے دُور نہر میں اور دو دوسرے کنارے سے بھی دُور۔ نہر کا پانی بیسیوں فٹ اوپر اچھلا اور دیہاتیوں کی کئی لاشیں جو باٹا پور کی طرف سے بہتی آ رہی تھیں پانی کے ساتھ اوپر اٹھیں اور اس کنارے سے پرے جا گریں جس طرف بھارتیوں کے مورچے تھے۔

بموں سے سائفن محفوظ رہا۔ دشمن نے سائفن کا رخ کیا لیکن ایسٹ بنگال رجمنٹ کی اس فلینک کی کمپنی نے دشمن کے ٹینکوں اور انفنٹری کا وہی حال کیا جو باٹا پور اور بھینی کے پُل پر ہو چکا تھا۔ بھارتی کمانڈروں نے جب سائفن پر قبضہ ناممکن دیکھا اور اپنے طیاروں کے بم بھی رائیگاں جاتے دیکھے تو انہوں نے اپنی میڈیم آرٹلری کا فائر سائفن پر مرکوز کر دیا۔ پاک آرٹلری کے او۔پی جان کی بازی لگا کر انتہائی خطرناک جگہ چلے گئے اور دشمن کی آرٹلری کی پوزیشنیں دیکھ کر اپنی توپوں کے فائر کی رہنمائی کرنے لگے۔ اپنی توپوں نے دشمن کی بیشتر توپیں خاموش کر دیں اور جو فائر کرتی رہیں، اُن کا فائر بے ٹھکانہ تھا۔

دشمن کا بکتر بند ہراول سائفن کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا معلوم ہوتا تھا کہ بیدیاں سیکٹر کے بھارتی کمانڈر کے لیے یہ فیصلہ کرنا محال ہو گیا ہے کہ سائفن کو تباہ کیا جائے یا اس پر قبضہ کیا جائے لیکن اب فیصلہ بھارتیوں کے ہاتھ میں نہیں ایسٹ بنگال رجمنٹ کے ٹائیگرز کے ہاتھ میں تھا۔ بھارتیوں کی قسمت اب پاکستان کے بنگالیوں کے ہاتھ میں تھی۔ بنگالی فیصلہ کر چکے تھے کہ سائفن نہ تباہ ہو گا نہ دشمن کے قبضے میں جائے گا۔ اقبال کو ابھی سائفن کی اہمیت کا علم نہیں تھا۔ اُس نے اپنی پوزیشن بے جگری سے لڑ کر مضبوط کر لی تھی

اُس کا کمپنی کمانڈر دوڑتا آیا۔ اس بنگالی میجر کے دائیں کندھے سے خون بہ رہا تھا۔ مارٹر یا توپ کے گولے کے ٹکڑے نے اُس کا کندھا خاصا زخمی کر دیا تھا لیکن وہ زخموں سے بے نیاز کمپنی کے پاؤں

جمائے ہوئے تھا۔

"اپنا پلاٹون رائٹ فلینک میں بی کمپنی کے ساتھ اٹیچ کر دو" ــــ میجر نے اقبال سے کہا ــــ "فوراً بی کمپنی کمانڈر کو رپورٹ کرو۔ سائفن کو کور کرو۔ فوراً موو کرو۔ دشمن سائفن کو تباہ کر کے نہر روکنا چاہتا ہے۔ گرینیڈ، آر آر، راکٹ لانچر اور مارٹر کا زیادہ استعمال کرو۔ ایمونیشن لے لو۔"

"دشمن نہر کو روکنا چاہتا ہے؟" ــــ اقبال نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں اقبال!" ــــ کمپنی کمانڈر نے عادتاً تیزی سے بولتے ہوئے کہا ــــ "سائفن ٹوٹ گیا تو آگے نہر خالی ہو جائے گی اور اس طرف پانی جمع ہو کر سیلاب آ جائے گا۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو گا" ــــ اقبال نے جذباتی سے لہجے میں للکار کر کہا ــــ "بی آر بی بہتی رہے گی" ــــ اُس نے چلا کر نعرہ لگایا ــــ "بی آر بی بہتی رہے گی۔"

وزیر آباد میں سے سینکڑوں شہیدوں کی لاشیں گزر گئی تھیں اور گزر رہی تھیں۔

شاہراہِ پاکستان بھی وزیر آباد سے گزرتی تھی، سیالکوٹ والی سڑک بھی۔ قصور، لاہور، چونڈہ اور سیالکوٹ کے محاذوں کے شہیدوں کی لاشیں جو اُن کے گھروں کو بھیجی جاتی تھیں، وہ انہی سڑکوں سے گزرتی تھیں۔

بھارت نے انہی دونوں سڑکوں پر قبضہ کرنے اور مغربی پاکستان کو دو حصوں میں کاٹنے اور لاہور سیکٹر پر وزیر آباد کی طرف سے یعنی عقب سے حملہ کرنے اور لاہور کے دفاع میں لڑنے والی فوج کو مفلوج کر کے پاکستان کو اپنی جھولی میں ڈال لینے کا خواب دیکھ کر ۶ ستمبر کی صبح حملہ کیا تھا۔ اس پلان کی کامیابی کا بھارت کے فوجی لیڈروں نے بہتّر (۷۲) گھنٹے وقت مقرر کیا تھا۔

بھارت نے بہتّر گھنٹوں میں پاکستان کا کام تمام کر دینے کے لیے اپنی زیادہ سے زیادہ جنگی قوت سرحدوں پر جھونک دی تھی۔ لیکن ایک سو چالیس گھنٹے گزر گئے تھے، بھارت کے سیاسی اور فوجی دیوتاؤں کی ہیبت ناک جنگی قوت سرحد پر ہی لہولہان ہو رہی تھی اور اُن کے شسندر سینے اُن کے اپنے ہی ٹینکوں تلے کچلے گئے اور اپنے ہی توپ خانے کے اُڑائے ہوئے گرد و غبار میں گم ہو گئے تھے۔

جن سڑکوں سے انڈین آرمی کے ٹینکوں کو گزرنا تھا، اُن سڑکوں سے پاک فوج کے شہیدوں کی لاشیں گزر رہی تھیں۔ لوگ اُن پر پھول برسا رہے تھے اور شہیدوں کی روحیں جیسے سڑکوں پر کھڑی قوم سے کہہ رہی تھیں — "جن شاہراہوں سے ہماری لاشیں گزری ہیں ان پر دشمن کا قدم کبھی نہیں پڑے گا۔"

بھارت نے اپنے فضائی بیڑے کے لیے سرحد کے قریب جو ہوائی اڈے بنا رکھے تھے، وہ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے بیکار کر دیئے تھے۔ پٹھانکوٹ کا ہوائی اڈہ تو ۶ ستمبر شام کو ہی پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے اس طرح تباہ کیا تھا کہ وہاں انڈین ایئر فورس کے [illegible] لڑاکا بمبار طیارے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بھی صحیح و سلامت نہیں رہا تھا۔ وہاں ایئر ٹریفک کنٹرول کی عمارت کو بھی تباہ کر دیا گیا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال آدم پور اور ہلواڑہ کے ہوائی اڈوں کا کر دیا گیا تھا۔

انڈین ایئر فورس نے پاک فضائیہ کے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر اپنی طاقت آزمائی تھی لیکن پہلے ہی حملے میں اس کے نو لڑاکا بمبار طیارے پاک شاہبازوں کے ہاتھوں فضا میں ہی پھٹ گئے اور ان کے ٹکڑے سرگودھا کی زمین پر بکھر گئے تھے۔

جنگ ستمبر عروج کو پہنچ رہی تھی۔

★

لیفٹیننٹ اقبال کی بہن شمع گھر والوں کے لیے اچھوت بن گئی تھی۔ کیپٹن طارق نے دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکی کا جاسوسوں کے ساتھ تعلق نہیں ہو سکتا، پھر بھی اُس نے شمع کو اپنے شک میں رکھا تھا۔ وہ شمع کو جتنے دن چاہتا تھانے میں رکھ سکتا تھا لیکن اُس کے باپ پر اُسے رحم آ گیا۔ چوہدری کرامت معزّز آدمی تھا۔ اُس کی عزّت کا خیال کرتے ہُوئے کیپٹن طارق نے شمع کو باپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"اِس لڑکے کو بھی جانے دیں" — تھانیدار نے کیپٹن سے رشید کے متعلق کہا — "اِس قسم کے ہیجڑے کیا جاسوسی کریں گے!"

"نہیں شاہ صاحب!" — کیپٹن نے کہا — "اسے ابھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں جانتا ہوں یہ جاسوس یا تخریب کار نہیں ہو سکتا۔ اس میں اتنا دم کہاں۔ لیکن شاہ صاحب! اسے دو چار دن اپنے پاس رکھ کر اس کا خون خشک کر دو۔ میں اس کی کھوپڑی سے عشق بازی نکالنا چاہتا ہوں۔"

شمع کو باپ اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ شمع کی ماں اور ہاجرہ چوہدری کرامت علی کے کہنے پر کچھ دیر پہلے گھر آ گئی تھیں۔ چوہدری کرامت نے تھانے سے گھر تک شمع کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ شمع چُپ چاپ اُس کے پیچھے پیچھے چلتی آئی۔ اُس کی ماں، چھوٹی بہن اور ہاجرہ اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُس رات گھر میں کوئی نہ سو سکا۔

شمع کو اگر گھر والے مار پیٹ لیتے تو وہ اتنی زیادہ ذہنی یا روحانی اذیّت میں مبتلا نہ ہوتی جتنی وہ ہو رہی تھی۔

"بھول جاؤ کہ تم میری بیٹی ہو" — چوہدری کرامت نے اُسے کہا — "میری مجبوری ہے کہ میں تمہیں اس گھر سے نکال نہیں سکتا۔"

"جا دفع ہو جا" — ماں نے کہا — "یہ منحوس صورت اپنے کمرے میں لے جا" — ماں نے شمع کی چھوٹی بہن سے کہا — "اس ناپاک کے برتن الگ کر دو۔"

"باجی!" — چھوٹی بہن نے دبی دبی سی آواز میں کہا — "کچھ تو شرم کی ہوتی۔"

صرف ہاجرہ رہ گئی تھی جو چپ چاپ کھڑی تھی۔ یہ سب صحن میں کھڑے تھے۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے کوئی بتی نہیں جل رہی تھی۔ پھیکی پھیکی چاندنی تھی جس میں چہرے اچھی طرح نظر نہیں آتے تھے لیکن شمع کو یوں لگ رہا تھا جیسے سورج چمک رہا ہو اور وہ ایک ہجوم کے درمیان کھڑی ہو۔ اُس کے دل پر ایسی گھبراہٹ اور ایسا خوف طاری ہو گیا جیسے یہ ہجوم اُسے سنگسار کر دے گا۔

اُس نے جب ہاجرہ کی طرف دیکھا تو ایک تیر سا اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اُسی دن کی بات ہے کہ چوہدری کرامت نے ہاجرہ سے کہا تھا کہ اُس کے متعلق شکایت ملی ہے کہ وہ افضال کے ہاں جاتی ہے۔ چوہدری کرامت نے تو پیار اور شفقت سے بات کی تھی لیکن شمع نے ہاجرہ پر بڑے ہی ذلیل الزام تھوپ ڈالے تھے اور اُسے بدکار تک کہہ دیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے پاس ایسے الزام کا کوئی ثبوت نہیں، کوئی شہادت نہیں لیکن شمع اس پر الزام عائد کر سکتی تھی کیونکہ وہ مالکن تھی اور ہاجرہ اُس کی نوکرانی تھی۔ ہاجرہ کے پاس آنسوؤں کے سوا اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لیے

کچھ بھی نہ تھا۔

"کیا مجھے اس غریب کی آہ لگی ہے؟" ـــــ شمع نے جب ہاجرہ کی طرف دیکھا تو اُس کے اندر سے ایک آواز اُٹھی۔

اُسے پچھتاوا محسوس ہونے لگا۔ اُس کی ماں رشید کو گالیاں دے رہی تھی۔ اُسے بدکار، غنڈہ اور بدمعاش ثابت کر رہی تھی۔ شمع سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ پلنگ پر اس طرح بیٹھی جیسے گر پڑی ہو۔ اُس پر ایک ہی چوٹ تو نہیں پڑی تھی جسے وہ سہہ لیتی۔ یہ چوٹ کچھ کم نہیں تھی کہ جسے اُس نے دل دیا تھا اور جس کی خاطر اُس نے قسمیں کھائی تھیں اور جس نے اُس کے ساتھ یہ عزم کر رکھا تھا کہ اُسے عدالت میں لے جا کر شادی کرے گا، اُس نے اُسے اس قدر اذیت ناک طریقے سے دھوکہ دیا تھا جیسے اُس سے کسی دشمنی کا انتقام لیا ہو۔ ایک تو رشید اُسے ریلوے لائن پر اکیلا چھوڑ آیا پھر اُس نے تھانے میں یہ جھوٹ بولا کہ وہ اُس کے ساتھ تھی ہی نہیں۔

شمع کی صرف محبت کا خون نہیں ہُوا تھا بلکہ رشید نے اُسے ذلت میں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ تھانے میں ملزم کی حیثیت سے لے جایا جانا ایک باعزت خاندان کی لڑکی کے لیے معمولی حادثہ نہیں تھا۔ لڑکی کو باپ سے پیار ہوتا ہے۔ شمع کو باپ نے دھتکار دیا تھا۔ یہ چوٹ بھی کیا کم تھی کہ اپنی جس نوکرانی کو اُس نے بدکار کہا تھا، اُس نوکرانی نے اُسے تھانے میں دیکھا تھا اور نوکرانی کو پتہ چل گیا تھا کہ شمع کسی آدمی کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ یہ تو کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ رشید کے ساتھ اُس کی محبت پاک تھی۔

کمرہ تاریک تھا۔ شمع لیٹ گئی لیکن یوں اُٹھ بیٹھی جیسے پلنگ پر کانٹے بکھرے ہوئے ہوں۔ یہ کانٹے اس کے وجود میں اُتر گئے اور اُس کی رُوح تک جا پہنچے۔ اُس کی رُوح سے خون رسنے لگا۔ وہ کوئی تجربہ کار اور گھاگھ عورت نہیں تھی۔ اُس کی ذہنیت مجرمانہ بھی نہیں تھی۔ اُس نے جو کچھ کیا جذبات سے مغلوب ہو کر کیا تھا۔ محبت کوئی جرم بھی تو نہیں تھا لیکن جذبات کا خمار اُترا تو شمع اُس حقیقت کا سامنا نہ کر سکی جو اُس کے سامنے آ گئی تھی۔ عمر ابھی نادانی کی تھی۔ جذبات عقل پر غالب آ گئے تھے۔ شمع چالاک لڑکی نہیں تھی۔ اندھیرے کمرے میں اُس کی حالت ڈری ہُوئی بچّی کی سی ہو گئی۔

رات خاموش تھی۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ رات کی خاموشی میں ریل گاڑی کی آواز سنائی دی جو آگے ہی آگے بڑھتی اور بلند ہوتی جا رہی تھی۔ شمع کو یوں ڈر آنے لگا جیسے ریل گاڑی اُس کی طرف آ رہی ہو اور اُسے کچلتی کاٹتی گزر جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد ریل گاڑی پل کھوپل سے گزرنے لگی۔ شمع کا گھر اس پل سے دور نہیں تھا۔ ریل گاڑی کا شور اتنا زیادہ تھا کہ شمع کا دل دہلنے لگا۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی۔ اسے وزیر آباد رُکنا نہیں تھا۔ شمع کے کمرے کے ایک دروازے کے کواڑ اس طرح ہلنے لگے جس طرح زلزلے سے ہلا کرتے ہیں۔

اس سے پہلے شمع نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ریل گاڑی کی رفتار تیز ہو تو ریلوے لائن کے قریب جو گھر ہیں، ان کے کواڑ لرزنے لگتے ہیں۔ اُس رات کواڑوں نے ہلکی ہلکی آواز پیدا کی تو شمع

ڈرنے لگی۔ گاڑی قریب سے گزری تو اتنا شور ہوا کہ شمع اونچی آواز سے بولتی تو اُسے اپنی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ پھر اُسے ایسے لگا جیسے یہ گاڑی اُس کے وجود کے اُوپر سے گزر رہی ہو۔ اُس کا گوشت کٹ رہا ہو۔ ہڈیاں ٹوٹ ٹوٹ کر پس رہی ہوں۔

گاڑی آگے نکل گئی تو دو تین جیٹ بمبار طیارے مہیب زناٹے سے اوپر سے گزر گئے۔ پاک فضائیہ کے یہ طیارے دشمن کے کسی ہوائی اڈے یا کسی فوجی ٹھکانے پر بمباری کر کے واپس آ رہے تھے۔ ان کی بلندی کم تھی۔ دو انجنوں کے ان طیاروں کی آواز شمع کے وجود سے پار ہو رہی تھی۔

شمع کی چیخ نکل چلی تھی۔ اُس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ روک لی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ ریل گاڑی کی آواز ڈراؤنی نہیں تھی نہ طیاروں کی آواز سے وہ کبھی ڈری تھی۔ یہ ایک نفسیاتی ردِّعمل تھا۔ اُس کے ساتھ جو بیتی تھی یہ اُس کا ردِّعمل تھا اور یہ اُس کے ضمیر کا بھی ردِّعمل تھا جس پر ایک جُرم کا خفّت اور پچھتاوے کا بوجھ سوار تھا۔

شمع نے اپنی ماں کے پاس جانا چاہا، پھر باپ کا خیال آیا مگر دونوں اُس کے لیے بیگانے ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اُسے دھتکار دیا تھا۔ اُسے اپنی چھوٹی بہن کا خیال آیا کہ اُسے اپنے پاس بلا لے مگر چھوٹی بہن بھی اُس کی ہمدرد نہیں رہی تھی۔ اُسے بہن کی بڑی تلخ آواز سنائی دی ـــــ

"باجی! کچھ تو شرم کی ہوتی۔"

اور اس ایک خدشے نے تو اُس کی جان نکال دی کہ سارے شہر کو پتہ چل جائے گا کہ رات شمع ایک آدمی کے ساتھ پکڑی گئی تھی اور ماں باپ اُسے تھانے سے گھر لائے تھے۔

"تم جاسوس ہو" ـــــ اُسے کیپٹن طارق کی آوازیں سنائی دینے لگیں ـــــ "تم جاسوس ہو۔"

"نہیں نہیں" ـــــ تاریک کمرے میں اُسے اپنی کانپتی ہُوئی آواز سنائی دی ـــــ "مجھ پر کوئی اور الزام عائد کر دو۔ میں جاسوس نہیں۔"

اُسے وجود کے اندر سے کانٹے چبھنے لگے۔ وہ نجات کے، فرار کے راستے ڈھونڈنے لگی۔

"خودکشی!" ـــــ یہ راستہ بڑا صاف تھا۔ اُس نے غور کیا ـــــ "اپنے پیچھے بڑا گندہ دھبہ چھوڑ جاؤ گی شمع!" ـــــ اُس کے اندر سے آواز اُٹھی ـــــ "خودکشی ثبوت ہو گا کہ تمہارا چال چلن ٹھیک نہیں تھا اور تم رشید کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں پکڑی گئی تھیں۔ لوگ جب اپنے عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جایا کریں گے تو تمہاری قبر دیکھ کر کہا کریں گے کہ یہ ہے اُس بدکار لڑکی کی قبر جس کا باپ شریف اور عزّت دار آدمی ہے ..... نہیں ..... میں اپنے باپ کو بدنام نہیں کروں گی۔"

وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اُس میں عقل بھی تھی۔ اُسے خُدا یاد آیا اور یہ بھی کہ سچّے دل سے توبہ کرو تو خدا نجات کا راستہ دکھا دیتا ہے، لیکن یہاں سوال خُدا کا نہیں خُدا کے بندوں کا تھا۔ خدا تو بخش دیا کرتا ہے خُدا کے بندے نہیں بخشا کرتے۔

"بندوں پر کس طرح ثابت کروں کہ میں گناہگار نہیں؟" ـــــ یہ سوال اُس کے ذہن میں اٹک گیا۔ اُس نے ایک ناول پڑھا تھا جو یونان کی دیومالائی داستان تھی۔ اُسے اس ناول کا ایک کردار

یاد آیا جس کا نام اوڈیپس تھا۔ اوڈیپس نے اپنے باپ کو قتل کر کے اپنی ماں کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اُسے جب اس رشتے کے تقدّس کا احساس ہُوا تو گناہ کے احساس نے اس کے ضمیر کو دبوچ لیا۔ اوڈیپس نے خنجر سے اپنی آنکھیں نکال پھینکیں اور گناہ کا کفّارہ ادا کیا۔

"کفارہ ادا کروں؟" ـــــ شمع کو خیال آیا ـــــ "لیکن کیسے؟ .... باپ کے قدموں میں سر رکھ دوں؟ .... نہیں .... اس سے تو صرف باپ خوش ہوگا۔"

باقی رات اسی سوچ میں گزر گئی کہ وہ کس طرح ثابت کرے کہ وہ گناہگار نہیں۔



جنگ کی ایک اور صبح طلوع ہُوئی۔

محاذوں پر کوئی بھی نہیں سو سکا تھا۔ سونا تو دُور کی بات ہے، کسی کو خیال ہی نہیں آیا تھا کہ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ رات کو سو جایا کرتے ہیں۔ محاذوں پر لڑنے والے تو ۶ ستمبر کی صبح سے جاگ رہے تھے، اور وہ اس لیے جاگ رہے تھے کہ قوم آرام کی نیند سو سکے۔ وہ اپنی نیند ہی نہیں، اپنا خون اور اپنی جانیں بھی قربان کر رہے تھے۔

دشمن کا بڑا حملہ بُری طرح ناکام ہو چکا تھا۔ اب وہ ان ڈویژنوں کو آگے لے آیا تھا جو اس نے یلغار میں جان ڈالنے کے لیے پیچھے رکھے ہُوئے تھے۔ ہمارے دشمن نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ جنہوں نے ایک صدی جنگِ آزادی لڑ کر اور لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر یہ خطہ حاصل کیا ہے جسے وہ پاکستان کہتے ہیں، اس کی آن پر وہ اس طرح مرمٹیں گے کہ اقوامِ عالم دنگ رہ جائیں گی۔

گذشتہ رات پاک بحریہ نے دُور مار توپوں کی گولا باری سے دشمن کا ایک بہت بڑا اور بڑا ہی اہم اڈہ، دوارکا تباہ کر دیا تھا۔ یہ انڈین نیوی کا بارود خانہ تھا اور وہاں اور بھی بہت کچھ تھا۔ دوارکا کی تباہی سے انڈین نیوی کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ دوارکا سومنات کے قریب واقع تھا ـــــ وہ سومنات جس کے بُت غزنی کے بُت شکن نے توڑے تھے۔ یہ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر سترھواں حملہ تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں مسلمانوں نے اٹھارھواں حملہ کیا اور انڈین نیوی کا بُت توڑ ڈالا۔ پاک بحریہ کا قہر دیکھ کر بھارت کے جنگی دیوتاؤں نے انڈین نیوی کے جنگی بحری جہازوں کو بندرگاہوں سے باہر نہ آنے دیا۔

ملّتِ پاکستان اگر سو گئی تو بھی بیدار تھی۔ شمع کا تو رواں رواں بیدار تھا لیکن اُس کی بیداری قوم اور اپنی فوج کی بیداری سے بہت مختلف تھی۔ اذیّت ناک تھی۔ شمع اس صبح کے اُجالے سے ڈر رہی تھی۔ وہ کمرے سے نکلی تو وہ یوں جھینپ اور سُکڑ گئی جیسے بھرے بازار میں اُس کے کپڑے اتار دیئے گئے ہوں۔

"پانی کا ایک گلاس دینا مجھے" ـــــ شمع کو ایک کمرے سے باپ کی آواز سنائی دی۔

باپ کو خوش کرنے کے لیے وہ پانی کا گلاس اُٹھائے باپ کو دینے چلی گئی۔ باپ نے اُسے دیکھا تو باپ کے ہونٹ کانپنے لگے۔

"کسی اور کو دے" ـــــ باپ نے کہا ـــــ "جا، پھر کبھی میرے سامنے نہ آنا۔"

اگر شمع گلاس کو مضبوطی سے پکڑ نہ لیتی تو اُس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتا۔ یہی باپ کل شام

تک اُس کے ساتھ اسی طرح پیار کرتا تھا جیسے وہ ابھی ڈیڑھ دو سال کی بچّی ہو۔ وہ باپ اب اُس سے اتنی نفرت کرنے لگا تھا کہ اُس کے ہاتھ سے پانی پینا بھی اُسے گوارا نہ تھا۔ وہ کمرے سے نکل آئی اور گلاس ہاجرہ کو دے کر کہا کہ ابّا جان کو دے آؤ۔

"جا باورچی خانے میں!" ـــــ ماں کی سخت کرڑی آواز آئی ـــــ "ناشتہ کر لے۔"

اگر ماں اُسے کہتی کہ جا باورچی خانے میں زہر کی پُڑیا رکھی ہے، جا کے کھا لے تو وہ دوڑ کر جاتی اور زہر کھا لیتی لیکن ناشتے میں اُس کے لیے ذرا بھی رغبت اور کشش نہیں تھی۔ وہ صرف اس لیے باورچی خانے میں چلی گئی کہ اُس سے رُوٹھنے کا حق چھین لیا گیا تھا۔ وہ باورچی خانے میں نہ جاتی تو ماں اپنی حکم عدولی کبھی برداشت نہ کرتی۔ ہاجرہ اُس کے پیچھے باورچی خانے میں گئی۔

"شمع بی بی!" ـــــ ہاجرہ نے کہا ـــــ "آپ جائیں، میں چائے گرم کر کے کمرے میں لے آؤں گی۔"

شمع نے ہاجرہ کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے ہاجرہ کو وہ پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ اُس نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ یہ کشمیرن اتنی خوبصورت ہے۔

"ہٹو نا بی بی!" ـــــ ہاجرہ نے اُسے پیار سے ایک طرف کرتے ہُوئے کہا ـــــ "میں تو آپ سے ناراض نہیں ہُوں .... میں ناراض ہو بھی کیسے سکتی ہُوں" ـــــ وہ دودھ کی دیگچی چولہے پر رکھ کر کہنے لگی ـــــ "دل بُرا نہ کریں بی بی جی! خدا ناراض نہیں ہونا چاہیئے" ـــــ ہاجرہ چپ ہو گئی اور شمع کو دیکھنے لگی ـــــ "آپ روتی ہیں شمع بی بی! .... نہ روئیں نا!"

ہاجرہ کی تسلیاں، اُس کی ہمدردی اور اُس کا پیار اُس کی دستگیری نہیں کر سکتا تھا۔ اس گھر کے در و دیوار بھی اُس کے دشمن ہو گئے تھے۔



ہر گھر میں، ہر محفل میں، مسجد میں، گرجے میں، بازاروں میں، بسوں اور ریل گاڑیوں میں لوگ صرف جنگ کی باتیں کرتے تھے۔ ان باتوں میں ڈر اور خوف نہیں جوش اور ولولہ ہوتا تھا۔ کوئی نہیں کہتا تھا کہ جنگ بہت بُری چیز ہے، امن ہونا چاہیئے یا یہ کہ ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ صلح صفائی کی اور پُرامن طریقوں سے تنازعے ختم کرنے کی بات ہونی چاہیئے۔ وہ بوڑھے سابق فوجی بھی جنہوں نے دوسری جنگِ عظیم میں سمندر پار جا کر جنگ کی ہولناکی اور تباہ کاری دیکھی تھی، اس جنگ کے خلاف بات نہیں کرتے تھے جو پاکستان اور ہندوستان لڑ رہے تھے اور جو جنگِ ستمبر کے نام سے تاریخِ پاکستان کا ایک قابلِ فخر اور ایمان افروز باب بن گئی تھی۔

"اب فیصلہ ہو ہی جائے۔"

"لالہ بڑی تیاریاں کر کے آیا ہے، اپنا زور آزما لے۔"

"اٹھارہ سال جی، اٹھارہ سال .... ہم نے اٹھارہ سال برہمن کی دھمکیاں سُنی ہیں۔"

"اٹھارہ سال نہیں جی! سینکڑوں سالوں کی بات ہے۔ پنڈت اُس روز سے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے یا انہیں ہندو بنانے کے جتن کر رہے ہیں جب محمد بن قاسم نے ہندوستان کا پہلا قلعہ توڑا تھا۔"

"جانتے ہو مقابلے کی پوزیشن کیا ہے؟"

"جانتے ہیں جی! ہمارا ایک جوان دشمن کے چھ جوان!"

"اور سرحدوں پر جا کر دیکھو۔ ہمارے شیروں نے مقابلے کی پوزیشن برابر کر لی ہے۔"

"ہم تو اپنا آپ لٹا دیں گے۔"

"قربان کر دیں گے سب کچھ!"

جوش اور جذبہ ایسا جیسے دِق سے مرتے ہوئے مریض بھی صحت یاب ہو گئے ہوں۔ دیہات میں لوگوں نے خاندانی دشمنیاں ختم کر دی تھیں۔ یہی لوگ جو شجاعت اور شہادت کی باتیں کرتے تھے محاذوں پر اپنے جیالے جانبازوں کی شجاعت کے واقعات سُن کر حیران رہ جاتے تھے۔ یہی شجاعت ناقابلِ یقین لگتی تھی کہ دشمن کے ٹینکوں کا مقابلہ انفنٹری کے جوانوں نے کیا اور ٹینکوں کا حملہ پسپا کر دیا۔ تھی یہ بھی حقیقت ہی لیکن لوگ ماننے سے جھجکتے تھے کہ چونڈہ میں دشمن کی بکتر بند اور دیگر نفری پچاس ہزار تھی اور ہماری فوج کی نفری صرف نو ہزار تھی جس نے دشمن کو ایک انچ آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔

پاکستان کے لوگ جب اپنے جوانوں کی شجاعت اور فرض کی دیوانگی کے یہ مافوق الفطرت واقعات سنتے تھے تو اُس توہم پرستی کو سامنے لے آتے تھے جو ہمارے ہاں پیر پرستی، مزار پرستی اور پسماندگی نے پیدا کر رکھی ہے۔ انہوں نے اس قسم کے مفروضے گھڑ لیے کہ لاہور سیکٹر میں آسمان سے سبز پوش مخلوق اُتری تھی۔ اور یہ کہ ایک مسافر سیالکوٹ کے دیہاتی علاقے میں کہیں جا رہا تھا۔ اُسے حضرت علیؓ راستے میں ملے اور کہنے لگے کہ وہ چونڈہ جا رہے ہیں۔ وہاں کفار اتنے ٹینک لے آئے ہیں جن کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستانیوں کے پاس ٹینک بہت تھوڑے ہیں پھر ایسے ہوا کہ دشمن کے جو ٹینک آگے آتے تھے وہ اپنے آپ پھٹ کر جل جاتے تھے۔

لوگوں نے ایک سبز پوش راوی کے دونوں پُلوں کے درمیان بھی کھڑا کر دیا تھا۔ دشمن کے طیارے ان پُلوں کو تباہ کرنے کے لیے بم گراتے تھے تو ——"سبز پوش پھونک مارتا اور بم دریا میں جا گرتے تھے۔"

لوگوں کی سمجھ میں جو کچھ آتا تھا وہ ویسی ہی باتیں کرتے تھے۔ وہ نہیں مانتے تھے کہ دشمن کے ٹینکوں کو تباہ کرنے والے سبز پوش نہیں خاکی پوش ہیں اور جس خاک کی وہ پیداوار ہیں اُس خاک کی حُرمت پر وہ جانیں قربان کر رہے ہیں۔ ان خاکی پوشوں کے پاس کوئی پُراسرار طاقت نہیں تھی، یہ ایمان کی قوت تھی اور خدا اپنے اس فرمان کو پورا کر رہا تھا —"تم میں اگر بیس ایمان والے ہوں گے تو دو سو کفار پر غالب آئیں گے"—— وہ سب کے سب ایمان والے تھے۔

★

عورتیں اپنی گلی میں یا کسی کے گھر اکٹھی ہو جاتیں اور جنگ کی باتیں کرتی تھیں۔ وہ باتوں میں بڑی سنسنی پیدا کر لیتی تھیں۔ بھارتی جاسوسوں کی کہانیاں تو مرد بھی سنتے سناتے تھے جو محض سنی سنائی ہوتی تھیں لیکن عورتیں ان میں اپنا رنگ بھرتی اور ایک دوسری کو سناتی تھیں۔

نوجوان اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی محفلیں الگ جمتی تھیں۔ ایسی تین چار لڑکیاں شمع کے گھر آ جایا کرتی تھیں۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ وہ خدا سے گلہ کرتی تھیں کہ انہیں مرد بنا کر پیدا نہ کیا۔ ان لڑکیوں نے اپنا ایک محاذ

بنا لیا تھا۔ ایک تو وہ فوجیوں کے لیے سویٹریں بُن رہی تھیں دوسرے یہ کہ گھر گھر جا کر کہتی تھیں کہ پاکستان اور پاک افواج کی سلامتی کے لیے گھروں میں ختمِ قرآن کرائیں۔

اُس روز جب شمع گھر والوں کے لیے اچھوت بن گئی تھی اور وہ فرار کے راستے ڈھونڈ رہی تھی، اُس کی دو سہیلیاں اُسے ملنے آئیں۔ شمع انہیں دیکھ کر بہت گھبرائی کہ انہیں بھی پتہ چل چکا ہو گا کہ وہ رشید کے ساتھ پکڑی گئی تھی اور اُسے تھانے لے گئے تھے لیکن لڑکیوں کے کھِلے ہوئے چہرے دیکھ کر اور اُن کی زبان سے حسبِ معمول مذاق کی ایک دو باتیں سن کر اُسے اطمینان ہو گیا کہ انہیں رات کی بات معلوم نہیں۔ شمع کی سہیلیاں جب اکٹھی ہوتی تھیں تو وہ صرف جنگ کی باتیں نہیں کرتی تھیں بلکہ کچھ کرنے کی باتیں کرتی تھیں۔

"میں تو کپڑے اور دفاعی فنڈ کے لیے پیسے اکٹھے کر کر کے تنگ آ گئی ہوں" —— ایک سہیلی نے کہا —"خدا کی قسم! میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ اپنا آپ اپنے ملک پر کس طرح قربان کر دوں۔"

"مجھے تو اپنی یہ جوانی بیکار نظر آتی ہے" —— دوسری سہیلی نے کہا —"اگر یہ جوانی ایک دولہا کے لیے ہی وقف ہے تو میں اس جوانی پر لعنت بھیجتی ہوں۔"

"میں نے ابّو سے کہا تھا کہ مجھے لاہور یا کھاریاں بھیج دیں" —— پہلی سہیلی نے کہا اور آہ لے کر بولی —— "وہ نہیں مانتے۔"

"لاہور یا کھاریاں جا کر کیا کرو گی؟" —— شمع نے پوچھا۔

"محاذوں کے زخمی انہی دو شہروں کے فوجی ہسپتالوں میں آتے ہیں" —— سہیلی نے کہا —"میرے بھائی جان لاہور گئے اور وہ لاہور چھاؤنی کے سی۔ ایم۔ ایچ میں بھی گئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ شہر کی لڑکیاں سی۔ ایم۔ ایچ میں چلی جاتی ہیں اور محاذ کے زخمیوں کی دیکھ بھال بھی کرتی ہیں اور اُن کی خدمت اپنے سگے بھائیوں کی طرح کرتی ہیں۔ بھائی جان بتاتے ہیں کہ شدید زخمی فوجی جو پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہوتے، وہ جب ان لڑکیوں کو اپنی خدمت کرتا دیکھتے ہیں تو اُن میں نیا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ڈاکٹروں سے کہتے ہیں کہ انہیں فوراً محاذ پر بھیج دیا جائے۔"

اس لڑکی نے اپنے بھائی سے سنی ہوئی ساری باتیں اپنی سہیلیوں کو سنا دیں اور کہنے لگی کہ فوجی ہسپتال ایک ایسی جگہ ہے جہاں جا کر ہم اپنی روح کو مطمئن کر سکتی ہیں۔ بہت دیر تینوں سہیلیاں فوجی ہسپتالوں، زخمیوں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والی لڑکیوں کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ شمع کے ہونٹوں پر اپنے دل کا دُکھ آ گیا، لیکن بات ایسی تھی کہ وہ اُسے زبان پر نہ لاتی۔ اُس کے اندر غبار بھر گیا تھا جسے وہ نکالنا چاہتی تھی لیکن اس میں جرم کا جو عنصر تھا وہ اُسے بولنے نہیں دیتا تھا۔ اُس نے بناوٹی ہنسی اور مسکراہٹوں سے رات کی واردات پر پردہ ڈالے رکھا۔ اُس نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔

★

رشید ابھی تھانے میں تھا۔ کیپٹن طارق نے رات کو ہی اُسے حوالات میں بند کرا دیا تھا۔ حوالات میں تین آدمی بند تھے۔ ان میں ایک نیم پاگل سا آدمی تھا اور دوسرے دو چوری اور جیب تراشی کے عادی مجرم تھے۔ اب دونوں ایک اور واردات میں پکڑے گئے تھے۔ حوالات میں سگریٹ پینے کی بھی اجازت نہیں

ہوتی لیکن یہ دونوں حوالات میں سگریٹوں میں چرس بھر کر پیتے رہتے تھے۔ تھانے والوں نے انہیں یہ خصوصی سہولت دے رکھی تھی۔ ان دونوں نے اور تیسرے نیم پاگل حوالاتی نے ساری رات "علی حیدر" کے نعرے لگا لگا کر رشید کو سونے نہ دیا۔ ایک تو اُن کی شکلیں ڈراؤنی تھیں، دوسرے وہ رشید کو اوٹ پٹانگ باتیں سنا سنا کر ڈراتے بھی رہے۔

"کیپٹن طارق صاحب!" — صبح کے وقت تھانیدار نے کیپٹن سے ہنس ہنس کر کہا — "آپ کا جاسوس تو رو رو کر بُرا حال کر رہا ہے۔ جا کر دیکھیں، وہ کس طرح سلاخوں کے ساتھ چپکا ہوا بچوں کی طرح رو رہا ہے اور سنتری کی منتیں کرتا ہے کہ اُسے حوالات سے نکال دے .... جانے دیں کیپٹن طارق صاحب!"

"آج کا دن اسے یہیں رہنے دو" — کیپٹن طارق نے کہا — "شام کو چھوڑ دیں گے۔ میں اس کی ایسی حالت کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ اپنے یاروں دوستوں سے بھی جا کر کہے کہ کسی سے محبت نہ کرنا"۔

رشید اُن نوجوانوں میں سے تھا جو سینما گھروں کی چھاؤں میں پل کر جوان ہوتے ہیں اور جن کے کردار اور قومی وقار کو پاکستان اور بھارت کے فلمساز فلمی گیتوں کی لوریاں دے دے کر سُلاتے رکھتے ہیں پھر کردار اور قومی وقار نیند میں ہی دم توڑ جاتے ہیں۔ ان نوجوانوں کی نظریں اُن سرحدوں پر لگی رہتی ہیں جو اُن کے اور سڑکوں پر گھومنے پھرنے والی لڑکیوں کے درمیان حائل ہوتی ہیں۔ قوم کے یہ نونہال تصوّروں میں یہ سرحدیں پھاند جاتے ہیں اور اپنی مردانگی کا رس نچوڑتے رہتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے کالجوں کے سامنے منڈلاتے پھرتے ہیں۔ کاغذوں کے یہ گھوڑے ذہنی عیاشی کے بحرِ ظلمات میں کود جاتے ہیں۔ اُن کی نظروں میں اپنے پرائے کی اور اپنی اور پرائی بہنوں کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ پاکستان میں رہتے ہوئے لاعز اور مری سے یہ لڑکے امریکن بن جاتے ہیں۔ ان کے جسموں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ذرا سی ٹھنڈ ہو تو انہیں نزلہ اور زکام ہو جاتا ہے اور دھوپ ذرا سی تیز ہو جائے تو انہیں بخار چڑھ جاتا ہے۔

رشید اس نوجوان طبقے کا بڑا اچھا نمونہ تھا۔ چھ ستمبر کے پہلے دھماکے کے ساتھ ہی قوم کے یہ نونہال بھٹکتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر شاہراہِ پاکستان پر آ گئے۔ پہلا دھماکہ اُن کے لیے خضرِ راہ ثابت ہُوا۔ اُن کے خون میں صدیوں پرانی جو روایات رچی بسی چلی آ رہی تھیں، اُس چشمے کی طرح اُبل آئیں جس پر کسی نے آوارہ خیالی اور ذہنی لذت پرستی کے پتھر رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہی چھچھورے اور فیشن کے مارے ہوئے لڑکے جو فلموں کے ہیرو بنے پھرتے تھے، ہر اُس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ سمجھتے تھے کہ اُن کی ضرورت ہے۔

قوم کے ان نونہالوں نے ثابت کر دیا کہ — "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!" — قوم نے تو انہیں دل سے اتار دیا تھا۔ یہ لڑکے کسی کام کے نہیں رہ گئے تھے اور یہ پاکستان کے پاسبان کہلانے کے قابل نہیں تھے، لیکن جنگِ ستمبر کے ابتدائی دنوں میں سیالکوٹ کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے ایسا مظاہرہ کیا کہ لوگوں نے ان کے متعلق اپنی رائے بدل لی۔ سیالکوٹ کے ٹرنک بازار میں رات کے وقت بھارت کے بمبار طیاروں نے بم گرائے۔ یہ طیارے رات کی بمباری کے لیے آئے تھے اور ان کا ٹارگیٹ یقیناً سیالکوٹ کا ٹرنک بازار نہیں تھا۔ اُن کا ٹارگیٹ پاک فوج کے اگلے مورچے ہو سکتا تھا لیکن طیارہ شکن گنوں سے بچنے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ شہری آبادی پر بم گرا دیتے اور واپس جا کر رپورٹ دیتے کہ وہ پاک فوج کے اگلے مورچے تباہ کر آئے ہیں۔

ٹرنک بازار سے ملحق گنجان آبادی تھی۔ بمباری سے کئی مکان گر پڑے اور ان میں رہنے والے ملبے تلے دب گئے۔ لوگ ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ کسی کو ہوش نہ تھا کہ وہ لوگوں کو روک کر کہتا کہ ملبے سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالنا ہے۔ اس کام کے لیے جو پہنچے وہ یہی دُبلے پتلے، امریکن ازم، ٹیڈی اِزم اور فلمی گیتوں کے مارے ہوئے تھے۔ ان میں انہی جیسی نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ انہوں نے تباہ شدہ مکانوں کا ملبہ بڑی تیزی سے ہٹانا شروع کر دیا۔ ملبے سے لاشیں نکلیں اور زخمی بھی۔ زخمیوں کو بروقت نکال لینے سے ان کی جانیں بچ گئیں۔

ان نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔ جن بالوں کو وہ ہر وقت سنوار کر رکھتے تھے، اُن پر مٹی جم گئی تھی۔ یہ اُن کی کوششیں تھیں کہ کئی زخمیوں کو فوراً ہسپتال پہنچا دیا گیا اور اُنہیں بچا لیا گیا۔

لاہور سیکٹر میں تو ان نوجوانوں نے وہاں کے ڈویژن کمانڈر کے لیے مشکل پیدا کر دی تھی۔ وہ فوجی کمانڈروں سے کہتے تھے کہ اُنہیں آگے بھیجا جائے، لیکن وہ جنگ تھی، کوئی کھیل نہیں تھا۔ اُنہیں آگے نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ ڈویژن کمانڈر نے انہیں کہا کہ ٹرک سامان سے بھرے ہوئے آتے ہیں اور ان سے سامان اتارنے کے لیے کوئی نہیں ہوتا۔ ڈویژن کمانڈر نے لڑکوں سے کہا کہ وہ ٹرکوں سے سامان اتار دیا کریں۔

پھر بھی رشید جیسے کچھ نوجوان تھے جو اپنے پراگندہ ذہنوں کے غلام ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم سے تعلق توڑ رکھا تھا۔ اِن پر شک کیا جا سکتا تھا کہ جاسوس ہیں لیکن اِن میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں تھی۔ البتہ انہیں غدّار کہنا غلط نہ تھا۔ غدّار انہی لوگوں میں سے ہوتے ہیں جو اپنی خواہشات اور ذہنی آوارگی کے غلام ہوتے ہیں۔

کیپٹن طارق حوالات کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ رشید نے ہاتھ جوڑ کر اور رو رو کر اُسے کہا کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔

"آپ میرے جسم سے جتنا خون نکالنا چاہیں نکال لیں" — رشید نے کہا — "اور فوجیوں کو دیں"۔

"تمہارے خون میں ملاوٹ ہے" — کیپٹن طارق نے کہا — "تم جیسے نوجوان سرحدوں پر پہنچے ہوئے ہیں اور تم یہاں فلمی محبت کے ڈرامے کر رہے ہو"۔

"اب نہیں کروں گا" — رشید نے روتے ہوئے کہا — "مجھے آپ جو حکم دیں گے پورا کروں گا"۔

"شاہ صاحب!" — کیپٹن نے دفتر میں آ کر تھانیدار سے کہا — "آج رات کو کسی وقت اسے چھوڑ دیں گے .... اور آج ایک کام کرنا ہے۔ اپنے تمام مخبروں کو بلا لیں۔ ابھی ابھی فون پر مجھے بتایا گیا ہے کہ وزیر آباد بڑا حسّاس مقام بن گیا ہے۔ میرے شعبے نے وائرلیس پر کوڈ الفاظ میں کوئی پیغام سنے ہیں۔ یہ سرحد پار سے پاکستان میں کسی کو دیتے جا رہے ہیں۔ خیال یہی ظاہر کیا جاتا ہے کہ جنہیں یہ پیغام دیتے جا رہے ہیں وہ وزیر آباد کے اندر یا مضافات میں ہیں"۔

"میرے لیے جو حکم ہے، مجھے وہ بتائیں" — تھانیدار نے کہا۔

"ہماری انٹیلی جنس وزیر آباد کو اپنی نگرانی اور گرفت میں لے رہی ہے" — کیپٹن نے کہا — "میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ہمارے انتظامات کیا ہیں۔ میں آپ کے انتظامات استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے تمام مخبروں کو بلا لیں"۔

"ابھی آتے ہیں" — تھانیدار نے کہا۔

★

یہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ ابھی گرمی تھی۔ لوگ صحنوں اور چھتوں پر سوتے تھے۔ شمع کی حویلی خاصی بڑی تھی اور اس کا صحن کشادہ تھا۔ شمع نے سارا دن کمرے میں گذار دیا تھا۔ اُس کی ذہنی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اُس نے سہیلیوں کے ساتھ باتیں کی تھیں۔ وہ چلی گئیں تو شمع کمرے میں جا کر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ گھر کے کسی فرد نے اُس کے ساتھ بات نہیں کی تھی۔ یہ دن اُس کی زندگی کا سب سے زیادہ لمبا دن تھا۔

سورج غروب ہو گیا تھا اور شام تیزی سے تاریک ہو رہی تھی۔ لوگ شام سے پہلے پہلے کھانا پکانا اور دیگر کام ختم کر لیتے تھے کیونکہ شام کے بعد بتی نہیں جلائی جا سکتی تھی۔

ہاجرہ نے صحن میں چارپائیاں رکھ کر سب کے بستر بچھا دیتے تھے۔ سب اپنے اپنے بستر پر آ گئے۔ کسی نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ اس گھر میں تو ماتم کا سماں تھا۔ ایک تو ان کا جوان اور اکلوتہ بیٹا محاذ پر تھا اور اب بیٹی نے یہ گُل کھلایا تھا۔ شمع کی ماں نے ہاجرہ سے سرگوشی میں کہا کہ شمع سے کہے کہ کمرے سے نکل آئے اور لیٹ جائے۔

"بی بی جی!" — ہاجرہ نے شمع کے کمرے سے آکر شمع کی ماں سے کہا — "شمع بی بی کمرے میں نہیں ہیں"۔

"غسل خانے میں ہو گی" — ماں نے کہا — "جا دیکھ"۔

شمع کہیں بھی نہیں تھی۔ اوپر جا کے دیکھا۔ تمام کمروں میں دیکھا۔ ماں اور شمع کی چھوٹی بہن شمع کی سہیلیوں کے گھروں میں باری باری گئیں شمع کہیں نہ ملی۔ ماں نے سر پیٹ لیا۔ باپ کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"امّی!" — شمع کی چھوٹی بہن نے کہا — "شیدے کے ساتھ نہ چلی گئی ہو۔ ابّو سے کہیں وہاں سے پتہ کر لیں"۔

چوہدری کرامت سے شمع کی ماں نے کہا کہ شیدے کے گھر سے پوچھے۔

"کیا میں وہاں جا کر یہ کہوں کہ میری بیٹی تمہارے بیٹے کے ساتھ چلی گئی ہے؟" — چوہدری کرامت نے کہا — "میں اپنی بے عزتی اور رسوائی کہاں تک برداشت کروں گا!"

"تھانے چلے جائیں" — شمع کی ماں نے کہا۔

"تم نہیں جانتیں میں اُسے تھانے سے لایا کس طرح تھا" — چوہدری کرامت نے کہا — "وہ کیپٹن کہتا تھا کہ یہ بدبخت لڑکی جاسوس ہے۔ اب اُسے بتاؤں گا کہ وہ لاپتہ ہو گئی ہے تو وہ یقین سے کہے گا کہ تمہاری بیٹی ہے ہی جاسوس اور جاسوسی کے سلسلے میں غائب ہوئی ہے"۔

"تو کیا ہم چُپ کر کے بیٹھ جائیں؟" — ماں نے کہا اور اُس نے رونا شروع کر دیا۔

"ہاں!" — چوہدری کرامت نے کہا — "چُپ کر کے لیٹ جاؤ اور بھول جاؤ کہ وہ ہماری بیٹی ہے" — اُس نے سوچ کر کہا — "صبح تک دیکھ لو"۔

رات خاموشی سے گذرتی جا رہی تھی۔ شمع کے گھر وقت جیسے رُک گیا تھا۔ ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔



رات کے دس بج رہے تھے۔ کھاریاں چھاؤنی تاریکی اور خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف ایک جگہ تھی جہاں سرگرمی اور بھاگ دوڑ تھی۔ یہ کھاریاں کا فوجی ہسپتال تھا۔ اپریشن تھیٹر میں بے پناہ سرگرمی تھی۔ اس عمارت کی فضا خون اور دوائیوں کی بُو سے بوجھل تھی۔ محاذ کے زخمیوں کے وارڈوں میں زندگی کی گہما گہمی تھی۔ کبھی کبھی کوئی زخمی "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگاتا تھا۔ "یا علیؓ" کا اکا دکا نعرہ بھی گرجتا تھا۔

وارڈ کے اندر نرسیں، نرسنگ اردلی اور شہری لڑکیاں زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ وارڈ زخمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ اپریشن تھیٹر کا یہ عالم تھا کہ باہر بھی سٹریچر پڑے تھے جن پر زخمی لیٹے ہوئے تھے۔ برآمدوں میں ہسپتال کے سٹاف کے علاوہ بہت سے لوگ موجود تھے۔

ہر وارڈ کے ساتھ نرسوں کا ایک ایک کمرہ تھا۔ ایسے تمام کمروں میں روشنی تھی۔ کھڑکیوں، دروازوں اور روشندانوں کے شیشوں پر سیاہ رنگ کے موٹے کاغذ لگے ہوتے تھے۔ ایسے ایک کمرے میں ملٹری نرسنگ سروس کی ایک کیپٹن ابھی ابھی آکے بیٹھی تھی۔ اُس کی وردی پر خون کے کئی دھبے تھے۔ کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے۔ اُس کے بال بے ترتیب تھے اور چہرے پر تھکن کے گہرے آثار تھے۔ وہ ۶ ستمبر سے یہیں تھی۔ اُسے یونیفارم بدلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ مسلسل تین دن اور تین راتیں اپریشن تھیٹر میں رہی تھی۔ محاذوں سے زخمی آنے شروع ہوئے تو آتے ہی چلے جا رہے تھے۔ محاذوں پر انہیں صرف فسٹ ایڈ ملی تھی۔ صحیح مرہم پٹی چھاؤنی کے ہسپتال میں ہوتی تھی۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ہسپتال میں جڑتی تھیں۔

نرسنگ سروس کی کیپٹن عصمت ابھی ابھی کمرے میں آکر بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شب بیداری کا خمار تھا۔ اُسے ایک سٹاف نرس نے بتایا کہ ایک جوان لڑکی گھنٹے ڈیڑھ سے اُس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔

"کون ہے؟" — کیپٹن عصمت نے پوچھا — "کیا کہتی ہے؟ اس کا فوج میں کوئی ہوگا"۔

"نہیں" — سٹاف نرس نے جواب دیا — "وزیر آباد سے آئی ہے۔ شمع نام بتاتی ہے۔ بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ کہتی ہے میں زخمیوں کی خدمت کے لیے آئی ہوں لیکن کسی افسر سے میرا ملنا بہت ضروری ہے۔ بات کرتی ہے تو اس کے آنسو نکل آتے ہیں"۔

"لوگ ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں" — کیپٹن عصمت نے کہا — "نوجوان لڑکیوں میں یہ جذبہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ امیروں کی بیٹیاں اور کالجوں کی لڑکیاں تو بالکل ہی گمراہ ہو گئی تھیں۔ اللہ نے انہیں بیدار کر دیا ہے لیکن اتنا جذباتی ہو جانا بھی ٹھیک نہیں"۔

"انہیں گائیڈ کرنے والا کوئی نہیں" — سٹاف نرس نے کہا — "گمراہ کرنے والے بہت ہیں"۔

"اُسے میرے پاس بھیج دو" — کیپٹن عصمت نے جمائی لے کر کہا — "مجھے اپریشن تھیٹر میں جانا ہے"۔



ایک بڑی خوبصورت لڑکی کمرے میں آئی۔ کیپٹن عصمت اس لڑکی سے کم خوبصورت نہیں تھی اور وہ اس لڑکی جیسی جوان بھی تھی۔

"آؤ شمع!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "اس کرسی پر بیٹھ جاؤ .... وزیر آباد سے آئی ہو؟"

"ہاں!" — شمع نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا — "میں تمہارے کسی افسر سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا ایک مسئلہ ہے"۔

"میں تمہیں افسر نہیں لگتی؟" — کیپٹن عصمت نے مسکرا کر کہا — "میں نرسوں کی افسر ہوں۔ میں کیپٹن ہوں ...... کیپٹن عصمت .... کہو کیا بات ہے؟"

"واقعی میں آپ کو افسر نہیں سمجھتی تھی" — شمع نے کہا — "افسر بڑی عمر کے آدمی ہوتے ہیں۔ آپ تو شاید میری عمر کی ہوں گی!"

"فوج میں چھوٹی عمر کے افسر بھی ہوتے ہیں" — کیپٹن عصمت نے کہا — "لیفٹیننٹ، کیپٹن عموماً نوجوان ہوتے ہیں"۔

"یہ تو میں جانتی ہوں" — شمع نے کہا — "میرا بھائی بھی لیفٹیننٹ ہے۔ ابھی سکینڈ لیفٹیننٹ ہے"۔

"کہاں ہے؟" — کیپٹن عصمت نے پوچھا — "کون سی رجمنٹ میں ہے؟"

"ایسٹ بنگال رجمنٹ میں!" — شمع نے جواب دیا — "لاہور کے محاذ پر کسی جگہ ہے۔ ابھی تک اُس کی کوئی خبر نہیں ملی"۔

"تم شاید اُسے ہسپتالوں میں ڈھونڈتی پھر رہی ہو" — کیپٹن عصمت نے کہا۔

"نہیں" — شمع بولی — "اُسے تو ہم نے اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ میری بات کچھ اور ہے"۔

"کیا نام ہے تمہارے بھائی کا؟"

"اقبال!" — شمع نے جواب دیا — "محمد اقبال"۔

"اقبال؟" — کیپٹن عصمت چونک پڑی اور شمع کی طرف جھک کر بولی — "اقبال .... وزیر آباد کا رہنے والا .... تم اُس کی بہن ہو؟ تمہارے والد صاحب کا نام چوہدری کرامت علی ہے نا! .... ہاں، وہی اقبال .... میں اُس کے ساتھ لاہور گورنمنٹ کالج میں پڑھتی تھی" — کیپٹن عصمت نے اپنی جیب سے کچھ نکالا۔ یہ باریک پلاسٹک کا چار ساڑھے چار انچ لمبا اور تین انچ کے لگ بھگ چوڑا فولڈر سا تھا۔ اس میں سے اُس نے اپنا فوجی شناختی کارڈ نکالا اور اس فولڈر میں سے ایک پاسپورٹ سائز فوٹو نکال کر شمع کو دکھایا اور پوچھا — "یہ اقبال؟"

"ہاں ہاں!" — شمع نے اشتیاق سے کہا — "یہ میرے بھائی جان کا فوٹو ہے۔ اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی ہے .... آپ نے یہ فوٹو کیوں اپنے پاس رکھا ہُوا ہے؟"

"یہ بھلا پوچھنے والی بات ہے؟" — کیپٹن عصمت نے ایسے لہجے میں کہا جو کیپٹن اور میجر کا لہجہ نہیں ہوتا۔ عصمت اب شمع کی طرح جوان لڑکی تھی، کیپٹن نہیں تھی۔ جذباتی سے لہجے میں بولی — "ہم اکٹھے پڑھتے تھے" — کیپٹن عصمت نے نظریں اقبال کے فوٹو پر مرکوز کر کے جذباتی سی سرگوشی میں کہا — "ہم اب بھی اکٹھے ہی ہیں"۔

"میں سمجھ گئی ہوں" — شمع نے کہا اور اُس نے سر جھکا لیا۔

"کیا بات ہے شمع؟"

"میں نے بھی کسی کا فوٹو اسی طرح اپنے پاس رکھا تھا" — شمع نے بوجھل آواز میں کہا — "لیکن اس محبت نے مجھے ....!" شمع کی آواز بھرا گئی۔ گھونٹ سا نگل کے بولی — "میں دُھتکاری ہوئی لڑکی ہوں۔ اقبال بھائی جان تو آپ سے وفا کریں گے مگر مجھے دھوکہ ہُوا ہے .... میں تو خودکشی کے ارادے

سے گھر سے نکلی تھی"۔

سٹاف نرس کمرے میں آئی۔ اُس کے چہرے پر بھی شب بیداری اور تھکن کے گہرے سائے تھے۔ اب وہ پریشان بھی لگتی تھی۔ وہ دھڑام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے رومال نکالا اور پھیلا کر آنکھوں پر رکھ لیا — وہ رو رہی تھی۔

"کیا ہُوا سٹاف!" — کیپٹن عصمت نے اُس سے پوچھا — "کوئی زخمی شہید ہو گیا ہے؟"

سٹاف نرس نے اپنی آنکھوں سے رومال ہٹائے بغیر سر ہلایا کہ نہیں، کوئی شہید نہیں ہُوا۔

"پھر کیا ہُوا؟"

"وہی مشکل!" — سٹاف نرس نے آنسو پونچھ کر کہا — "زخمی جوان محاذوں پر واپس جانے کی ضد کرتے ہیں۔ اِس وارڈ میں تین جوان ہیں۔ اُنہوں نے تو مجھے اور نرسوں کو پریشان کر دیا ہے .... آپ نعرے نہیں سُن رہیں؟ ... یہ اُن تینوں کے نعرے ہیں۔ دو نائک ہیں اور ایک سپاہی ہے۔ سپاہی کے دائیں بازو کی ہڈی دو جگہوں سے ٹوٹی ہوئی ہے اور گرنیڈ کے دو ٹکڑے اُس کے سینے پر لگے تھے۔ ایک سے تو زخم آیا ہے اور دوسرے ٹکڑے نے ایک پسلی کو نقصان پہنچایا ہے .... اور یہ جو دو نائک ہیں، ان کے زخم ایک جیسے ہیں۔ دونوں کی ہنسلیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور دونوں کی دائیں ٹانگوں کی ہڈیاں گھٹنوں کے نیچے سے ٹوٹی ہوئی ہیں۔ تینوں کی ہڈیاں ٹھیک جُڑی ہیں اور پلاسٹر چڑھا دیتے گئے ہیں۔ کل شام پلاسٹر چڑھاتے گئے تھے"۔

"اب کہتے ہیں کہ ہمیں محاذوں پر بھیجو؟" — کیپٹن عصمت نے پوچھا۔

"یہ تو تمام زخمی کہتے ہیں کہ مرہم پٹی کرو اور ہمیں جانے دو" — سٹاف نرس نے کہا — "لیکن اِن تینوں نے کل شام سے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں تو اسی پر حیران ہوں کہ اتنا زیادہ خون نکل جانے سے اور اتنے گہرے زخموں کے باوجود وہ پوری طرح ہوش میں ہیں .... جو نرس ان کا ٹمپریچر اور بلڈ پریشر دیکھنے جاتی ہے اُسے یہ تینوں تنگ کرتے ہیں کہ سی۔ ایم۔ ایچ کے کمانڈنٹ کو بلاؤ، ہم یہاں نہیں رہیں گے ....

"میں آج چار پانچ بار اُن کے پاس جا چکی ہوں اور اُنہیں سمجھایا ہے لیکن وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ تم نے ہماری ہڈیاں جوڑ دی ہیں اور پٹیاں باندھ دی ہیں۔ تم لوگوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دوست آگے لڑ رہے ہیں اور کٹ رہے ہیں۔ تم نہیں جانتیں آگے کیا حال ہو رہا ہے۔ دشمن کی طاقت اور نفری بہت زیادہ ہے۔ یہ تو ٹینکوں اور انسانوں کا مقابلہ ہے سسٹر صاحبہ! آپ نہیں جانتیں۔ آپ ہم پر ظلم کر رہی ہیں۔ ہم یہاں لیٹے رہے تو معلوم نہیں آگے کیا ہو جائے۔ ہم ہسپتال میں لیٹنے کے لیے فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے ....

"میں انہیں کہتی ہوں کہ تمہاری ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سوال پاکستان کا ہے ہماری ہڈیوں کا نہیں۔ پاکستان ہی نہ رہا تو ہم اپنی ہڈیاں جوڑ کر کیا کریں گے! ہمیں جانے دو۔ ہم اپنے دوستوں سے دھوکہ کر رہے ہیں۔ ہم اُن کے ساتھ مرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں مورچوں میں جا کر مرنے دو" — بولتے بولتے سٹاف نرس کو ہچکی سی آئی اور اُس نے پھر رومال اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

"انہیں ایک ایک انجکشن دے دو" — کیپٹن عصمت نے انجکشن کا نام بتا کر سٹاف نرس سے کہا — "جس

قوم کے جوانوں میں یہ جذبہ ہو اُسے کون شکست دے سکتا ہے!"

"لیکن .... لیکن اتنا جذبہ؟ — سٹاف نرس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا — "کن ماؤں کے یہ بیٹے ہیں؟ کن بہنوں کے یہ بھائی ہیں؟ انہیں اپنی جان کی پرواہ نہیں، اتنی زیادہ تکلیف میں یہ اپنی ماؤں کو، اپنے باپوں اور اپنے عزیزوں کو یاد نہیں کرتے۔ یہ نہیں کہتے کہ ان کے گھروں کو اطلاع دی جائے۔"

ان دو نائیکوں اور ایک جوان کے جذبۂ حُبّ الوطنی کا یہ طریقِ اظہار کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ زخمیوں کو محاذوں سے پیچھے لانا ایک مسئلہ تھا۔ وہ پیچھے آنے سے انکار کر دیتے تھے۔ اُن کا جذبہ جنون کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ جو فوجی ہسپتال محاذوں کے قریب تھے وہاں تو زخمی ہسپتالوں کے سٹاف کو تنگ کیے رکھتے تھے کہ انہیں آگے بھیجا جائے۔ لاہور سیکٹر کے دو زخمی رات کو ہسپتال سے بھاگ گئے اور اپنی بٹالین سے جا ملے تھے۔

یہی وہ جذبہ تھا جس نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں لاہور کو بچا لیا تھا ورنہ جنگوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں کہ اکیس ایسے ڈویژنوں کا حملہ جن کے پاس ہزاروں توپیں اور ٹینک ہوں اور جو جدید ہتھیاروں سے لیس ہوں اور جن کے پاس پھونکنے اور ضائع کرنے کے لیے ایمونیشن کے انبار ہوں اور جنہیں فضائی سپورٹ دینے کے لیے لڑاکا بمبار طیاروں کی بھی کمی نہ ہو، صرف پانچ ڈویژنوں نے نہ صرف روک لیا ہو بلکہ پسپا کر کے دشمن کا سارا پلان تباہ کر دیا ہو۔

یہ اُس جذبے کا کرشمہ تھا جسے جذبۂ ستمبر کے نام سے تاریخ پاکستان کے ایک درخشاں باب کا عنوان بننا تھا — اُس باب کا عنوان جو قوم کے سر بکف جانبازوں نے اپنے خون سے لکھا تھا۔



"میں ان جانبازوں کی خدمت کرنے آئی ہوں" — شمع نے کہا۔

"وارڈوں میں دیکھا نہیں تم نے؟" — کیپٹن عصمت نے کہا — "تم جیسی بہت سی لڑکیاں رضاکارانہ طور پر آئی ہوئی ہیں۔ کئی لڑکیاں گجرات سے آئی ہیں۔ شاید وزیرآباد کی بھی ہوں" — ذرا سوچ کر اُس نے کہا — "جتنے دن یہاں رہو گی میرے پاس ٹھہرنا۔ تم اقبال کی بہن ہو شمع .... اور اقبال...."

اُس نے نظریں اقبال کے فوٹو پر جما دیں۔

"میری ایک پریشانی ہے عصمت صاحبہ!"

"مجھے عصمت صاحبہ نہ کہو شمع!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "عصمت کہو۔ اقبال مجھے عصمی کہا کرتا تھا۔"

"ہاں عصمت!" — شمع ہلکے سے تبسم سے بولی — "میری پریشانی یہ ہے کہ میں گھر والوں کو بتا کر نہیں آئی۔ میں گھر سے بھاگ آئی ہوں۔"

"بتا دیتیں تو کیا وہ تمہیں نہ آنے دیتے؟"

"یہ معاملہ کچھ اور ہے عصمت!" — شمع نے کہا — "میرا رشتہ ایک لیفٹیننٹ کو دیا جا رہا ہے۔

مجھے یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔ ایک اس لیے کہ مجھے فوجی ویسے ہی اچھے نہیں لگتے تھے، دوسرے اس لیے کہ میں کسی اور کو چاہتی تھی۔"

"تم نے اُس لیفٹیننٹ کو دیکھا ہو گا؟"

"نہیں" — شمع نے جواب دیا — "اُس کی ماں اور بڑی بہن آئی تھیں۔ میں نے ماں سے کہا تھا کہ میں اُس کے ساتھ شادی کروں گی جسے میں چاہتی ہوں۔ وہ وزیرآباد کا رہنے والا ہے۔ اُس کے ماں باپ نے اُس کے لیے میرا رشتہ مانگا تھا لیکن میرے ابو اور امی نے انہیں صاف جواب دے دیا تھا۔ میں نے اور اُس نے گھر سے بھاگ جانے اور کورٹ میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم ملتے ملاتے رہے مگر جو بات مجھے اپنے ماں باپ سمجھا رہے تھے وہ میں سمجھ نہیں رہی تھی۔ وہ خدا نے مجھے ایسے طریقے سے سمجھائی کہ میں گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔"

"اُس کی شادی کہیں اور کر دی گئی ہے؟"

"نہیں عصمت!" — شمع نے بڑی لمبی آہ بھر کر کہا — "وہ بزدل نکلا۔ اُس نے ثابت کر دیا کہ اُس میں مردانگی نام کو نہیں۔ ہوا یوں کہ ...." شمع نے کیپٹن عصمت کو سارا واقعہ سنا دیا کہ وہ کس طرح ریلوے لائن پر پکڑی گئی اور اُسے تھانے سے کس طرح رہائی ملی۔ ایک ہی دن میں گھر میں اُس کے ساتھ ماں باپ نے جو رویّہ رکھا اور اُس نے جو کچھ محسوس کیا وہ بھی سنایا۔ اُس کے آنسو بہتے رہے اور وہ سناتی رہی۔

"میرے سامنے دو راستے تھے" — شمع نے کیپٹن عصمت کو سنایا — "خودکشی کر لوں یا کسی طرح ثابت کروں کہ میں بُرے چال چلن کی لڑکی نہیں۔ صرف تم ہو عصمت، جس کے ساتھ میں یہ باتیں کر رہی ہوں۔ یہ باتیں تو میں نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ بھی نہیں کی تھیں۔ میرا ہمدرد کوئی بھی نہیں۔ اُس کمینے رشید کا خیال آتا ہے تو خون کھولنے لگتا ہے۔ تھانے کا اور اپنے باپ کی عزت کا خیال آتا ہے تو گناہ کا احساس شرمسار کرتا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں شمع!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "میں سمجھتی ہوں تمہیں تو پاگل ہو جانا چاہیے تھا۔ اس صورتِ حال میں اور اس ذہنی کیفیت میں خودکشی ہی نجات کا راستہ دکھائی دیتا ہے۔"

"میں خودکشی کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی" — شمع نے کہا — "باہر آئی اور ریلوے لائن کی طرف چل پڑی مگر یہ خیال آ گیا کہ میں تو اس دنیا سے اُٹھ جاؤں گی، میرا باپ اور میرا سارا خاندان بدنام ہو جائے گا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کروں۔ تم تو کہتی ہو کہ مجھے پاگل ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں پاگل ہو چکی تھی۔ میں گھر سے خودکشی کے ارادے سے نکلی تھی لیکن راستے میں دیکھا کہ یہ ہاتھ میں چھوٹا سا پرس تھا" — اُس نے یہ پرس کیپٹن عصمت کو دکھاتے ہوئے کہا — "اس میں کچھ پیسے پڑے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے خدا مجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔"

"ہاں شمع!" — عصمت نے کہا — "بات کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ تمہارا ذہن دو حصوں میں [illegible] گیا تھا۔ ایک حصہ تمہیں موت کی طرف [illegible] دوسرا [illegible] کی طرف۔ یہ خدائی اشارہ [illegible] کہ تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔"

"قریب ہی سڑک تھی" ___ شمع نے کہا ___ "ایک مسافر بس رُکی کھڑی تھی جس کا مُنہ کھاریاں کی طرف تھا۔ دن کو مجھے سہیلیاں سناتی رہی تھیں کہ ہم جیسی نوجوان لڑکیاں فوجی ہسپتالوں میں جا کر زخمی فوجیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یہ سوچ تو مجھے پہلے بھی آئی تھی کہ میں گُناہ کا کفارہ ادا کروں۔ میں نے کبھی اکیلے سفر نہیں کیا تھا لیکن میں نے اپنے لیے ایسی صُورت حال پیدا کر لی تھی کہ مجھے مرنا بھی اکیلے تھا اور جینا بھی اکیلے ہی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کھاریاں چھاؤنی کے سی۔ ایم۔ ایچ میں بھی فوجی زخمی ہو کر آتے ہیں۔ میں اس طرح بس کی طرف چل پڑی کہ میں چلتی بھی تھی اور رکتی بھی تھی۔ میں اسی کیفیت میں بس میں جا گھسی اور بس نے مجھے کھاریاں پہنچا دیا۔۔۔۔

"بس والوں نے مجھے سڑک پر اتار دیا اور بس چلی گئی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ میں تاریک ویرانے میں کھڑی ہوں اور مجھے معلوم ہی نہیں کہ سی۔ ایم۔ ایچ کہاں ہے اور جی۔ ٹی روڈ سے کتنی دُور ہے۔ میں تن تنہا کھڑی تھی۔ کوئی میری طرف آ رہا تھا۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ وہ قریب آیا تو دیکھا کہ وہ فوجی تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں کھڑی ہوں، میں نے اُسے کہا کہ میرا بھائی زخمی ہو کر یہاں سی۔ ایم۔ ایچ میں آیا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ سی۔ ایم۔ ایچ کس طرف ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ فوراً مان جائے گا لیکن مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ فوجی کتنے محتاط ہوتے ہیں۔ اُس نے مجھ سے ایسے ایسے سوال پوچھے کہ میں چکرا گئی۔ اُسے شک تو اس بات پر ہو رہا تھا کہ میں اس وقت اکیلی کس طرح آئی ہوں"

"یہ بھی تمہاری خوش نصیبی ہے شمع!" ___ عصمت نے کہا ___ "وہ ملٹری پولیس کا آدمی تھا جو تمہیں ملا تھا۔ وہ اپنا شک رفع کرنے کے لیے تمہیں اپنے افسروں کے پاس بھیج سکتا تھا۔ یہ رات تو تمہاری جانچ پڑتال میں ہی گزر جاتی۔ تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ آج کل زخمی فوجیوں کے متعلق ہر کوئی ضرورت سے زیادہ جذباتی ہے۔ ملٹری پولیس کا یہ جوان بھی جذبات میں آ گیا ہوگا کہ تم ایک زخمی فوجی کی بہن ہو"

"جذبات کے علاوہ میرا جھوٹ کام کر گیا تھا" ___ شمع نے کہا ___ "وہ پوچھتا تھا کہ اس وقت تم اکیلی کیوں آئی ہو۔ میں رو پڑی۔ میں نے کہا کہ میری امّی اور میرے ابّا جان دن کو آ گئے تھے۔ وہ مجھے ساتھ نہیں لانا چاہتے تھے۔ مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں اکیلی بس میں بیٹھی اور آ گئی۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہُوا کہ میں تو یہاں بھائی کی محبت کی ماری ہُوئی آ گئی ہوں۔ اب کہاں جاؤں؟ یہ کہہ کر میں اور زیادہ روئی۔ میرا رونا بناوٹی نہیں تھا۔ اُس پر ایسا اثر ہوا کہ اُس نے مجھے کہا کہ تھوڑی سی دیر ٹھہر جاؤ۔ ہماری ایک گاڑی آ رہی ہے۔ اُس پر تمہیں بھیج دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ایک فوجی گاڑی باہر سے آئی جو اندر آ رہی تھی۔ اسے روک کر اُس فوجی نے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے سی۔ ایم۔ ایچ میں اتار دے۔ اس طرح میں یہاں پہنچ گئی"

"یہ خیال رکھنا شمع!" ___ کیپٹن عصمت نے کہا ___ "اگر کسی فوجی افسر کے ساتھ کبھی تمہاری ملاقات ہو گئی تو اُسے یہ نہ بتانا کہ تمہیں ملٹری پولیس والے نے اس طرح سی۔ ایم۔ ایچ تک پہنچایا تھا"

"کیوں؟" ___ شمع نے پوچھا ___ "ایسی احتیاط کیوں؟"

"اُسے پوری چھان بین کرنی چاہیے تھی" ___ عصمت نے جواب دیا ___ "تمہارا رونا تو بناوٹی نہیں تھا لیکن جاسوس لڑکیوں کا رونا بھی قدرتی لگتا ہے۔ جنگ کے دوران ملٹری پولیس والوں کو اور کسی بھی فوجی کو کسی لڑکی کے آنسوؤں سے اتنی جلدی متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ تمہاری جگہ اگر جاسوسوں کے گروہ کی کوئی لڑکی ہوتی تو معلوم نہیں وہ ہماری فوج کو کیسا نقصان پہنچا جاتی۔ جاسوس لڑکیاں تمہاری طرح خوبصورت ہوتی ہیں۔۔۔۔ بہرحال تم یہاں آ گئی ہو۔ اب بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

"میرا مسئلہ یہ ہے" ___ شمع نے کہا ___ "کہ میرے گھر اطلاع پہنچ جائے کہ میں یہاں ہوں۔ میں اس مقصد کے لیے یہاں آئی ہوں"

"تمہارے گھر میں یا پڑوس میں کسی کا ٹیلیفون ہے؟"

"نہیں" ___ شمع نے جواب دیا ___ "آپ اگر فون کر سکتی ہیں تو تھانے میں ایک کیپٹن طارق ہے۔ انہیں کہیں کہ میرے والد صاحب کو بتا دیں"

"ہاں" ___ عصمت نے کہا ___ "میں یہ کر سکتی ہُوں"

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کیپٹن طارق کو تم اچھی طرح سمجھا دو کہ میرے جذبات کیا ہیں؟" ___ شمع نے کہا ___ "کیپٹن طارق نے ہم پر بڑا احسان کیا تھا۔ اگر وہ تھانے میں نہ ہوتا تو تھانیدار معلوم نہیں ہمیں کتنا خراب کرتا"

"شمع!" ___ کیپٹن عصمت نے کہا ___ "میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہُوں کیونکہ تم اقبال کی بہن ہو، ورنہ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہاری اتنی لمبی کہانی سن سکتی۔ میں تین چار دنوں اور راتوں سے اپریشن تھیٹر میں ہوں۔ میرا ایک ایک لمحہ ان زخمیوں کے لیے وقف ہے۔ میری حالت شاید تم دیکھ رہی ہو۔ جسمانی تھکان الگ ہے اور جذباتی کیفیت الگ ہے۔ ان زخمیوں کا جوش اور ان کا ولولہ دیکھتی ہوں تو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ شاف نرس کو تم نے روتے دیکھا تھا۔ میری حالت بھی ایسی ہی ہے۔۔۔۔ اور وزیر آباد فون کرنے کا تو میرے پاس وقت ہی نہیں۔ اپریٹر سے کہہ کر نمبر بک کرانا پڑے گا۔ یہ میں صرف تمہارے لیے کر رہی ہوں"

"اقبال بھائی جان کو تم اس قدر چاہتی ہو؟"

"شاید اس سے بھی زیادہ" ___ عصمت نے کہا ___ "اقبال شہزادہ ہے۔ تمہارا خاندان خاصا امیر کبیر معلوم ہوتا ہے" ___ وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی ___ "اقبال ہے شیطان! لڑکیوں کا ناک میں دم کیے رکھتا تھا۔ کالج سے نکالا بھی اسی لیے گیا تھا لیکن وہ ہمیشہ میرا رہا اور میرا ہی رہے گا۔ اُس کے ساتھ میری خط و کتابت رہی ہے۔ اگر جنگ شروع نہ ہو جاتی تو میں تمہاری بھابی بن چکی ہوتی" ___ وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی ___ "میں ابھی فون کرنے کی کوشش کرتی ہوں"

تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا تو کیپٹن عصمت آئی۔ شمع کُرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

"بات ہو گئی ہے شمع!" ___ عصمت نے کہا ___ "کیپٹن طارق فون پر مل گیا تھا۔ میں نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ اُس نے مجھے تمہارے متعلق وہی بات سنائی ہے جو تم مجھے پہلے ہی سنا

چکی تھیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اُس نے تمہارے مجنوں رشید کو ابھی تک حوالات میں بند کیا ہوا ہے..... میں تمہیں سٹاف نرس کے حوالے کر دیتی ہوں۔ وہ تمہیں میرے کمرے میں پہنچا دے گی۔ صبح تم یہیں آجانا۔"

"کل صبح میرے ابو پہنچ جائیں گے" ـــــ شمع نے کہا ـــــ "اُن کے سامنے تم میرا ساتھ دینا۔"

★

"میں نہیں جاؤں گا" ـــــ وزیرآباد میں شمع کا باپ اُس کی ماں سے کہہ رہا تھا ـــــ "میرے لیے وہ مر گئی ہے۔"

کیپٹن طارق کو کیپٹن عصمت کا فون ملا تو اس نے بات کر کے ایک کانسٹیبل کو چوہدری کرامت کو بلالانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ شمع کے گھر سب جاگ رہے تھے اور فضا ماتم کی سی بنی ہوئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو چوہدری کرامت دوڑا گیا اور اس اُمید پر دروازہ کھولا کہ شمع آئی ہوگی۔ شمع کی ماں اور چھوٹی بہن بھی دوڑی گئیں اور دروازے کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں۔

"تھانے سے آیا ہوں چوہدری صاحب!" ـــــ کانسٹیبل نے کہا ـــــ "آپ کو تھانے میں طلب کیا گیا ہے۔"

چوہدری کرامت کو یُوں لگا جیسے انڈین ایئر فورس کے طیّارے نے اُس کے گھر پر بم گرایا ہو۔ اُس نے کواڑ کا سہارا لے لیا۔

"ہماری بیٹی تھانے میں ہے؟" ـــــ شمع کی ماں نے پُوچھا۔

"میں نے تو نہیں دیکھی جی!" ـــــ کانسٹیبل نے کہا ـــــ "شاید نہیں۔ وہاں ہوتی تو مجھے ضرور پتہ ہوتا..... آجائیں چوہدری جی!"

چوہدری کرامت اس طرح تھانے تک گیا تھا جیسے کوئی نیند میں یا نیم غشی کی حالت میں چلتا ہے۔ کیپٹن طارق نے اُسے بٹھایا اور بتایا کہ اُس کی بیٹی کھاریاں چھاؤنی میں سی۔ ایم۔ ایچ میں ہے۔ کیپٹن نے اُسے یہ بھی بتایا کہ وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُسے کس سے اطلاع ملی ہے اور اُس نے چوہدری کرامت کو تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔

چوہدری کرامت کے بوجھ میں کچھ کمی آگئی تھی لیکن اپنی بیٹی کی یہ حرکت کہ وہ بتائے بغیر چلی گئی تھی، بہت بُری لگی تھی۔ گھر آکر اُس نے بتایا کہ شمع کہاں ہے۔ شمع کی ماں نے کہا تھا کہ ابھی چلے جائیں یا صبح چلے جائیں اور اُسے لے آئیں۔

"میں نہیں جاؤں گا" ـــــ چوہدری کرامت نے کہا ـــــ "میرے لیے وہ مر گئی ہے۔ اُس کے لیے اس گھر کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔"

چوہدری کرامت نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ شمع کو دیکھنے نہیں جائے گا۔ اُس نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنی بیٹی کے لیے گھر کے دروازے بند کر دیئے تھے لیکن رات کو خیالوں کا جو ریلا آیا وہ اُسے اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ وہ باپ تھا۔ شمع اُس کی گود میں کھیلی تھی۔ شمع بڑی پیاری بچّی ہُوا کرتی تھی۔ چوہدری کرامت دن بھر کا تھکا ماندہ شام کو گھر آکر لیٹتا تو یہ بچّی اُس کے پیٹ پر کُودا کرتی تھی۔ چوہدری کرامت کو اس بچّی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ وہ اس بچّی کی ہر ضد اور ہر فرمائش پوری کیا کرتا اور اس کی معصوم سی شرارتوں پر قہقہے لگایا کرتا تھا۔

شمع جوان ہو گئی تھی مگر اُس کی اپنی ضد پر قائم رہنے کی عادت پختہ ہو گئی تھی۔ پہلے تو وہ اپنے ایک چاہنے والے کے ساتھ پکڑی گئی تھی لیکن اب وہ ایسی جگہ چلی گئی تھی جس پر کوئی بھی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری کرامت کو یہ شکایت تھی کہ وہ اُس سے پوچھ کر نہیں گئی تھی۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ چوہدری کرامت کا ذہن کبھی تو بالکل خالی ہو جاتا اور تھوڑی ہی دیر بعد سوچوں اور خیالوں کے جھکڑ سے چلنے لگتے۔ چوہدری کرامت اپنے آپ کو ڈولتا ڈگمگاتا محسوس کرتا۔ غصے سے اُس کا وجُود تپ جاتا، پھر غصہ اپنے آپ ہی سرد پڑ جاتا اور وہ دکھ کی ہلکی سی ٹیس محسُوس کرتا۔

"خدا دے تو بیٹی نہ دے" ـــــ اُس کی آہ نکل گئی۔

"اب آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیئے" ـــــ چوہدری کرامت کو کیپٹن طارق کی آواز سنائی دی۔ کچھ ہی وقت پہلے کیپٹن طارق تھانے میں چوہدری کرامت سے کہہ رہا تھا ـــــ "وہ محاذ کے زخمیوں کی خدمت کے لیے گئی ہے..... آپ فکر نہ کریں چوہدری صاحب! اب وہ آپ کا نام ڈبونے نہیں اس نام کو روشن کرنے گئی ہے..... کھاریاں چھاؤنی میں جا کر اُسے دیکھ آئیں۔ اس کام میں اُس کی حوصلہ افزائی کریں۔"

چوہدری کرامت کو یاد آیا کہ لیفٹیننٹ اقبال بھی اُس سے پوچھے بغیر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اُسے اپنا بیٹا یاد آیا تو اُسے پاکستان یاد آگیا۔ ذہن اُسے ۱۹۴۶/۴۷ء کے دَور میں لے گیا۔ وہ بھی ایک جنگ تھی جس میں چوہدری کرامت خود شریک تھا۔ وہ جہادِ آزادی کا غازی تھا۔ اُسے وہ نعرے یاد آئے جنہوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے اسلام دشمن اتحاد میں شگاف ڈال دیے تھے۔

وزیرآباد کی تاریک فضا ایک گونج سے مرتعش ہونے لگی اور فوراً بعد دل دہلا دینے والی گرج سے فضا کانپ اٹھی۔ پاک فضائیہ کے دو مبار طیّارے بڑی کم بلندی پر اُڑتے ہوا کی رفتار سے وزیرآباد کے اُوپر سے گزر گئے تھے۔ چوہدری کرامت اُٹھ بیٹھا۔ طیّارے دُور چلے گئے تھے۔ اُن کا ہولناک زنّاٹہ دبی دبی گونج بن گیا تھا اور یہ گونج رات کی تیرگی میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی لیکن چوہدری کرامت کا

وجود یوں لرز رہا تھا جیسے اُس کے سینے میں طیّارے اُڑ رہے ہوں یا جیسے وہ ان طیّاروں کے پیچھے اُڑ جانا چاہتا ہو۔

"کیوں؟"— اُسے اپنے گھر کی تاریکی میں قریب سے آواز سنائی دی —"جہازوں کی آواز سے آنکھ کُھل گئی ہے؟"

"ہوں"— اُس کے منہ سے جیسے بے خیالی میں آہ نکل گئی ہو۔ جذبات کے رعشہ پر اُس نے قابو پا لیا اور تھکی تھکی آواز میں بولا —"میری تو آنکھ لگی ہی نہیں۔ اس لڑکی نے ....."

"دل کو ایسا پتھر بھی نہ کریں"— اُس کی بیوی نے کہا جو ساتھ والی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی —"آپ کو اگر یقین آگیا ہے کہ وہ فوجی ہسپتال میں زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کے لیے چلی گئی ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔ ہمارا بیٹا بھی فوجی ہے۔ وہ بھی کسی روز..." ماں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

چوہدری کرامت جیسے اسی انتظار میں تھا کہ اُس کی بیوی ایک بار پھر اسے کہے کہ وہ اپنی بیٹی کو دیکھنے کھاریاں جائے۔ وہ غصے میں اعلان کر چکا تھا —"میرے لیے وہ مر گئی ہے"— اُس کی مردانہ انا مان نہیں رہی تھی کہ اس اعلان کے بعد وہ اپنے آپ چل پڑے۔

"لیکن میں اُسے اپنے ساتھ لے نہیں آؤں گا"— اُس نے کہا۔

"نہ لانا"— اس کی بیوی نے کہا —"اُسے دیکھ تو آؤ۔ مل آؤ اُسے۔ یہ بھی دیکھ لینا کہ اُس کے رہنے سہنے کا انتظام کیا ہے"— اُس نے چوہدری کرامت کے قریب ہو کر سرگوشی میں پوچھا —"اُس حرام کی اولاد رشیدے کو آپ نے کہیں دیکھا ہے؟ سنا ہے لڑکے بھی فوجی ہسپتالوں میں کام کرنے چلے گئے ہیں"۔

"وہ حوالات میں بند ہے"— چوہدری کرامت نے کہا —"میں نے کیپٹن طارق سے پوچھا تھا۔ اُسے ابھی نہیں چھوڑیں گے"۔

"میں تو کہتی ہوں اُسے پھانسی دے دیں"— شمع کی ماں نے کہا —"آپ صبح کھاریاں چلے جائیں"— وہ آہ بھر کر بولی —"اللہ بیڑہ غرق کرے ان ہندوؤں کا۔ میں نے نذر مانی ہے کہ جنگ ختم ہوتے ہی شمع کی شادی کر دیں گے.... لڑکا بھی آگے ہی ہوگا کہیں؟ اللہ اُسے زندہ اور سلامت رکھے۔ ہمارے اقبال کی طرح لیفٹیننٹ ہے۔ معلوم نہیں وہ کون سے محاذ پر ہوگا۔ اُدھر جنگ ختم ہوئی اِدھر میں انہیں پیغام بھیج دوں گی کہ آ کر نکاح کر لیں۔ پھر رخصتی بھی جلدی کر دیں گے.... معلوم نہیں ہماری بیٹی کو یہ رشتہ کیوں پسند نہیں"۔

"اگر شمع لڑکے کو دیکھ لیتی تو اس نامراد رشیدے کو بھول جاتی"— شمع کے باپ نے کہا —"ہمارا زمانہ کچھ اور تھا۔ آج کی نسل کے دماغ تو کالجوں اور انگریزی نے خراب کر دیئے ہیں۔ میں ان باتوں کا قائل تو نہیں تھا لیکن زمانے کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ موقع پیدا کر کے شمع کو لڑکا دکھا دیں گے"۔

"ہو سکتا ہے"— شمع کی ماں نے کہا —"موقع پیدا کرنا کیا مشکل ہے.... آپ کھاریاں سے ہو آئیں"۔



کھاریاں کے فوجی ہسپتال میں محاذوں جیسی سرگرمی اور بھاگ دوڑ تھی۔ ایمبولینس گاڑیوں اور دوسری گاڑیوں پر بھی زخمی چلے آ رہے تھے۔ یہ سب شدید زخمی تھے۔ یہ جسڑ، چونڈہ اور سیالکوٹ کے محاذوں سے آ رہے تھے۔ اصل جنگ تو چونڈہ کے محاذ پر لڑی جا رہی تھی جہاں دشمن نے اپنی پوری کی پوری بکتر بند قوّت جھونک دی تھی۔ یہ اُس کا بکتر بند ڈویژن تھا جس میں پہلے روز چھ سو ٹینک تھے اور فائر بندی تک دشمن نے ایک ہزار سے زائد ٹینک چونڈہ کے میدان میں استعمال کیے تھے۔ بکتر بند ڈویژن اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ مونٹین اور انفنٹری ڈویژن بھی تھے۔ توپ خانے اور مارٹر بیٹریوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔ ان سب کے علاوہ دشمن کے بکتر بند ڈویژن کو روس، فرانس اور برطانیہ کے دیئے ہوئے جدید لڑاکا بمبار طیّاروں کا چھاتہ حاصل تھا۔ یہ طیّارے پاک فوج کے اگلے مورچوں پر آگ برساتے رہتے تھے۔

اس ہیبت ناک جنگی قوّت کے مقابلے میں اِدھر صرف ڈیڑھ سو ٹینک تھے جو کم ہوتے گئے۔ ان میں اضافہ نہیں ہوا۔ پاکستان کے بادشاہوں نے جو اٹھارہ برسوں میں ایک دوسرے کے بعد تخت نشین ہوئے تھے۔ اپنی جنگی طاقت میں اضافے کی کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے تخت و تاج کے تحفّظ کے لیے ملک کے ذرائع اور وسائل کو استعمال کرتے رہے تھے۔ اُن کا دشمن سرحد پار نہیں سرحد کے اندر تھا۔ وہ اپنے سیاسی مخالفین کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور اس دشمن کے قلع قمع میں مصروف رہتے تھے۔ ان بادشاہوں کی دوسری سرگرمیاں تقریر اور بیان بازی تک محدود تھیں، اور وہ اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کے دَوروں میں شب و روز کا چکر پورا کر رہے تھے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام اور پاکستان کا دشمن اپنے ملک کو اسلحہ و بارُود خانہ بناتا چلا جا رہا ہے وہ سن رہے تھے کہ دشمن پاکستان کو ختم کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اُس کی دھمکیاں گیدڑ بھبکیاں نہیں بلکہ یہ اُس کے عزائم ہیں جن پر وہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے عمل کر رہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندو قیادت نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور پاکستان کو وہ ہندوستان کا نہیں بلکہ مہا بھارت کا حصہ کہہ رہا ہے۔ وہ ہندو قیادت کے اس دعوے سے بھی ناواقف نہیں تھے کہ ہندوستان مہا بھارت ہے جس میں انڈونیشیا سے لے کر دجلہ و فرات تک کے علاقے شامل ہیں اور افغانستان بھی مہا بھارت میں شامل ہے۔

ہمارے بادشاہ جانتے تھے۔ اقتدار کے پجاری سب کچھ جانتے تھے لیکن ان کی دو مجبوریاں تھیں۔ ایک یہ کہ ملک و ملّت اور مذہب کے دشمن کی طرف توجہ دینے سے کرسی سے توجہ ہٹتی تھی جس سے کرسی کو خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ دوسری مجبوری یہ تھی کہ انہوں نے امریکہ کو اَن داتا بنا لیا تھا اور قومی وقار، قومی پالیسیاں اور خودارادیّت گروی رکھ کر قوم کا بال بال امریکہ کے قرضے میں جکڑ دیا تھا۔ ملّتِ پاکستان اپنے دشمن کو دشمن کہنے میں اور اپنے ملک کے دفاع میں بھی آزاد نہیں رہی تھی۔ پاکستان اپنے قدرتی وسائل اور اپنی زمین سے معدنیات نکالنے میں بھی آزاد نہیں رہ گیا تھا۔ ملک کے دفاع کا انحصار اُن چند ایک ہتھیاروں پر تھا جو امریکہ نے دیئے تھے۔

بھارت کی حکومت اپنا دفاعی بجٹ بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کا بجٹ وہی تھا جو کبھی ابتدا میں منظور کیا گیا تھا۔ اپنے خزانے میں تھا ہی کیا۔ مملکت کے بادشاہوں

اور وزیروں کے دَورے۔ ان کے جشن، دیگر عیاشیاں۔ خوشامدیوں کے نقد انعامات اور کرپشن، ملک کا پیسہ پیسہ چاٹ رہی تھی۔ دفاع کے لیے پیسہ کہاں سے آتا!

ستمبر ۱۹۶۵ء کی سترہ روز جنگ میں کئی محاذوں پر دشمن کے جدید ٹینکوں کے مقابلے میں قدیم شرمن ٹینک لڑے تھے جن کے انجن چلتے چلتے رُک جاتے اور ٹینک توپ خانے کی توپ بن کر رہ جاتے تھے۔

فوج کی نفری کا یہ تناسب تھا کہ دشمن کے اکیس ڈویژنوں کا حملہ روکنے کے لیے پاکستان کے پاس پورے پانچ ڈویژن بھی نہیں تھے۔

اسلحہ اور ایمونیشن کی کمی کو۔ دیگر جنگی ساز و سامان اور نفری کی کمی کو خاکی وردی میں ملبوس اُن انسانوں کے خون سے اور اُن کی جانوں سے پورا کیا جا رہا تھا جن کے ووٹوں سے بادشاہوں نے اقتدار کی کرسی حاصل کی تھی۔

عوام کے بیٹے قربان ہو رہے تھے اور لیکچر یہ دیئے جا رہے تھے کہ مسلمان ہر میدان میں تھوڑے رہے ہیں۔ بدر کی مثالیں دی جا رہی تھیں لیکن یہ نہیں بتایا جا رہا تھا کہ اُس وقت مسلمان تھے ہی اتنے کچھ۔ اُن کی آبادی آٹھ دس کروڑ نہیں تھی۔ یہ بھی نہیں بتایا جا رہا تھا کہ ان تین سو تیرہ سرفروشوں کے قائدین نے اپنے آپ کو غیر ملکی امداد کا محتاج نہیں بنایا تھا اور انہوں نے کسی ملک سے قرضے بھی نہیں لیے تھے۔ وہ قوم کے جذبوں سے کھیلنے والے نہیں تھے۔

چودہ سو سال بعد، ستمبر ۱۹۶۵ء میں قوم اپنے حکمرانوں کی عیاشیوں اور کوتاہیوں کی پیدا کی ہوئی کمی اور کمزوریوں کو اپنی جان اور اپنے لہو کے نذرانے دے کر پورا کر رہی تھی۔

★

شمع کا باپ چوہدری کرامت علی جب کھاریاں چھاؤنی کے سی۔ ایم۔ ایچ میں داخل ہوا تو قوم کے دیئے ہوئے نذرانے ایمبولینس گاڑیوں اور دوسری گاڑیوں میں چلے ہی آ رہے تھے۔ ان کی خاکی وردیاں گہرے سُرخ رنگ کی ہو گئی تھیں۔ ہسپتال کے برآمدوں اور وارڈوں میں نرسیں، نرسنگ سپاہی، کالجوں کے طلباء طالبات اور دیگر نوجوان بھاگ دوڑ رہے تھے۔ فضا خون کی بُو سے بوجھل تھی۔ زخمیوں میں ایسے بھی تھے جو بازوؤں، ٹانگوں یا آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکے تھے۔

چوہدری کرامت برآمدے میں آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ سب اتنے مصروف تھے کہ وہ کسی کو روک کر اپنی بیٹی کے متعلق پوچھنے سے جھجک رہا تھا۔ اُسے اس ہجوم میں ایک نرس آتی نظر آئی جو ذرا آہستہ چل رہی تھی۔

"ذرا سننا سسٹر!" — اُس نے نرس کو روک کر کہا — "میری بیٹی وزیر آباد سے آئی ہے۔ وہ نرسوں کا ہاتھ بٹانے آئی ہے۔ اُس کا نام شمع ہے۔ آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہو گی؟"

"یہاں سب آپ کی بیٹیاں ہیں" — نرس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا — "ہم صرف زخمیوں کو پہچانتی ہیں۔ ایک دوسری کو دیکھنے کا ہوش کہاں ہے۔ وارڈوں میں گھوم پھر کر دیکھ لیں" — اور نرس تھکی تھکی سی چال چلتی آگے نکل گئی۔

"ابّا جان!" — اچانک چوہدری کرامت کو مانوس آواز سنائی دی۔

اُس کی بیٹی شمع اُس کے پہلو کی طرف سے آئی اور اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ چوہدری کرامت نے دیکھا، شمع کے کپڑوں پر خون کے دھبّے تھے اور اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چوہدری کرامت کا ہاتھ اپنے آپ شمع کے سر پر چلا گیا۔

"تم بتا کر نہیں آئیں" — چوہدری کرامت نے کہا۔

"میں نے فون کرا دیا تھا" — شمع نے دُکھیاری سی آواز سے کہا — "یہاں نرسوں کی ایک کیپٹن ہے...... کیپٹن عصمت...... اقبال بھائی کو جانتی ہے۔ کالج میں ان کی کلاس فیلو تھی۔ اتفاق سے مل گئی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ وزیر آباد تھانے میں کیپٹن طارق کو فون کر دے اور وہ آپ کو اطلاع دے دے گا۔"

"تم نے یہاں آ کر بُرا تو نہیں کیا" — چوہدری کرامت نے ایسے انداز سے کہا جس میں شفقت تھی — "مجھے بتا دیتیں تو میں تمہیں روک تو نہ لیتا۔ خود تمہارے ساتھ آ جاتا۔"

"آپ سے پوچھنے کی جرأت نہ کر سکی تھی ابّا جان!" — شمع نے کہا — "اور یہ ڈر بھی تھا کہ آپ مجھے گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دیں گے۔"

"پھر بھی" — چوہدری کرامت نے کہا — "بتا کر آنا بہتر تھا۔"

★

برآمدے میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر کوئی دوڑنے کی رفتار سے چلتا تھا۔ وہاں کھڑے رہ کر باتیں کرنا بڑا مشکل تھا۔ شمع اپنے باپ کو برآمدے سے نکال کر لان میں لے گئی۔ وہاں بعض زخمیوں کے لواحقین اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔ شمع اور اُس کا باپ لان کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ شمع اپنے آپ میں تغیّر سا محسوس کر رہی تھی۔ اُس میں جرأت پیدا ہو گئی تھی۔

"ابّا جان!" — اُس نے بڑی لمبی آہ بھری اور بولی — "میں اُن سب سے رشتہ توڑ کر گھر سے نکلی تھی جنہیں بتا کر گھر سے نکلنا ضروری تھا۔ مجھ سے ایک لغزش ہوئی تھی، گناہگار تو میں پھر بھی نہیں تھی لیکن کسی لڑکے کے ساتھ ایک جوان لڑکی کا رات کو باہر نکل جانا ایک گناہ ہی ہوتا ہے" — وہ چپ ہو گئی۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ ان پر قابو پانے کے لیے اُس نے نیچے والے ہونٹ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اُس نے کچھ دیر بعد بھرّائی ہوئی آواز سے کہا — "میں نے وہ گناہ نہیں کیا جس کے گناہگاروں کو سنگسار کر دیا جانا چاہیئے...... میں کنواری ہوں ابّا جان! میری عصمت محفوظ ہے۔"

"بھول جاؤ اسے بیٹی!" — شمع کے باپ نے کہا — "اس عمر میں عجیب عجیب غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

"مگر بخشتا کوئی نہیں ابّا جان!" — شمع نے کہا — "خدا معاف کر دیتا ہے۔ خدا کے بندے معاف نہیں کرتے...... میں گھر میں اچھوت بن گئی تھی۔ ماں نے مجھے طعنے دیئے۔ چھوٹی بہن نے مجھے کہا، آپا شرم کرو۔ نوکرانی نے مجھے نصیحتیں کیں...... اور آپ نے میرے ہاتھ سے پانی قبول نہ کیا اور کہا کہ کسی اور کو بھیجو۔ مجھ سے تو وہ نوکرانی اچھی ہے جس کے ہاتھ سے آپ نے پانی پی لیا تھا۔"

"شمع بیٹی!" — چوہدری کرامت نے بڑے پیار سے کہا — "تمہارے سینے میں جو کچھ بھی ہے

جتنا غبار رُکا ہُوا ہے نکال دو۔ میں سنوں گا لیکن ایک بات میری بھی سُن لو۔ تم نے اور تمہاری ماں نے ہاجرہ پر بدچلنی کا الزام لگایا تھا اور تم نے اُسے ایسی ایسی باتیں کہہ دی تھیں جو وہ مجرم بھی برداشت نہیں کر سکتے جو اپنے جرم کا اقبال کر لیا کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں وہ معصوم ہے، بے قصور ہے۔ اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ جوان ہے، خوبصورت ہے اور وہ نوکرانی ہے۔... غریب کی آہ سے بچو بیٹی!

میں نے اپنی اتنی زیادہ عمر میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ آگے چل کر یہ سب کچھ تم بھی دیکھو گی.... جو بول نہیں سکتا اُسے یہ نہ کہو کہ وہ کچھ محسوس نہیں کر سکتا۔ جذبات اور احساسات اُس کے بھی ہوتے ہیں جو گونگا اور بہرہ ہوتا ہے۔ ہم مجبور اور مقہور کی زبان بند کر سکتے ہیں، اُس کی آہوں اور خاموش فریادوں کو نہیں روک سکتے۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھ پر ہاجرہ کی آہ پڑی ہے؟" ــــ شمع نے پوچھا۔

"ہاں بیٹی!" ــــ چوہدری کرامت نے کہا ــــ "میں یہی کہنا چاہتا ہوں میں تمہیں یہی سمجھانا چاہتا تھا لیکن.....اب کہو، تم کیا کہہ رہی تھیں!"

"مجھے اپنی غلطی کا احساس اُس وقت ہُوا تھا جب اُس لڑکے نے تھانے میں کہا تھا کہ میں اُس کے ساتھ تھی ہی نہیں" ــــ شمع نے کہا ــــ "میں نے اُسے اپنے دل سے دھتکار دیا تھا لیکن آپ نے مجھے دھتکار دیا۔ میں تو گھر سے اپنے اس وجود کو جس کے لیے باپ کا پیار ختم ہو گیا تھا ختم کرنے نکلی تھی اللہ کو کچھ اور منظور تھا ورنہ اس وقت آپ ریل گاڑی سے کٹی ہُوئی میری لاش کا جنازہ پڑھ رہے ہوتے.... گھر سے نکل کر کچھ ایسا خیال آیا جو میرا اپنا نہیں تھا۔ یہ خداوند تعالیٰ نے مجھے روشنی دکھائی تھی۔ میں تو کہتی ہوں کہ خدا نے نہ صرف یہ کہ مجھے بخش دیا ہے بلکہ مجھے روشنی دکھا کر اُس راستے پر ڈال دیا ہے جس پر میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر سکتی ہُوں۔"

شمع نے باپ کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کھاریاں کس طرح پہنچی تھی اور کس طرح اُس کی ملاقات نرسنگ سروس کی کیپٹن عصمت سے ہو گئی۔

"آپ کیپٹن عصمت سے مل لیں" ــــ شمع نے کہا ــــ "وہ مشکل سے ہی ملے گی۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہو گی میں اُس کے کمرے میں رہوں گی۔"

★

چوہدری کرامت کو کیپٹن عصمت شام چار بجے کے قریب ملی۔ اُس کی وردی زخمیوں کے خون سے سرخ تھی۔ اُس کی اتنی خوبصورت آنکھیں بھی سرخ تھیں اور وہ جیسے اپنے آپ میں تھی ہی نہیں۔ اُس کی رات آپریشن تھیٹر میں گذری تھی۔ صبح وہیں ہُوتی تھی۔ دن بھی وہیں گزرا تھا اور اب ذرا سستانے باہر نکلی تھی۔ ڈاکٹر محاذ کے زخمیوں کے مسلسل آپریشن کر رہے تھے۔ کیپٹن عصمت ڈاکٹر نہیں تھی لیکن اُسے آپریشن تھیٹر میں رہنا پڑتا تھا۔

زخمیوں کے زخم کلہاڑیوں اور تلواروں کے سیدھے زخم نہیں تھے جنہیں ٹانکے لگا کر اوپر پٹیاں باندھ دی جاتیں۔ یہ توپوں کے گولوں اور گرنیڈوں کے ٹکڑوں کے زخم تھے۔ بعض زخمیوں کے چہرے اُڑے ہُوئے تھے۔ پیٹ پھٹے ہُوئے تھے۔ ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ جسموں سے گوشت

کے لوتھڑے لٹک رہے تھے۔ انتڑیاں باہر آئی ہوئی تھیں۔ ان میں ایسے بھی تھے جن کی ایک ایک ٹانگ یا ایک ایک بازو محاذ پر ہی رہ گیا تھا۔

"مگر چوہدری صاحب!" ــــ کیپٹن عصمت چوہدری کرامت کو سنا رہی تھی ــــ "ان میں کئی ایسے زخمی آئے ہیں اور آ رہے ہیں جنہیں دو چار گھنٹے پہلے مر جانا چاہیئے تھا لیکن وہ آپریشن ٹیبل پر زندہ پہنچے بلکہ وہ ہوش میں تھے۔ یہ معجزے ہو رہے ہیں چوہدری صاحب! اُنہوں نے میڈیکل سائنس کو جھٹلا دیا ہے۔"

"اسے ایمان کی قوت کہتے ہیں عصمت بیٹی!" ــــ چوہدری کرامت نے کہا ــــ "مُسلمان کا جسم نہیں رُوح لڑا کرتی ہے۔"

"میں حیران ہوں" ــــ کیپٹن عصمت نے کہا ــــ "اتنی زیادہ تکلیف اور نزع کے عالم میں بھی یہ اپنی ماؤں کو، اپنی بہنوں کو، اپنے باپوں اور بچوں کو یاد نہیں کرتے۔ کہتے ہیں ہمیں مورچوں میں چھوڑ آؤ جہاں ہمارے ساتھی کٹ رہے ہیں ہم وہاں مریں گے۔ یہ اللہ اور پاکستان کی باتیں کرتے ہیں۔"

پھر شمع کی باتیں ہونے لگیں کیپٹن عصمت نے چوہدری کرامت کو تسلی دی کہ وہ شمع کا فکر نہ کرے اور واپس چلا جائے۔

"یہ میرے کمرے میں رہے گی" ــــ کیپٹن عصمت نے کہا ــــ "اس کے کپڑوں کے دو تین جوڑے اسے دے جائیں.... اقبال میرا کلاس فیلو تھا معلوم نہیں کون سے سیکٹر میں ہے۔"

کیپٹن عصمت نے چوہدری کرامت کے ساتھ اتنی زیادہ باتیں کرنے کا وقت صرف اس لیے نکال لیا تھا کہ وہ اقبال کو چاہتی تھی اور اقبال نے اُس کے ساتھ کبھی شادی کا وعدہ کیا تھا۔

چوہدری کرامت پورے اطمینان سے واپس آیا۔ اب اُس کے ضمیر اور اعصاب پر کوئی بوجھ نہیں تھا مگر اُسے جب رشید یاد آتا تھا جس کے ساتھ شمع پکڑی گئی تھی تو وہ اپنے سینے میں چبھن سی محسوس کرتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اسے برداشت کرنا تھا اور اس واقعہ کو ذہن سے اتارنا تھا لیکن چوہدری کرامت کو اس واقعہ کا پہلو پریشان کر رہا تھا کہ رشید اوچھا اور چھچھورا لڑکا ہے، وہ سارے شہر میں مشہور کر دے گا کہ شمع اُس کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔

★

اُسے معلوم نہیں تھا کہ تھانے میں رشید کا اوچھا پن ختم ہو چکا تھا۔ انسپکٹر شاہ نے کیپٹن طارق کو کئی بار کہا تھا کہ اس لڑکے کے خلاف کوئی الزام نہیں نہ اس پر کوئی شک ہے اور اس میں اتنی ہمت بھی نظر نہیں آتی کہ یہ جاسوسوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا لہٰذا اسے چھوڑ دیا جائے لیکن کیپٹن طارق کو اُس پر یہ غصہ تھا کہ اُن دنوں نوجوان اور بچے بھی جنگی جذبے سے دیوانے ہُوئے جا رہے ہیں اور یہ لڑکا عشق بازی میں لگا ہُوا ہے کیپٹن طارق کو رشید پر یہ غصہ بھی تھا کہ اُس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ شمع کے ساتھ نہیں تھا۔ اُس نے رشید کو حوالات میں بند کرا دیا تھا۔

رشید حوالات میں روتا تھا۔ انسپکٹر شاہ اور کیپٹن طارق کو دیکھ کر وہ دھاڑیں مارنے لگتا تھا۔ اُس کا باپ، بھائی اور لواحقین تھانے آتے اور اُس کے جرم کے متعلق پوچھتے اور منت سماجت کرتے تھے کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔

جب چوہدری کرامت علی کھاریاں سے واپس اپنے گھر آیا اُس وقت تھانے میں کیپٹن طارق حوالات کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ رشید کا باپ برآمدے میں کھڑا تھا۔ آج اُس نے کیپٹن طارق اور انسپکٹر شاہ کی اتنی زیادہ منّت سماجت کی تھی کہ رو پڑا تھا۔ کیپٹن طارق اٹھا اور حوالات کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ رشید حوالات میں فرش پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ ایک حوالاتی نے اُسے ٹھوکر مار کر بتایا کہ کپتان صاحب آئے ہیں۔ رشید تیزی سے اُٹھا اور حوالات کی سلاخوں سے جا لگا اور روزمرّہ کی طرح رونے اور بلبلانے لگا۔ کیپٹن طارق کچھ کہے بغیر اُسے دیکھتا رہا۔ رشید بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ باہر نکال کر اُس نے کیپٹن طارق کے پاؤں پکڑ لیے۔ کیپٹن طارق پیچھے ہٹ گیا۔

کیپٹن طارق نے اے۔ ایس۔ آئی کو بُلا کر کہا کہ اسے باہر نکالو۔ اے۔ ایس۔ آئی چابی لایا اور رشید کو باہر نکالا۔ کیپٹن طارق اُسے اپنے ساتھ تھانے کے دفتر میں لے گیا اور اُس کے باپ کو بلایا۔

"میری بات غور سے سنیں محترم!" — کیپٹن طارق نے رشید کے باپ سے کہا — "میرے صرف اشارے پر آپ کے اس بیٹے کو جیل میں بند کر دیں گے اور دو سال، تین سال، شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ یہ بغیر مقدمے کے جیل میں پڑا رہے گا۔ اس کی ساری عمر تباہ ہو جائے گی۔ آپ اس کے غم میں ٹی۔ بی کے مریض ہو جائیں گے.... میں آپ پر رحم کرتا ہوں لیکن ہم نے اس لڑکے کا نام تھانے کے ریکارڈ میں لکھ لیا ہے اور اس کا نام اور پتہ ملٹری انٹیلی جنس اور ملٹری پولیس کو بھی دے دیا ہے۔"

"کیپٹن صاحب!" — رشید کے باپ نے کہا — "میں اس کی ذمّہ داری لیتا ہوں۔ آپ حکم دیں تو میں شہر کے چار پانچ معزّزین کی ضمانتیں لے آؤں گا۔"

"آپ کا یہ بیٹا اس قابل نہیں کہ کوئی معزّز شخص یہ کہہ دے کہ وہ اس کی ضمانت دیتا ہے" — کیپٹن طارق نے کہا۔

"جناب کیپٹن صاحب!" — باپ نے منت کی — "اس کی ماں رو رو کر پاگل ہو رہی ہے۔"

"یہ ہے ہی اس قابل کہ اپنی ماں کے گھٹنے کے ساتھ لگا بیٹھا رہا کرے" — کیپٹن طارق نے کہا — "میری پوری بات سن لیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج کل نوجوانوں میں کیسا جذبہ ہے اور وہ کیا کر رہے ہیں لیکن آپ کا یہ بیٹا فلمی ڈرامے کھیل رہا ہے۔ ایک شریف باپ کی بیٹی کو ورغلا کر باہر لے گیا تھا، پھر اس نے جھوٹ بولا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ نہیں تھا۔"

"کیپٹن صاحب!" — رشید کے باپ نے کہا — "میرے دوسرے دونوں بیٹے دن رات جنگی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ خدا کی قسم دو دو مرتبہ خون دے چکے ہیں لیکن میرا یہ بیٹا...."

"اس کے جسم میں خون رہ ہی کہاں گیا ہے جو یہ فوج کو دے دے" — انسپکٹر شاہ نے کہا — "اس کی کرتوت نے اس کا خون چُوس لیا ہے۔ آپ کیپٹن صاحب کا حکم سن لیں، بیچ میں نہ بولیں۔"

"آپ کے بیٹے کے کیریکٹر کے لڑکے جھوٹے قصے سنا کر ہیرو بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں" — کیپٹن طارق نے کہا — "اس لڑکے نے اگر کہیں یہ ذکر کر دیا کہ فلاں لڑکی اس کے ساتھ باہر گئی تھی تو میں اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دوں گا۔ آپ بھی اس سے نہیں پوچھیں گے کہ وہ لڑکی کون تھی، کس کی بیٹی تھی.... آپ کو معلوم تھا کہ آپ کا یہ بیٹا آپ کے دوسرے بیٹوں سے مختلف ہے پھر بھی آپ نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب ہم اسے سیدھا کریں گے۔"

"کیپٹن صاحب!"

"میری بات سُن لیں" — کیپٹن طارق نے کہا — "وہ جو سرحدوں پر خون میں نہا رہے ہیں اور جن کی لاشیں ٹینکوں تلے کچلی جا رہی ہیں وہ بھی کسی کے بیٹے ہیں۔ آپ کے اس بیٹے کو بھی سرحد پر ہونا چاہیئے تھا مگر یہ لڑکا مسلمان کی اولاد معلوم نہیں ہوتا۔ میں اب یہ چاہتا ہُوں کہ یہ ہوش میں آ جائے اور انسان کا بچہ بن جائے.... اور سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ یہ اپنی زبان بند رکھے" — کیپٹن طارق نے جھوٹ بولا — "ہر وقت سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک دو آدمی اسے دیکھتے رہیں گے۔ جوں ہی اس کے منہ سے اُس لڑکی کے متعلق کوئی بات نکلی، یہ وہیں پکڑا جائے گا۔ اسے لے جائیں اور اس پر سختی کریں، اس کا دماغ درست کریں۔"

"اجازت ہے صاحب؟" — رشید کے باپ نے پوچھا۔

"لے جائیں اسے!" — کیپٹن طارق نے کہا۔

رشید اپنے باپ کے ساتھ کھڑا تھا۔ باپ ایک قدم پیچھے ہٹا اور پیشتر اس کے کہ کسی کو پتہ چلتا کہ وہ کیا کرنے لگا ہے، اُس نے اپنے ایک پاؤں کا جُوتا اتارا۔ رشید ننگے سر تھا اور وہ کیپٹن طارق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے باپ نے بڑے زور سے رشید کے سر پر جُوتا مارا اور بولا — "چل میرے بیٹے!" — رشید بدک کر پرے ہو گیا اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر رونے لگا۔ کیپٹن طارق اور انسپکٹر شاہ ہنس پڑے۔

باپ نے رشید کو بازو سے پکڑا اور اُسے دروازے کی طرف کر کے ایک جُوتا اور اُس کے سر پر مارا اور بولا — "آگے چل" — رشید آگے کو چل پڑا۔ برآمدے سے نکلتے باپ نے اُس کے سر پر ایک جُوتا اور مارا اور جہاں تک باپ بیٹا تھانے والوں کو نظر آتے رہے، باپ آٹھ دس قدم بعد اُسے جُوتے مارتا رہا۔

"میں صرف یہ چاہتا تھا کہ لڑکی کے باپ کی رسوائی نہ ہو" — کیپٹن طارق نے کہا — "اسی لیے میں اس لڑکے اور اس کے باپ کو ڈرا رہا تھا۔"

"یہ تو آنے والی نسلوں کو بھی کہہ جائیں گے کہ زبان بند رکھنا" — انسپکٹر شاہ نے کہا۔

★

ہاجرہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور باورچی خانے میں ہر سُو گھورنے لگی۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ وہ کام دھندے سے فارغ ہو کر باورچی خانے میں فرش پر لیٹی تو اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ سوئے ذرا ہی دیر گزری ہو گی کہ وہ ڈر کر جاگ اٹھی۔ اُسے لگا تھا جیسے قریب ہی کہیں دھماکہ ہُوا ہو۔ وہ اسے خواب کا دھماکہ سمجھ رہی تھی۔ اُس کا دل گھبراہٹ سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اُس نے تھکی تھکی سی انگڑائی لی اور پھر سو جانے کی کوشش کرنے لگی لیکن سینے میں گھٹن سی بڑھتی گئی۔ شام کی چائے میں ابھی خاصا وقت تھا۔ وہ اٹھی اور اقبال کی ماں سے یہی بہانہ کیا جو پہلے بھی کر چکی تھی کہ وہ اپنے گاؤں کی ایک سہیلی سے ملنے جا رہی ہے۔ اجازت لے کر باہر نکل گئی۔

ہوائی حملے کا سائرن چیخ رہا تھا۔ بعض لوگ کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ اے آر پی کے ساتھ کام کرنے والے لڑکے گلیوں میں وسلیں بجاتے بھاگ دوڑ رہے تھے اور اکثر لوگ چھتوں پہ کھڑے دشمن کے بمبار طیاروں کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہاجرہ سائرن کے واویلے سے بے نیاز افضال کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ افضال کی محبت اور اُس کی باتوں نے اُسے اور زیادہ نڈر بنا دیا تھا۔ اُسے پرواہ ہی نہیں تھی کہ چوہدری کرامت نے اُسے افضال کے کمرے میں جانے سے روکا تھا اور اقبال کی ماں اور بہنوں نے اُسے بڑی گھٹیا باتیں کہہ دی تھیں۔ یہ اُس کی سادگی اور نیک چلنی کی انتہا تھی کہ پچھلی ملاقات میں اُس نے افضال کو بتایا تھا کہ چوہدری کرامت نے اُسے کیا کہا تھا۔

"نہ آیا کرو ہاجو!" — افضال نے کہا تھا — "تمہاری عزّت پر میں اپنی محبت کو قربان کر سکتا ہوں"۔

"ایسا نہ کہو افضال جی!" — ہاجرہ نے افضال کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا — "تمہارے پاس آکر میں اپنے آپ کو بے آسرا نہیں سمجھتی۔ میرے دل کے پرانے زخم مل گئے ہیں.... مجھے اپنے پاس رکھ لو افضال جی! لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہتے رہیں"۔

"تم آخر میرے ہی پاس آؤ گی ہاجو!" — افضال نے بڑے پیار سے کہا تھا — "مجھے ذرا تعلیم سے فارغ ہو لینے دو"۔

ہاجرہ نے افضال کا گال اپنے رخسار سے لگا کر بڑی زور سے بھینچا تھا اور کتنی ہی دیر سسکیاں لے لے کے روتی رہی تھی۔ افضال نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور اُس کے گال اور بال سہلاتا رہا تھا۔ آج بھی دوپہر کے بعد وہ نیند میں ڈر کے جاگ اٹھی تو دل کی گھبراہٹ سے اکتا کر افضال کے ہاں چل دی۔

راستے میں اسے صوبیدار اکبر علی مل گیا۔ وہ بہت تیز تیز چلا آرہا تھا۔ ہاجرہ خوش تھی کہ وہ لڑائی پر چلا گیا ہے مگر وہ پھر وزیر آباد کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ ہاجرہ اسے خواب سمجھنے لگی۔ وہ تو کہتی تھی کہ اکبر علی لڑائی پر چلا گیا ہے تو اُدھر ہی مارا جائے مگر وہ زندہ اور سلامت واپس آگیا تھا۔ اُس نے وردی نہیں پہن رکھی تھی۔ وہاں اور کوئی راستہ نہ تھا ورنہ وہ راستہ بدل لیتی۔ دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔

اکبر علی ہاجرہ کے قریب آرکا۔ ہاجرہ کو توقع تھی کہ وہ آج پھر کہے گا کہ ہاجو! میرے ساتھ شادی کر لو، سونے سے لاد دوں گا۔ لیکن اکبر علی کی چال ڈھال میں عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ ہاجرہ کے پاس اس طرح رکا جیسے رکنا نہیں چاہتا تھا۔ جب ہاجرہ سے مخاطب ہُوا تو اُس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اُسے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

"اوہ! تم.... ہاجو!" — اُس نے پوچھا — "کہاں جا رہی ہو؟"

"اپنے کام سے" — ہاجرہ نے بے رُخی سے کہا اور اُس کے دل سے نفرت اُمڈ آئی۔ اُس نے طنزیہ کہا — "تم تو لڑائی پر گئے تھے۔ بھاگ آئے؟ .... میدان میں مرد ہی ٹھہر سکتے ہیں"۔

صوبیدار اکبر علی نہ ہنسا، نہ مسکرایا جیسے اُس نے ہاجرہ کی بات سنی ہی نہ ہو۔ ہوائی حملے کے

سائرن چپ ہو گئے تھے۔ دوسرے لمحے "آل کلیئر" کی لمبی لَے بجنے لگی۔

"وزیر آباد کے ارد گرد یہ تیسرا ہوائی حملہ ہے" — اکبر علی نے اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں کہا — "تینوں حملے ریل گاڑیوں پر ہُوئے ہیں" — وہ بولتے بولتے اس طرح چپ ہو گیا جیسے اپنی آواز سے چونک اٹھا ہو۔ اُس کے سامنے ہاجرہ کھڑی تھی۔ وہ تو جیسے ہاجرہ کی موجودگی سے ہی بے خبر تھا۔ قدرے بوکھلا کر بولا — "ہاجرہ! میں نے تمہیں اس لیے روک لیا تھا کہ ہوائی حملے کے وقت باہر نہ نکلا کرو" — اور وہ تیز قدم آگے نکل گیا۔

اُس کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے اُسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔ ہاجرہ وہیں کھڑی رہی۔ اُسے اکبر علی کا رنگ ڈھنگ بدلا بدلا نظر آرہا تھا۔ پاکستان پر بھارتی حملے کے بعد ساری دنیا بدل گئی تھی لیکن ہاجرہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ اکبر علی بھی بدل سکتا ہے۔ اس شخص کو اُس نے ہمیشہ قابلِ نفرت اور گھناؤنے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ اب سمجھ رہی تھی کہ اکبر علی لڑائی سے بھاگ آیا ہے۔

ہاجرہ کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ کوئی فوجی لڑائی سے بھاگ نہیں سکتا اور پاک فوج کا غازی تو بھاگنے کے نام سے ہی واقف نہیں۔ ہاجرہ کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ محاذوں پر پاک فوج کے کمانڈروں کے لیے مسئلہ یہ نہیں کہ جوانوں کو لڑائیں کیسے۔ بلکہ مشکل یہ پیش آرہی ہے کہ انہیں لڑنے سے روکیں کیسے؟ مثلاً لاہور کی دفاعی لائن بی آر بی کا اس طرف کا کنارہ تھا مگر پاک فوج کے جوان نہر پھلانگ کر دشمن سے دست بدست لڑنے کے لیے مُنہ زور ہوتے جا رہے تھے۔

★

صوبیدار اکبر علی نے تمام تر سروس ملٹری پولیس میں کی تھی۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں لانس نائک کے عہدے پر بریگیڈ کی انٹیلی جنس سیکشن میں رہا تھا اور اُس نے برما فرنٹ پر پُرخطر حالات میں بڑی قیمتی رپورٹیں فراہم کی تھیں۔ پاک فوج میں وہ صُوبیداری کے عہدے تک پہنچا تھا اور جنگِ ستمبر شروع ہونے سے پہلے ہی پنشن پر آگیا تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا انسٹرکٹر رہ چکا تھا۔ اعوان شریف پر بھارتی گولہ باری کے تیسرے چوتھے روز اُسے فوج میں واپس بلا لیا گیا تھا۔ بھارت نے لاہور پر حملہ کر دیا تو یکے بعد دیگرے بھارتی طیارے دھونکل اور راہوالی ریلوے سٹیشنوں پر حملہ کر گئے۔ پھر اسی علاقے میں ایک اور ہوائی حملہ ہُوا۔ جب بھی دشمن کا ہوائی حملہ ہوتا تھا کوئی نہ کوئی مال گاڑی اس علاقے سے گزر رہی ہوتی تھی۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ اس علاقے میں بھارت کے جاسوس سرگرمِ عمل ہیں۔ وزیر آباد بڑا ہی حسّاس اور نازک مقام بن گیا تھا۔ صوبیدار اکبر علی کو بھارتی جاسوسوں کی سراغرسانی کے لیے وزیر آباد بھیج دیا گیا تھا۔ یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ جنگ کی دوسری رات بھارت نے پیراشوٹوں کے ذریعے دو تین جاسوس یا تخریب کار وزیر آباد کے علاقے میں اتارے ہیں۔ اکبر علی وزیر آباد واپس آگیا تھا لیکن وہ وردی میں نہیں سادہ کپڑوں میں گھومتا پھرتا اور لوگوں کو بتاتا تھا کہ اُسے فوج والوں نے عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے واپس بھیج دیا ہے۔

اکبر علی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کس قدر خطرناک اور اہم ترین محاذ پر لڑ رہا ہے۔ وہ اپنے مدِّمقابل کو بھی خوب جانتا تھا جو جالندھر میں بیٹھا وزیر آباد میں پھیلے ہوئے جاسوسوں کو لمحہ بہ لمحہ ہدایات

دے رہا تھا اور ان کی رپوٹیں سن رہا تھا۔ جالندھر کی سرگوشیاں وزیر آباد میں سنائی دے رہی تھیں اور وزیر آباد کی آواز جالندھر پہنچ رہی تھی۔ ان آوازوں کو سننے والے نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کوئی کسی کو کیا کہہ رہا ہے۔ یہ باتیں خفیہ زبان (کوڈ) میں ہوتی تھیں۔

کرنل پی سی گپتا انڈین آرمی انٹیلی جنس کا گھاگھ افسر تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں وہ بٹالین انٹیلی جنس سیکشن میں نائک تھا۔ صوبیدار اکبر علی بھی اسی بٹالین میں لانس نائک تھا اور گپتا کے ساتھ بریگیڈ انٹیلی جنس میں کام کیا کرتا تھا۔ اُس وقت دونوں کی سروس ابھی تین تین چار چار برس تھی۔ آج صوبیدار اکبر علی کو اپنی انٹیلی جنس کے زور پر علم ہو گیا تھا کہ اُس کا مدِمقابل اُس کا پرانا ساتھی گپتا ہے جو اُس وقت نائیک ہوا کرتا تھا اور آج کرنل ہے۔

دوسری جنگِ عظیم میں گپتا نے برما فرنٹ پر بریگیڈ انٹیلی جنس میں برطانوی افسروں کے ساتھ کام کیا تھا۔ اُس نے وہ ڈھنگ سیکھ لیے تھے جو انڈین آرمی میں کم ہی کسی نے سیکھے ہوں گے۔ جاپانیوں کو جنگل کی لڑائی کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا اور ان کا گوریلا آپریشن، برطانوی، ہندوستانی اور امریکی ڈویژنوں کے لیے ایسی مصیبت بن گیا تھا کہ ان کا کوئی مورچہ محفوظ ہی نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے قد بُت والے جاپانی سپاہی جونکوں کی طرح جنگل میں رینگتے سرکتے اتحادی فوج کے اگلے مورچوں کے پیچھے آجاتے اور ان کا بے تحاشہ نقصان کر کے جنگل میں غائب ہو جاتے تھے۔

جاپانیوں کا جاسوسی کا نظام بڑا ہی کارگر تھا۔ برما کے مقامی لوگوں میں جاپانیوں کے جاسوس اور تخریب کار تھے۔ یہ لوگ جاپانی گوریلوں کی پوری پوری مدد کرتے تھے۔

یہ نائک گپتا تھا جس نے جاپانی گوریلوں کی راہیں بند کر دی تھیں۔ جاپانی اپنی کوئی حرکت کوئی پوزیشن اور کوئی سکیم گپتا سے نہیں چھپا سکتے تھے۔ ایک اس لیے کہ وہ نڈر تھا اور جان پر کھیل کر دور آگے نکل جایا کرتا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔ جنگل میں چھوٹے چھوٹے ندی نالے تھے جن پر چھوٹے چھوٹے پُل تھے۔ ان کی طرف اتحادیوں نے کبھی دھیان ہی نہ دیا تھا لیکن یہ پُل عظیم جنگی اہمیت کے حامل تھے۔ جاپانی گوریلوں کے لیے یہ پُل بڑے کام کے تھے۔ ان پُلوں کے علاوہ گپتا نے جاپانیوں کا مواصلاتی اور رسد و رسائل کا نظام بھی دیکھ لیا تھا۔ اُس نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو برطانوی بمبار طیاروں کے لیے بہت سے ٹارگیٹ بتائے تھے جب بمباروں نے اُس کی نشاندہی پر بمباری کی تو جاپانی گوریلے چھوٹے چھوٹے پُل تباہ ہو جانے سے بے بس ہو گئے۔ اس کے علاوہ جاپانیوں کا سپلائی سسٹم بیکار ہو کے رہ گیا۔ ان میں سے بعض جان جوکھوں کی مہموں میں اکبر علی بھی گپتا کے ساتھ تھا۔ یہ ایک گروپ تھا جس کا کمانڈر ایک انگریز میجر تھا۔ اس گروپ میں برما کے چند ایک مقامی آدمی بھی تھے جو گائیڈ کا کام کرتے تھے۔ ہندوستانیوں میں اکبر علی اور گپتا بہت تیز اور عقل مند تھے۔

گپتا کو جنگ کے دوران ہی کمیشن مل گیا تھا مگر اکبر علی لانس نائک ہی رہا تھا۔ دونوں رہتک کے ایک ہی قصبے کے رہنے والے تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو گپتا کپتان تھا اور اکبر علی نائک۔ پھر پاکستان بن گیا تو اکبر علی پاکستان آنے کی تیاری کرنے لگا۔

"تم ہندوستانی ہو اکبر علی!" گپتا نے اکبر علی سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ "میں تمہیں انڈین آرمی میں کمیشن دلا دوں گا۔ پاکستان جا کر اپنی سروس تباہ نہ کرو۔ پاکستان کی نہ کوئی فوج ہے نہ آئندہ ہوگی اور تمہاری قابلیت کی کوئی قدر نہیں کرے گا۔ پاکستان نہ جاؤ۔"

اکبر علی مسلمان ہو کر انڈین آرمی میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ مسلمانوں کا قتلِ عام دیکھ رہا تھا۔ چند ہی روز پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی بیوی، اُس کے رشتہ داروں اور اپنے ماں باپ کے متعلق بڑی پریشانی تھی۔ رہتک کے اس قصبے سے کسی کا بھی بچ کے پاکستان آجانا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

"اکبر دوست!" ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت گپتا نے ایک بار پھر اُسے کہا تھا۔ "فرنٹ پر ہم دونوں اکٹھے موت سے کھیلتے رہے ہیں۔ مجھے اُس دوستی کا پاس ہے۔ ایک بار تم نے میری جان بچائی تھی۔ میں تمہیں اس کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔ انڈین آرمی میں رہ جاؤ۔ نائک سے لیفٹیننٹ بنا دینا میرا کام ہے۔"

"گپتا صاحب!" اکبر علی نے اُسے کہا تھا۔ "اگر آپ کو دوستی کا اس قدر خیال ہے تو میرے خاندان کو حفاظت سے لاہور تک پہنچا دو۔ تمام عمر احسان نہ بھولوں گا۔"

گپتا گہری سوچ میں کھو گیا پھر مسکرا کر بولا۔ "آج رُکے رہو۔ کل ایک ٹرک تم سب کو پاکستان پہنچا دے گا۔"

دوسری صبح ایک ٹوٹا پھوٹا پرائیویٹ ٹرک اکبر علی کے خاندان کے لیے آ گیا۔ اکبر علی گپتا سے بغل گیر ہو گیا اور اُس کے آنسو نکل آئے تھے۔ اُس کے تمام عزیز و اقارب ایک جگہ جمع تھے۔ اُس نے سب کو ٹرک میں بھرا۔ اس قافلے میں تین معصوم بچے بھی تھے، جواں سال لڑکیاں، عورتیں اور دو بوڑھے بھی اور اسی میں اکبر علی کی بیوی بھی تھی۔ گپتا نے دو ہندو سپاہی سٹین گنوں سے مسلح ٹرک میں بٹھا دیئے تھے۔ ڈرائیور بھی مسلح فوجی تھا۔ ٹرک شام کے وقت چل پڑا۔

اکبر علی گپتا کا بہت مشکور تھا مگر بھول گیا تھا کہ گپتا ہندو ہے۔ تین ساڑھے تین گھنٹوں کے بعد ٹرک ویرانے میں اچانک رک گیا اور انجن بند ہو گیا۔ اکبر علی ڈرائیور کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتفاق سے اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ڈرائیور نے ٹرک کا انجن خود ہی بند کر دیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ انجن بند ہو گیا ہے۔ اُس نے بلاوجہ سیٹ سے اٹھ کر انجن کھول لیا تھا۔ اکبر علی کو شک گزرا۔ اُس نے دیکھا کہ ٹرک ڈرائیور اپنی سٹین گن سیٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ میگزین گن میں لگی ہوئی تھی۔ اکبر علی نے سٹین گن اٹھا لی۔ عین اُس وقت ٹرک میں بیٹھے ہوئے دونوں ہندوستانی سپاہیوں نے ٹرک کے مسافروں پر سٹین گن کا فائر کھول دیا۔ اکبر علی کود کر سیٹ سے باہر آیا لیکن اپنے چیختے چلاتے، مرتے اور گرتے رشتہ داروں میں اُسے ہندو سپاہی نظر نہیں آتے تھے۔ وہ فائر کیے جا رہے تھے۔

کُل پانچ منٹ گزرے ہوں گے۔ اکبر علی کے لیے صورتِ حال بڑی مشکل تھی۔ اُس نے دیکھا کہ ڈرائیور سیٹ پر اپنی سٹین گن تلاش کر رہا تھا۔ اکبر علی نے چھوٹا سا برسٹ فائر کر کے ڈرائیور کو ٹھنڈا کر دیا۔ اتنے میں دونوں سپاہی ٹرک سے کودے۔ اکبر علی اوٹ میں تھا۔ اُس نے دونوں کو سٹین گن کی ایک ہی بوچھاڑ میں لے لیا۔

انڈین آرمی کے تین سپاہیوں کو چھوڑ وہ اگر اب ساری انڈین آرمی کو مار دیتا تو بھی اُس کے اور اُس کی بیوی کے عزیز رشتہ دار اس دنیا میں لَوٹ کے نہیں آسکتے تھے۔ اُس نے ٹرک کے اندر دیکھا۔ تمام کے تمام افراد شہید ہو چکے تھے سوائے اُس کی بیوی اور گاؤں کے ایک آدمی کے۔ وہ دونوں لاشوں کے نیچے دب کر ہندو سپاہیوں کی سٹین گنوں سے بچ گئے تھے۔

اکبر علی پاگل ہو گیا اور پاگل پن میں واپس چل پڑا۔ بیوی نے اُسے روک لیا اور پوچھا کہاں جا رہے ہو؟

"کپتان گپتا سے بدلہ لینے" — اُس نے دھیمی مگر قہر آلود آواز میں کہا تھا بدلہ لینے "تم دونوں چلو، میں آجاؤں گا"

بیوی اُس سے لپٹ گئی اور اُسے پیچھے نہ جانے دیا تھا۔

لاش ایک ہوتی تو اُسے دفنا دیتے، وہاں اٹھارہ لاشیں تھیں۔ اکبر علی نے دل پر پتھر رکھا اور اپنی بیوی اور گاؤں کے بچے ہوئے آدمی کو ساتھ لیے پاکستان کی طرف پا پیادہ چل پڑا۔ بڑی لمبی مسافت تھی۔ دل پر غم کا بوجھ اور سینے میں انتقام کی آگ۔ ایک میل آگے وسیع اور گہری نہر بہے جا رہی تھی۔ اکبر علی واپس چلا گیا اور لاشوں سے بھرا ہوا ٹرک سٹارٹ کر کے نہر کے کنارے لا کھڑا کیا۔ خود سیٹ سے نکلا اور بیوی اور اُس آدمی کی مدد سے ٹرک کو دھکا لگا کر نہر میں پھینک دیا۔ نہر بہت گہری تھی۔ ٹرک لاشوں سمیت غائب ہو گیا۔

یہ ستمبر ۱۹۴۷ء کا المیہ تھا۔

اب ستمبر ۱۹۶۵ء تھا۔



وہ تینوں پاکستان پہنچ گئے تھے اور اکبر علی پاک آرمی میں اپنی یونٹ میں چلا گیا لیکن رن کچھ کے معرکے اپریل مئی ۱۹۶۵ء تک لاشوں سے بھرا ہوا ٹرک اُس کے ذہن میں گھومتا پھرتا رہا۔ اُسے وزیر آباد میں مکان اور شہر سے باہر کچھ زمین بھی مل گئی تھی۔ پاک فوج میں اُسے انڈین آرمی کے ریکارڈ کی وجہ سے ملٹری پولیس میں بھیج دیا گیا پھر وہ ملٹری انٹیلیجنس کا ماہر بن گیا تھا لیکن وہ انفنٹری میں جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ کبھی تو خدا ہندو کو میدان میں لائے گا مگر وہ ملٹری انٹیلی جنس کے لیے زیادہ موزوں تھا "حضور!" — رن کچھ کے معرکے کے وقت اُس نے اپنے بریگیڈیئر سے غیر فوجی انداز سے کہا تھا — "کسی بٹالین کے ساتھ اٹیچ کر کے رن کچھ میں آگے جانے کی اجازت دے دو" — اُس کے آنسو نکل آتے تھے اور وہ دانت پیس کر بولا — "حضور! سینے میں اٹھارہ بے گناہوں کا خون جما ہوا ہے۔ ہندو پہلی بار میدان میں آیا ہے حضور! فرنٹ پر جانے دو۔ شاید ہندو پھر سامنے نہ آئے"

اُس وقت اکبر علی صوبیدار تھا۔ فوج میں اس انداز سے بات نہیں کی جاتی نہ کوئی بریگیڈیئر کسی صوبیدار سے ایسی غیر فوجی بات کی توقع رکھتا ہے لیکن بریگیڈیئر بھی مسلمان تھا، پاکستانی مسلمان۔ اُس کے اپنے سینے میں جانے کتنے بے گناہوں کا خون جما ہوا تھا — "صوبیدار صاحب!" — بریگیڈیئر نے اکبر علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا تھا — "اگر آپ کی ڈیوٹی کوئی اور کر سکتا ہے تو میں آپ کو

آگے بھیج دیتا ہوں .... ذرا سوچیں، کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟ آپ صوبیدار ہیں۔ جذبات کو قابو میں رکھیں"۔

اُدھر گپتا کرنل تھا اور ملٹری انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر۔ وہ ایک مدت انٹیلی جنس سکول میں چیف انسٹرکٹر رہا تھا۔ اُس وقت تک انڈین آرمی کی انٹیلی جنس سروس گپتا کے ہاتھوں تربیت یافتہ تھی۔ وہ ٹریننگ سکول میں آنے والی ہر نئی کلاس کو پہلے لیکچر میں کہا کرتا تھا — "تمام کی تمام انڈین آرمی، آرٹلری، کیولری، نیوی اور ایئر فورس مل کر بھی دشمن کا اتنا نقصان نہیں کر سکتی جتنا صرف ایک کمانڈو یا ایک جاسوس کر سکتا ہے۔ اگر انٹیلی جنس صحیح ہو تو دشمن اپنی کوئی رگ نہیں چھپا سکتا"۔

وہ ایک واقعہ ہر کلاس کو سنایا کرتا تھا — "برما میں آر۔ اے۔ ایف (برطانوی فضائی بیڑے) کے بمبار مسلسل پندرہ دن بیس بیس سارٹی (اُڑانیں) بمباری کرتے رہے مگر جاپانیوں کی سپلائی نہ توڑ سکے لیکن میں نے صرف ایک پاؤ ڈائنامیٹ سے جاپانیوں کی کمر توڑ دی تھی۔ جانتے ہو میں نے کیا کیا تھا؟ .... ایک سیلابی ندی پر لکڑی کا ایک پُل تھا جو میں نے ایک کمانڈو سے اُڑوا دیا تھا"۔

وہ واقعات تو برما فرنٹ کے سنایا کرتا تھا لیکن مثالیں پاکستان کی دیا کرتا تھا مثلاً — "دشمن کی ڈیفنس لائن سیالکوٹ سے قصور تک پھیلی ہوتی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ دشمن کی سپلائی لائن کا سسٹم کیا ہے اور رستے کون کون سے ہیں۔ سپلائی کا منبع کیا ہے اور اگر معلوم نہیں تو کن ذرائع سے معلوم کیا جا سکتا ہے" — وہ اپنے سبق کو ہمیشہ پاکستان کے نقشے سے واضح کیا کرتا تھا اور اُس کی چھڑی اکثر وزیر آباد کی نشاندہی کیا کرتی تھی یا گوجرانوالہ کی۔

"یاد رکھو" — اُس نے ٹریننگ سکول میں اکثر کہا تھا — "ہمارے دو دشمن ہیں .... چین اور پاکستان .... چین سے ہمارا مقابلہ میدانِ جنگ میں ہو گا لیکن پاکستان کو ہم فیلڈ سے دُور پیچھے جاسوسوں اور کمانڈوز سے ماریں گے"۔

رن کچھ کے معرکے کے وقت گپتا کا ہیڈ کوارٹر دلّی میں تھا۔ اُسے توقع تھی کہ پاکستانی ایک روز بھی نہیں ٹک سکیں گے مگر پاکستانی ایسے ٹِکے کہ ایک پاکستانی بریگیڈ نے پورے بھارتی ڈویژن کو گھیر لیا اور بھارتیوں نے سفید جھنڈا کھڑا کر دیا۔ پاک فوج کی قوت کے متعلق اُس نے بڑا ہی غلط اندازہ لگایا تھا۔ شاستری نے اپنی مرضی کا محاذ کھولنے کا اعلان کر دیا، اور کرنل گپتا نے اپنے چُنے ہوتے جاسوس پاکستان میں داخل کر دیے۔ یہ اُن جاسوسوں میں اضافہ تھا جو پہلے ہی اس علاقے میں موجود تھے۔ اُدھر انڈین آرمی رن کچھ میں پاک فوج کے ہاتھ دیکھ کر اس کے مطابق تربیت پانے لگی۔ اِدھر پاکستان سے بھارتی جاسوسوں نے خبریں بھیجنی شروع کر دیں۔

۲۴ اگست ۱۹۶۵ء کو کرنل گپتا نے اپنا ہیڈ کوارٹر جالندھر میں آبنایا اور انٹیلیجنس کے تجربہ کار افسر اور جوان اس ہیڈ کوارٹر میں جمع کر لیے۔ وہاں اُس نے نہایت حسّاس اور بہت دُور پیغام پہنچانے والے وائرلیس سیٹ اور ٹرانسمٹر نصب کیے۔ اُس نے پاکستان میں اتارنے کے لیے جاسوسوں کی ایک اور جماعت تیار کر رکھی تھی۔ ۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات جب انڈین آرمی پاکستان پر یلغار کرنے کے لیے سرحدوں پر ڈیپلائے ہو رہی تھی تو گپتا نے جنرل چوہدری کو ان الفاظ میں یقین دلایا تھا کہ پاک آرمی ہمارے فارورڈ ٹروپس کے مقابلے میں جم گئی تو میں جالندھر میں بیٹھے بیٹھے ان کی سپلائی لائن چند منٹوں

میں تباہ کر کے ان سے ہتھیار ڈلوالوں گا۔

اُس کے جاسوس پاکستان میں کئی اہم جگہوں پر مصروف تھے۔ پانچ ستمبر کی شام اسے جالندھر ہیڈکوارٹر میں وائرلیس پر پاکستان کے کئی گوشوں سے پیغامات موصول ہو رہے تھے۔ کرنل گپتا کا منصوبہ بے عیب تھا جس کے ناکام ہونے کا شبہ تک نہ کیا جا سکتا تھا۔ بھارت کا ہر ایک جاسوس پاکستان کے اندر سے پیغام دے رہا تھا۔ اُن کی رپورٹیں صحیح تھیں۔ جاسوسوں نے انڈین ایئر فورس کے لیے نہایت اہم ٹارگیٹ بتا دیے تھے۔ پٹھانکوٹ، آدم پور، ہلواڑہ، جام نگر اور انبالہ کے ہوائی اڈوں کے آپریشن روموں میں پاکستان کے نقشوں پر ان ٹارگیٹوں پر نشان لگا دیے گئے تھے۔

ان رپورٹوں اور اپنے تجربے کی بنا پر کرنل گپتا نے پاکستان کے اندر سابوتاژ (تباہی مچانے کی) جو سکیم بنائی تھی، اُسے دیکھتے ہوئے اُس کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا کہ وہ جالندھر میں بیٹھے بیٹھے پاک فوج سے ہتھیار ڈلوا لے گا لیکن پاکستان کی تباہی کا منصوبہ تیار کرتے وقت کرنل گپتا نے اس بات کا خیال نہ رکھا تھا کہ اُس نے انٹیلی جنس، جاسوسی اور سابوتاژ کی ٹریننگ اور تجربہ برما کی وادیوں میں جاپانیوں کے خلاف لڑتے حاصل کیا تھا اور اب سامنا پاکستانیوں سے ہے۔ برما جاپانیوں کا نہیں تھا۔ وہ اس خطّے سے دست بردار ہو سکتے تھے۔ برما انگریزوں کا بھی نہیں تھا اسی لیے وہ بھی برما کو جاپانیوں کے حوالے کر کے بھاگ آئے تھے لیکن کرنل گپتا بھول گیا تھا کہ پاکستان پاکستانیوں کا اپنا وطن ہے جس کے ایک ایک انچ کے لیے وہ کٹ مریں گے بھاگیں گے نہیں۔

یہی ذرا سی خامی انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل چوہدری کے اٹیک پلان (حملے کی سکیم) میں رہ گئی تھی۔ اُس کے ڈویژنوں کے ڈیپلائے سے اُس کی جنگی مہارت کا پتہ چلتا تھا اور چونڈہ کے میدان کو بکتر بند حملے کے لیے منتخب کرنا اُس کی جنگی سُوجھ بُوجھ کا مکمل ثبوت تھا ٹینکوں کی جنگ کے لیے اس سے بہتر اور کوئی میدان نہیں ہو سکتا تھا۔ حملے کا وقت، انداز اور آرٹلری اور ایئر فورس کا استعمال اُس کی جنگی اہلیت کا پتہ دیتا تھا لیکن اس بے مثال سکیم میں صرف یہ خامی رہ گئی تھی کہ جنرل چوہدری یہ بھول گیا تھا کہ پاکستانی بھی لڑنا جانتے ہیں۔ غالباً اُسے بھی کرنل گپتا کے سابوتاژ پلان اور جاسوسی کے جال پر اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا خود گپتا کو تھا۔

دونوں کو یقین تھا کہ سامنے سے حملہ آور فوجیں اور عقب میں جاسوسوں اور تباہ کاروں کی تباہ کاری پاک فوج کو بی آر بی میں ڈوب مرنے پر مجبور کر دے گی اور انڈین آرمی کا سپیئر ہیڈ باٹا پور سے ایک ہی ہلّے میں لاہور سے بھی آگے نکل جائے گا۔ اِدھر سیالکوٹ سے آرمرڈ تھرسٹ (بکتر بند حملہ) گوجرانوالہ تک کا علاقہ صاف کر دے گا اور اِدھر قصور، بیدیاں، برکی محور کے حملہ آور دستے سیالکوٹ اور باٹا پور کے فاتح کالموں سے گوجرانوالہ میں جا ملیں گے۔ کرنل گپتا کو یقین تھا کہ ایسے ہی ہوگا۔ اُسے اُن جاسوسوں پر مکمل اعتماد تھا جن کے سپرد اُن ریل گاڑیوں کو تباہ کرنے کا کام تھا جنہیں ایمونیشن لے کے محاذوں تک پہنچانا تھا۔ ان کی تباہی کا مرکز وزیر آباد تھا تاکہ لاہور اور سیالکوٹ کی سپلائی بیک وقت کٹ جائے۔



یہ جاسوس کہاں تھے؟ —— پاکستان کے شہریوں کو اسی قدر معلوم تھا کہ یہاں بھارت کے جاسوس موجود ہیں لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔ پاکستانیوں کی کم فہمی کہ وہ تسلیم کرنے سے جھجکتے تھے کہ دشمن کے جاسوس مسجد میں بھی ہو سکتے ہیں اور گرجے میں پادری کے روپ میں بھی، درس گاہوں میں بھی اور پیروں فقیروں کے مزاروں پر مجاوروں کے بہروپ میں بھی۔ وہ رفاعی اداروں میں بھی ہو سکتے ہیں اور پروفیسروں کے بھیس میں کالجوں میں بھی۔ وہ معزّز شہری کے لبادے میں بھی مستور ہو سکتے ہیں اور ڈاکٹروں کے رُوپ میں بھی۔ کسی ریلوے سٹیشن پر کانٹا بدلنے والا بھی جاسوس ہو سکتا ہے اور کسی مشنری سکول کا راہب استاد بھی۔ ٹیلیفون ایکسچینج میں بھی جاسوس ہو سکتے ہیں ڈاک خانوں میں بھی۔ جاسوس قرآن کی تلاوت سے بھی لوگوں کو مسحور کر سکتے ہیں اور سفید لبادہ اوڑھ کر انجیل مقدّس سے بھی شہریوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں —— جاسوس مداری کا تماشہ بھی دکھایا کرتے ہیں اور چھاؤنیوں میں بیروں، خانساموں اور چوکیداروں کا کامیاب روپ بھی دھار لیتے ہیں۔ وہ گلی گلی خوانچے اٹھاتے کھیل گجک بھی بیچ لیتے ہیں اور انشورنس کے ایجنٹ بھی بن سکتے ہیں۔ دشمن کے جاسوس ننگ دھڑنگ کیچڑ میں لتھڑے ہوتے پاگل بھی بن جاتے ہیں اور فوجی افسر بن کر بھی اپنا کام کر جاتے ہیں۔

پاکستانی شہری ابھی اس بھیانک تجربے سے ناآشنا تھے۔ ان کے عمل کی راہ میں جذبات حائل تھے۔ اگر کسی پادری سے پوچھ گچھ ہوئی تو عیسائی بلبلا اُٹھے کسی مسجد کے مولوی پر سرکاری انگلی اٹھی تو مسلمان چلّا اٹھے۔ کسی ڈاکٹر پر ہاتھ رکھا تو اس کے مریض واویلا کرنے لگے کہ یہ تو فرشتہ ہے جاسوس نہیں اور اگر کسی لڑکی کو پولیس نے شک میں پکڑ لیا تو لوگوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے —— "لو جی، بہو بیٹی کی بھی عزت محفوظ نہیں رہی۔ دیکھو کیسی بھولی بھالی کسی اچھے گھرانے کی لڑکی کو پکڑ لیا ہے۔"

کرنل گپتا نے رن کچھ کی شکست کے بعد جو دس لڑکیاں پاکستان کی سرحد میں داخل کی تھیں وہ بھی بڑی ہی بھولی بھالی اور کسی بڑے ہی اچھے گھرانے کی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ کہیں پرائیویٹ سیکریٹری یا ہندوستان سے بھاگی ہوئی لُٹی پٹی عورت کے بھیس میں یا لیکچرار یا رقاصہ یا ایکٹرس کے روپ میں طلسم ہوش ربا بن کر پاکستان کی جانے کون کون سی رگ میں سما گئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے یہ کمال کر دکھایا تھا کہ ۴ ۲ اگست ۱۹۶۵ء کو جب بھارتی مارٹر گنوں اور مشین گنوں نے اعوان شریف میں تباہی مچائی تھی تو اُس نے اُسی رات کرنل گپتا کے ہیڈکوارٹر کو وائرلیس پر مفصّل رپورٹ دے دی تھی کہ پاکستان آرمی کا ردِّ عمل کیا ہے اور کون کون سی یونٹیں کس کس جگہ مُوو کر گئی ہیں۔

یہ رپورٹ انڈین آرمی کے لیے بہت قیمتی تھی جس کا تجزیہ کر کے جنرل چوہدری نے گجرات کی طرف سے پاکستان پر حملے کی سکیم پر نظرِ ثانی شروع کر دی تھی اور چھمب کے پیچھے بنکروں کو اور زیادہ مضبوط کر کے وہاں توپخانے کی ایک اور یونٹ بھیج دی تھی اور پٹھانکوٹ کے ہوائی اڈے پر ایک لڑاکا بمبار سکواڈرن کا اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کرنل گپتا نے سرحدی دیہات میں جاسوس بھیج دیتے تھے۔ یہ جاسوس دیہاتیوں یا غریب اور مظلوم کشمیریوں کے روپ میں اپنی اپنی پوسٹ پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں بیشتر جاسوس توپخانے کے 'او۔ پی' کا کام کر سکتے تھے۔

۵/۶ ستمبر کی درمیانی شب کرنل گپتا کے ہیڈکوارٹر میں وائرلیس سیٹوں نے ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ پاکستان میں پھیلے ہوئے بھارتی جاسوس وائرلیس سے اپنے ہیڈکوارٹر سے ملاپ کر کے اپنی اپنی پوزیشن بتا رہے تھے، رپورٹیں دے رہے تھے اور ہدایات لے رہے تھے۔ کرنل گپتا پسینے سے شرابور، گرانٹ کی وسکی کی آدھی بوتل خالی کر چکا تھا اور اس قدر مصروف کہ بھیکی ونڈ کے ڈویژن ہیڈکوارٹر سے فون آیا تو اُس نے کہہ دیا— "کہہ دو مصروف ہوں"۔

چھمب اور جوڑیاں سے انڈین آرمی کی پسپائی کو وہ شرمناک اور ذاتی شکست سمجھ رہا تھا۔ اُسے انڈین آرٹلری پر رہ رہ کے غصہ آ رہا تھا۔ اُس کے جاسوسوں نے بھارتی توپخانے کو پاک آرٹلری کی ایک ایک توپ کی صحیح پوزیشن، فاصلہ اور زاویہ بتا دیا تھا مگر بھارتی توپ خانہ ایک بھی پاکستانی پوزیشن کو ہٹ نہ کر سکا۔ یہی حال انڈین ایئرفورس کے ہوابازوں کا تھا۔ یکم ستمبر کو پٹھانکوٹ سے چھ ہنٹر طیارے بالکل صحیح ٹارگیٹ پر بھیجے گئے مگر ان میں سے دو واپس آئے اور باقی چار کو دو پاکستانی شاہبازوں نے چھمب میں مار گرایا۔ اس کے بعد انڈین ایئرفورس کرنل گپتا کے دیئے ہوئے کسی بھی ٹارگیٹ کو ہٹ نہ کر سکی اور پاک اور آزاد کشمیر افواج چھمب اور جوڑیاں کو روندتی اکھنور بلکہ کشمیر کے دروازے پر جا پہنچیں۔

کرنل گپتا خوش تھا کہ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان پر کھلا حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور انڈین آرمی پاکستانی سرحدوں پر پہنچ چکی تھی۔ حملہ شروع ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔

کرنل گپتا نے انڈین ایئرفورس کو پاکستان کے اندر بہت سے ٹارگیٹ بتا دیئے تھے۔ وہ ابھی اپنے جاسوسوں کے پیغامات کے مطابق اپنی برّی اور فضائی فوج کے لیے مزید ہدایات تیار کر رہا تھا کہ اُسے مخصوص وائرلیس سیٹ پر ایک اور پیغام ملا— "راجہ کالنگ .... تھری ناٹن ٹو .... بوگی .... زیرو ناٹن"۔

گپتا نے تمام پیغامات الگ پھینک کر ایک پیغام اپنے ہاتھ سے لکھا اور وائرلیس آپریٹر کو دے کر کہا— "ارجنٹ .... پٹھانکوٹ، ہلواڑہ"۔

اُس نے پیغام میں انڈین ایئرفورس کے پٹھانکوٹ اور ہلواڑہ کے ہوائی اڈوں کو لکھا تھا کہ ایک ریل گاڑی راولپنڈی کی طرف سے لاہور آ رہی ہے۔ نَو اور دس بجے کے درمیان گاڑی وزیر آباد سٹیشن کے اِدھر یا اُدھر ہو گی۔ تباہ کر دو۔ یہ فوجی گاڑی ہے۔

اور یہ پیغام دھونکل ریلوے سٹیشن پر کھڑی گاڑی کے مسافروں کے لیے پیغامِ اجل بن گیا۔ اس کے بعد کرنل گپتا کی توجہ وزیر آباد کے علاقے پر مرکوز ہو گئی اور اُس نے انڈین ایئرفورس کو اسی علاقے میں گاڑیوں پر حملوں کی ہدایات دیں۔

جب اُس نے دیکھا کہ چھ ستمبر کی دوپہر تک پاک فوج نے جنرل چوہدری کے حملے کا پلان تباہ کر دیا ہے اور جب دوسرے روز اُس نے دیکھا کہ برکی اور بیدیاں کے دروازے بھی بند ہو رہے ہیں اور پاک فوج کے ٹینک قصور کھیم کرن محور میں سرحدیں پھلانگ کر کھیم کرن پہنچنے والے ہیں تو اُس نے اُسی رات جاسوسی اور سابوتاژ کے وہ ماہر پاکستان میں اتار دیئے جنہیں اُس نے اپنے ہاتھوں ٹریننگ دی تھی۔ اُسے توقع تھی کہ جو کام پوری کی پوری انڈین آرمی اور انڈین ایئرفورس سے نہیں

ہو سکا وہ اُس کے جاسوس کر لیں گے۔ اُس نے انہیں بڑے ہی نازک ٹارگیٹ بتلائے تھے اور پاکستان کی ایسی دکھتی رگیں دکھائی تھیں کہ اگر پاکستانی بیدار نہ ہوتے تو کرنل گپتا کا یہ زمین دوز وار کبھی خالی نہ جاتا۔ اُس کے جاسوسوں کو چھپانے اور انہیں مدد دینے کے لیے پاکستان میں پہلے ہی جاسوس موجود تھے۔ پاکستان کرنل گپتا کے چنگل میں آتا دکھائی دیتا تھا۔

کرنل گپتا کے اس وار کو روکنے کے لیے پاکستان میں ایک مشینری کام کر رہی تھی اور اکبر علی اسی مشینری کا ایک کل پُرزہ تھا۔ انٹیلی جنس رپورٹوں سے اکبر علی کو پتہ چل گیا تھا کہ اُس کی ٹکر اپنے پرانے ساتھی کرنل گپتا سے ہے جو اُس کا ساتھی اور ہمنبری ہی نہیں بلکہ اُس کا گرائیں بھی تھا۔ اکبر علی کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ گپتا کا ہیڈکوارٹر جالندھر میں ہے اور اُسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ یہ ہیڈکوارٹر جالندھر کے کون سے حصے میں ہے۔ وہ پاک فضائیہ کا صرف ایک بمبار طیارہ بھجوا کر گپتا کے ہیڈکوارٹر کو تباہ کروا سکتا تھا مگر مشکل یہ پیش آئی تھی کہ گپتا نے اپنا دفتر شہر کے گنجان آباد محلے میں بنا رکھا تھا جہاں ہزار پونڈ کا ایک بم یا دو چار راکٹ گرتے تو سینکڑوں بے گناہ شہری، عورتیں اور بچے بھی مارے جاتے۔ اکبر علی نے جب بھی گپتا کے ہیڈکوارٹر پر ہوائی حملے کی سوچی، اُسے اپنے خاندان کے وہ بچے اور عورتیں یاد آ جاتی تھیں جنہیں گپتا نے دھوکے میں مروا دیا تھا۔ اکبر علی مسلمان تھا۔ وہ نہتوں پر وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آج صوبیدار اکبر علی وزیر آباد کے علاقے میں ہوائی حملے کے دوران گلیوں میں مارا مارا پھر رہا تھا تو اُسے ہاجرہ مل گئی۔ اُس نے ہاجرہ کو بے خیالی سی میں روک لیا پھر تیز قدم آگے چلا گیا۔ اُس نے وزیر آباد میں گمنام سی جگہ اپنا دفتر یا ٹھکانہ بنا لیا تھا جہاں اُس نے وائرلیس پیغامات پکڑنے کے لیے طاقت ور اور حساس سیٹ اس طرح رکھے ہُوئے تھے کہ کوئی اُسے ملنے اچانک وہاں چلا جاتا تو اُسے وہاں کچھ بھی نظر نہ آتا نہ کچھ شک ہوتا۔ اُس کے ساتھ دو تین آدمیوں کا سٹاف بھی تھا۔

اکبر علی کے وائرلیس سسٹم نے اُسے اتنا بتا دیا تھا کہ وزیر آباد کے اندر یا قریبی گردونواح میں دشمن کے جاسوس وائرلیس پر پیغامات دے رہے ہیں۔ یہ پیغامات نمبروں میں تھے یا خفیہ اصطلاحوں میں جنہیں وہ ڈی کوڈ یا ڈیسائیفر کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ کوڈ کو ڈیسائیفر کرنے کا کچھ تجربہ اُسے تھا لیکن وہ اس میں مہارت نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے انہیں ڈیسائیفر کرنے کے لیے اپنے ہیڈ کوارٹر بھیج دیا تھا جو وزیر آباد سے دور تھا۔ اُسے وہاں سے اتنا بتا دیا گیا تھا کہ وزیر آباد اور قریبی گردونواح میں دشمن کے جاسوس سرگرم ہیں۔

اکبر علی اس چکر میں گھوم رہا تھا کہ کہیں سے ایک جاسوس ہاتھ آجائے پھر وہ ساری کڑیاں ملا لے گا۔ اُس کا انداز ڈیوٹی پوری کرنے والا نہیں بلکہ ایسا تھا جیسے یہ اُس کا ذاتی معاملہ ہو اور بھارت کے ساتھ اُس کی ذاتی دشمنی ہو۔ وہ اپنے آپ میں بڑی تکلیف دہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

چھوٹا سا ایک وائرلیس سیٹ اُس کی پتلون کی جیب میں تھا جو اُسے بتا رہا تھا کہ جاسوسوں کا وائرلیس ابھی تک بول رہا ہے۔ ہاجرہ کو اُس نے روکا تو اُسے اپنی جیب سے ٹیں ٹیں کی دھیمی سی آواز سنائی دی تھی جسے ہاجرہ نہ سُن سکی تھی۔ اکبر علی دیوانہ سا ہو کے آگے نکل گیا۔ ذرا سی دیر میں اُس نے اپنی ذہانت سے پتہ چلا لیا کہ جاسوس کون سے علاقے میں ہیں لیکن کسی ایک مقام کا تعین ابھی ممکن نہ تھا۔ اُس نے سوچا کہ پولیس کو بلا کر اس علاقے کو گھیرے میں لے لے اور گھر گھر کی تلاشی لے لیکن وہ جانتا تھا کہ کرنل گپتا کے جاسوس اتنے اناڑی نہیں ہو سکتے کہ اتنی آسانی سے پکڑے جائیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُن کے سیٹ اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ سر پٹختے رہو کہیں نظر نہیں آتے۔

وہ پولیس سے کوئی کارروائی نہیں کرانا چاہتا تھا کیونکہ اس سے جاسوسوں کو ایک تو یہ پتہ چل جاتا کہ صوبیدار اکبر علی وزیر آباد میں کیوں واپس آگیا ہے اور وہ کیا کر رہا ہے۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ ایک کھلی کارروائی سے جاسوسوں کا پورا گروہ زمین کے نیچے چلا جاتا۔ پورا رِنگ چوکنّا ہو جاتا

اس لیے اکبر علی اس کوشش میں تھا کہ صرف ایک جاسوس اُس کے ہاتھ آجائے۔

صوبیدار اکبر علی کا رابطہ کیپٹن طارق کے ساتھ بھی تھا جو ہر وقت تھانے میں موجود رہتا تھا۔ اکبر علی کے ساتھ اُس کی ملاقاتیں خفیہ ہوتی تھیں۔

"صوبیدار صاحب!"— ایک ملاقات میں کیپٹن طارق نے اکبر علی سے پوچھا تھا— "آپ اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ لیفٹیننٹ اقبال کے خاندان کے متعلق آپ کچھ بتا سکتے ہیں؟"

"آپ کیا جاننا چاہتے ہیں سر؟"— اکبر علی نے پوچھا تھا— "میں اس گھر کے بچے بچے کو جانتا ہُوں"۔

"لیفٹیننٹ اقبال کی بہن شمع رات کو ریلوے لائن پر ایک لڑکے کے ساتھ پکڑی گئی تھی"— کیپٹن طارق نے اُسے پورا واقعہ سنا کر کہا تھا— "کل سے یہ لڑکی کھاریاں سی۔ ایم۔ ایچ میں زخمیوں کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے چلی گئی ہے.... کیا انہیں مشتبہ فہرست میں رکھنا چاہیئے؟"

"میرا خیال ہے نہیں"— اکبر علی نے کہا تھا— "باپ شریف آدمی ہے۔ اولاد اچھی ہے۔ اقبال کسی نیک جذبے سے فوج میں نہیں گیا تھا۔ کمبخت آوارہ تھا۔ نہیں شو باز ہیں۔ میں اس لڑکے کو جانتا ہوں جسے آپ نے تھانے بٹھا رکھا ہے"— اکبر علی کی ہنسی نکل گئی تھی۔ کہنے لگا— "اُسے میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ معلوم نہیں یہ لڑکی شمع اس کے ساتھ کیوں محبّت کرنے لگی تھی۔ یہ لڑکا تو خود لڑکی ہے۔ اس لڑکے کے ساتھ خاص قسم کے آدمی دوستی لگایا کرتے ہیں۔ اس نے کیا جاسوسی کرنی ہے۔ بہرحال شمع کو نظر میں رکھوں گا"۔

صوبیدار اکبر علی نے اس لڑکے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ پولیس اور کیپٹن طارق کا کیس تھا۔



اکبر علی کو تو اب فرصت ہی نہیں تھی کہ کسی اور طرف توجہ دے سکتا۔ اُس نے ہاجرہ کو روک تو لیا تھا لیکن وہ ایسے موڈ میں نہیں تھا کہ ہاجرہ کو پہلے کی طرح شادی بیاہ پر اُکساتا۔ اُسے تو جیسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ جس لڑکی کو اُس نے گلی میں روکا تھا وہ ہاجرہ تھی۔ وہ اب ہاجرہ کے حسن و جمال اور شادی بیاہ کی دنیا سے بہت دور نکل گیا تھا۔ اُس کی سوچ اور فکر اب بھارتی جاسوسوں پر اس طرح مرکوز ہو گئی تھی جیسے وہ اسی مقصد کے لیے پیدا ہُوا تھا۔ وزیر آباد کے گردونواح میں انڈین ایئر فورس کے تین حملے اُس کے لیے کرنل گپتا کا چیلنج بن گئے تھے، حالانکہ پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے اس علاقے میں دشمن کے دو طیّاروں کو مار بھی گرایا تھا لیکن اکبر علی کا مسئلہ اُس کے سامنے روزِ اوّل کی طرح موجود تھا۔ پچھلی تین راتیں وہ سویا بھی نہیں تھا۔

وہ ہاجرہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گلیوں میں ہوائی حملے کے بعد کا ہیجانی ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اس ہنگامے سے افواہیں بھی اُبھرنے لگیں— "ریلوے سٹیشن پر بم گرے ہیں.... چناب کے پُل پر گرے ہیں.... کنواں ٹوٹ گیا تھا اُس پر حملہ ہُوا ہے"۔

لوگوں کو ابھی معلوم نہیں تھا کہ بھارتی ہوا بازوں کے گرائے ہُوئے چار بموں میں سے

صرف ایک بم پھٹا ہے اور وہ بھی بستیوں سے بہت دُور کھیتوں میں اور پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے ایک بھارتی طیّارے کو واپس نہیں جانے دیا۔

وزیر آباد کے لوگوں کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان کے شہر کے قلب سے اجنبی سی آوازیں اُٹھ کر فضا میں گم ہو رہی ہیں جنہیں وا ہگہ سے اِس طرف ابھی کوئی نہیں سمجھ سکا۔ یہ پُراسرار آوازیں جالندھر اور وزیر آباد کو اس قدر قریب لے آئی تھیں جیسے ایک ہی جھاڑی میں گھات لگائے دو آدمی کھُسر پھُسر کر رہے ہوں۔ وزیر آباد کی یہ آوازیں جالندھر کو بتا رہی تھیں کہ ٹارگیٹ ہِٹ نہیں ہُوا۔ صرف اکبر علی تھا جو اِن آوازوں کو سُن رہا تھا اور پاگل ہُوا جا رہا تھا۔

★

ہاجرہ کی طرف پہلی سی توجہ دیئے بغیر وہ چلا گیا تو وہ سمجھی کہ اکبر علی جنگ سے خوفزدہ ہے ورنہ فوج والے اسے واپس نہ بھیج دیتے۔ وہ ہاجرہ کے لیے بالکل ہی حقیر انسان بن گیا اور اس کا سینہ فخر سے پھیل گیا کہ وہ جنگ سے خوفزدہ نہیں اور اس لحاظ سے وہ اکبر علی کے مقابلے میں سچّی پاکستانی ہے۔

جنگ سے پہلے تو ہاجرہ نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ وہ پاکستانی ہے اور پاکستانی کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اُس کا وطن اور اُس کی ساری دنیا راولپنڈی ہولی فیملی ہسپتال کے قریب ایک جھُگّی تھی جسے موت نے برسوں گزرے اُجاڑ دیا تھا اور جس پر اب بُل ڈوزر پھر گئے تھے اور اس پر اب سیٹلائٹ ٹاؤن کا ایک پختہ مکان بن گیا تھا۔ پاکستان پر تم گریں اُس کی بلا سے، اُس کا تو پاکستانی مردوں نے گلیوں میں پھرنا دوبھر کر دیا تھا لیکن راہوالی اور دھونکل پر دشمن کا ایک ہی ہوائی حملہ

ان ہی گلیوں میں جو انقلاب لے آیا تھا اس کی برقی لہریں ہاجرہ کی رگ رگ میں کیا اُس کی رُوح میں اُتر گئی تھیں۔ اسے ان ہی گلیوں سے پیار سا ہو گیا تھا اور جو آوارہ لونڈے اور جواں سال آدمی اُسے بھوکی نظروں سے گھورتے رہتے اور جو اُسے دیکھ کر فلمی گیت الاپنے لگتے تھے، اب اُسے یوں دکھائی دینے لگے جیسے یہی پاکستان کی دولت ہیں۔ اگر یہ دولت دشمن کی نذر ہو گئی تو ہاجرہ زندہ نہ رہ سکے گی۔ صبح سے رات دس بجے تک وہ ریڈیو سے کئی بار خبریں اور جنگی ترانے سنا کرتی تھی۔ ان ترانوں نے آپ ہی آپ اُس کی کوششوں کے بغیر ہی اُس کی ذات میں ایسی قوت بیدار کر دی تھی جس نے اُسے اپنے تابع کر لیا تھا۔

ایک روز باورچی خانے میں برتن دھوتے بے خبری میں ایک ترانہ گنگنانے لگی:

دھن بھاگ نیں اُنہاں ماواں دے جنہاں ماواں دے لے جائے نیں

دھن بھاگ نیں بھَین بھراواں دے جنہاں گودی ویر کھڈائے نیں

ہاجرہ کی آواز رقّت میں دب گئی اور اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں۔ وہ کسی کی ماں نہیں تھی، وہ کسی کی بہن نہیں تھی، اُس کا کوئی ماں جایا نہیں تھا۔ اُس نے کسی ویر کو گودی نہیں کھلایا تھا۔ اُسے ماں جنم دے کر اس دنیا میں تن تنہا چھوڑ گئی تھی۔ برتن دھوتے اُس کے ہاتھ رُک گئے اور وہ خلاؤں میں کھو گئی تھی۔

اپنے ماں جائے کس طرح کے ہوتے ہیں؟

ویر کیسے ہوتے ہیں؟

اُسے کچھ علم نہ تھا لیکن معاً وہ بڑی شدّت سے محسوس کرنے لگی کہ وزیر آباد شہر سے پاک فوج کے جو جوان ٹرکوں میں یا علیؓ کے نعرے لگاتے لاہور اور سیالکوٹ کی طرف گزر جاتے ہیں وہ اُس کے ماں جائے اور سگے ویر ہیں۔ اُس کے جی میں آئی کہ برتن پھینک کر سڑک پر جا کھڑی ہو اور جب کوئی فوجی ٹرک گزرے تو وہ دوپٹہ پھیلا کر اپنے ویروں کو دعائیں دے۔

اجنبی سا ایک تاثر اُس کی رگ رگ میں سماتا چلا گیا تھا اور یہ احساس اور زیادہ نکھر آیا کہ وہ تنہا نہیں نہ دھتکاری ہوئی ہے بلکہ یہ جو جنگ چھڑ گئی ہے اس کے ساتھ اُس کا بھی براہِ راست تعلق ہے۔ بعض اوقات وہ تذبذب اور اضطراب میں کھو جاتی تھی تو افضال کے ہاں جا پہنچتی تھی۔ افضال اُس کے ذہن کے سارے معمّے حل کر دیا کرتا تھا۔

★

آج بھی، ہوائی حملے کے بعد، جب صوبیدار اکبر علی اُسے مہمل سی ایک بات کہہ کر اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ افضال کے کمرے کے سامنے جا رُکی۔ اُس کا دل نیند سے ہڑبڑا کر جاگ اُٹھنے کی وجہ سے پہلے ہی گھبرایا ہُوا تھا۔ اکبر علی کو دیکھ کر اُس کا دل اور زیادہ گھبرانے لگا۔

افضال کا دروازہ بند تھا۔ ہاجرہ نے آہستہ سے دستک دی تو دروازہ کھلنے ذرا دیر لگی۔ افضال نماز پڑھ رہا تھا اور دروازہ ایک اجنبی صورت نے کھولا تھا۔ ہاجرہ ٹھٹھکی لیکن اندر چلی گئی اور چارپائی پر جا بیٹھی۔

خُدا کے حضور جھکا ہُوا افضال ہاجرہ کو فرشتوں کی طرح آسمان کے پانیوں سے دُھلا ہُوا نظر آیا۔ وہ تو خدا کے حضور سجدہ ریز تھا مگر ہاجرہ اُس کے قدموں میں سر رکھ دینے کو بیتاب ہونے لگی۔ افضال نے سلام پھیرا، دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور اجنبی سا آدمی جس نے دروازہ کھولا تھا باہر نکل گیا۔

"یہ میرا دوست ہے" — افضال نے ہاجرہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا — "بڑا اچھا آدمی ہے"

ہاجرہ کو اُس کے دوست کی یہی ایک بات بڑی اچھی لگی کہ وہ باہر نکل گیا تھا۔ افضال نے ہاجرہ کا ہاتھ وارفتگی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"افضال جی!" — ہاجرہ لجاتی ہُوئی سی آواز میں بولی — "جی چاہتا ہے میں بھی نماز پڑھا کروں، پر آتی نہیں"

"اوہ!" — افضال یوں چونکا جیسے دل میں خنجر اُتر گیا ہو — "تمھیں نماز نہیں آتی؟" — پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں بولا — "آ ہی کیسے سکتی ہے! جن کے تم برتن اور کپڑے دھوتی ہو انہیں تمھاری عاقبت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے!... اُن کی نظر میں تو تم انسان بھی نہیں ہو... میں تمھیں نماز یاد کرا دوں گا" — اور اس نے بات کا رخ پھیر دیا۔

بات کا رخ ایسا پھرا کہ افضال کی انگلیاں ہاجرہ کے ریشمی بالوں میں پھرنے لگیں اور ہاجرہ

کا سر افضال کے کندھے پر جا پڑا۔ دونوں صوم و صلوٰۃ کی دنیا سے دُور نکل گئے۔ افضال کی انگلیوں کے لمس اور اُس کے جسم کی بُوباس سے مخمور ہو کر ہاجرہ ایسی دنیا میں جا پہنچی جہاں وہ غریب اور بے آسرا نوکرانی نہیں، افضال کی مقدس دنیا کی ملکہ تھی۔

"افضال جی!" — ہاجرہ نے کہا — "وہ لوگ مجھے کیوں اچھے نہیں لگتے جو مجھے بھوکی نظروں سے دیکھتے ہیں؟"

"اس لیے کہ اُن کی نظریں بھوکی ہیں" — افضال نے کہا — "اُن کی نظریں پاک نہیں.... میری آنکھوں میں دیکھو.... ان آنکھوں میں وہ بھوک نہیں"

"تمہاری آنکھیں پاک ہیں افضال جی!"

دروازے پر دستک ہوئی پھر خود ہی دروازہ کھل گیا اور طلسم ٹوٹ گیا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ دروازے میں صوبیدار اکبر علی کھڑا تھا۔ ہاجرہ کا دل بے طرح دھڑکنے لگا جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ دوسرے ہی لمحے اُس کا دل نفرت اور حقارت سے اَٹ گیا۔ اُس نے اکبر علی سے ہمیشہ نفرت کی تھی لیکن اُس روز وہ اُس کی نگاہ میں بدی اور کفر کا جیتا جاگتا مجسّمہ بن گیا۔ ہاجرہ نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔ اُس نے اُسے بڑے ہی حسین خواب سے جگا دیا تھا۔ ہاجرہ کو یہ ڈر بھی لگا کہ اکبر علی اُس کے گھر والوں کو بتا دے گا کہ اُس نے ہاجرہ کو بڑی گندی حالت میں ایک آدمی کے ساتھ دیکھا ہے۔

"آپ رہتے ہیں یہاں؟" — اکبر علی نے افضال سے پوچھا — "معافی چاہتا ہوں بغیر اجازت اندر آ گیا ہوں.... آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"میں طالب علم ہوں" — افضال نے شائستگی سے کہا — "مذہب کا طالب علم..... آپ بغیر اجازت اندر چلے آئے ہیں تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ آپ میرے والد ہیں۔ بیٹھیے نا! آپ تو کھڑے ہیں۔ میں یہاں جامع مسجد میں....."

وہ کہے جا رہا تھا اور اکبر علی کی نظریں کمرے میں گھوم رہی تھیں۔ انگیٹھی اور میز پر کتابیں اور کاپیاں رکھی تھیں۔ فرش پر جائے نماز اور اس پر تسبیح پڑی تھی اور بغیر کواڑوں کی ایک الماری میں دو قرآن رکھے تھے۔

ہاجرہ اکبر علی کو یوں گھور رہی تھی جیسے اُسے کچا چبا ڈالنا چاہتی ہو۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ہاجرہ!" — اکبر علی نے مُسکرا کے پوچھا — "تم یہاں کیسے؟"

"یہ میرے پاس آیا کرتی ہے" — افضال بول پڑا — "نیک لڑکی ہے۔ میں اسے قرآن کا سبق دیا کروں گا۔ ابھی ابھی کہہ رہی تھی کہ نماز نہیں آتی۔ میں اسے نماز....."

"ضرور جی ضرور" — اکبر علی نے ہاجرہ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا — "اس سے بڑھ کر اور نیکی کیا ہو گی!" — اُس نے ایک بار پھر گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور آہ سی لے کے بولا — "مجھے اندر آنے کا کوئی حق نہ تھا۔ آپ کے متعلق یہی کچھ سنا تھا جو آپ نے بتایا ہے۔ بس آپ کو دیکھنے کا شوق تھا۔ خدا ہم سب کو خدا اور رسولؐ کا علم حاصل کرنے کی توفیق دے"

"آپ بیٹھیں گے نہیں؟" — افضال نے پوچھا۔

"شکریہ عزیز بھائی!" — اکبر علی نے کہا — "خدا حافظ" — اور وہ باہر نکل گیا۔

★

"یہ مردُود میرے پیچھے آیا تھا" — ہاجرہ نے پُر نفرت لہجے میں کہا — "پکّا بدمعاش ہے کمبخت لڑائی پہ چلا گیا تھا لیکن بھاگ آیا ہے۔ نامراد کو کافر کی گولی نے بھی منہ نہیں لگایا۔ مجھے کہتا رہتا ہے کہ مجھ سے بیاہ کر لو۔ دن بھر چوپٹ کھیلتا رہتا ہے" — اور اُس نے افضال کو تفصیلاً سنا دیا کہ اکبر علی اُسے کس طرح راہ میں روک روک کر پریشان کرتا رہتا ہے اور اب سائے کی طرح اُس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کہنے لگی — "میں ادھر آ رہی تھی تو اس نے مجھے راستے میں روک لیا۔ میں تمہارے پاس آ گئی تو یہ میرے پیچھے آ گیا"

"یہ شخص اگر اب تمہاری راہ روکے تو مجھے بتانا" — افضال نے کہا۔ اُس کا چہرہ غصّے سے لال سرخ ہو گیا۔ عتاب آلود آواز میں بولا — "میں اسے قتل کر دوں تو یہ گناہ نہیں ہو گا.... خُداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمان عورت کی آبرو کی خاطر خون بہانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں تمہاری آبرو کا رکھوالا ہوں ہاجرہ! سینہ تان کر گلیوں میں پھرو"

ہاجرہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اُسے کب کوئی آبرو کا رکھوالا مِلا تھا۔ آج افضال نے اُسے پناہ میں لے لیا تو اُسے ماں یاد آ گئی جس نے اسے بے رحم سردی سے بچایا تھا۔ افضال کے سراپا میں اُسے خدا نظر آنے لگا۔ اُس نے لپک کر افضال کا ہاتھ تھاما اور دیوانہ وار ہاتھ کو چُومنے لگی اور اُسے یوں عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے لگی جیسے وہ اکیلا سارے پاکستان کی آبرو کا رکھوالا ہو۔

"تم اب گھر جاؤ" — افضال نے اُسے کہا — "بہت دیر ہو گئی ہے"

ہاجرہ اٹھی اور اس طرح چل پڑی جیسے قدم اُٹھ نہ رہے ہوں۔ وہ اس کمرے سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ دروازے میں جا کر رک گئی اور پیچھے مڑی۔

"افضال جی!" — اُس نے کہا — "یہ بدبخت میرے گھر والوں کو بتا دے گا اور وہ لوگ مجھے بُری بُری باتیں کہیں گے۔ انہیں زیادہ غصّہ آیا تو گھر سے نکال دیں گے"

"گھر سے نکالا تو میرے پاس آ جانا" — افضال نے کہا — "اور اس اکبر علی کو تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا"

ہاجرہ کا سر اونچا ہو گیا اور وہ نڈر ہو کر کمرے سے نکل گئی۔

★

اُس وقت جب ہاجرہ افضال کے کمرے سے نکلی تھی، بیدیاں سیکٹر میں سکوت سا طاری ہو گیا تھا۔ محاذوں پر اس قسم کا سکوت بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہُوا کرتا ہے۔ بیدیاں کا محاذ اتنا سرگرم نہیں رہا تھا جتنے دوسرے محاذ تھے۔ بیدیاں۔ لاہور اور قصور کے سیکٹروں کا جنکشن پوائنٹ بنا ہُوا تھا۔ دشمن کی توجہ ایک تو لاہور پر مرکوز تھی جہاں وہ ریز روکا ڈویژن بھی جھونک کر بی آر بی پار کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔

اس سے زیادہ توجہ دشمن نے قصور کھیم کرن سیکٹر پر مرکوز کر رکھی تھی کیونکہ پاک فوج دشمن

کے علاقے میں خاصی آگے نکل گئی تھی اور کھیم کرن جیسا اہم قصبہ پاکستانی ٹروپس کے قبضے میں تھا۔ دشمن ہمارے ٹروپس کو پیچھے دھکیلنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ وہاں بھی دشمن نے اپنے ریزرو ڈویژن جھونک دیئے تھے جن میں نمبر دو انڈی پینڈنٹ (بکتر بند) بریگیڈ گروپ بھی تھا۔

کھیم کرن کی ایک اہمیت تو جنگی تھی۔ وہاں سے ایک سڑک امرتسر کو جاتی تھی۔ دشمن کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ پاک فوج اس سڑک پر امرتسر کی طرف پیشقدمی کرے گی۔ اس سے انڈین آرمی کے وہ ڈویژن جو لاہور سیکٹر میں لڑ رہے تھے گھیرے میں آجاتے تھے۔ دوسری اہمیت جذباتی تھی۔ بھارت کے عوام کو پتہ چل گیا تھا کہ پاکستانیوں نے کھیم کرن پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ آگے بڑھے آرہے ہیں۔ اس سے اتنی دہشت پھیلی کہ فیروز پور شہر تو خالی ہو ہی چکا تھا، جالندھر بھی خالی ہو گیا۔ وہاں سے ہندوؤں اور سکھوں نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

نہتے شہریوں کو تو بھاگنا ہی تھا، خود فوج بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جو انڈین آرمی کی ہائی کمانڈ کے ریکارڈ پر ہے کہ انڈین آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل چوہدری نے کھیم کرن کے محاذ پر لڑنے والی اپنی فورس کو حکم دے دیا تھا کہ پیچھے ہٹ آئیں اور دریائے بیاس کے بھارت والے کنارے پر دفاعی مورچے قائم کریں۔ پاکستانی توپخانے کے گولے فیروز پور شہر میں گر رہے تھے۔ ان حالات میں جنرل چوہدری نے غالباً اپنا یہ حکم واپس لے لیا تھا کہ اس کے اس محاذ والے ڈویژن اور بریگیڈ وغیرہ پیچھے ہٹ آئیں۔ وجہ یہ تھی کہ دلّی کا سیکریٹریٹ یعنی مرکزی حکومت کے دفاتر الہ آباد کو منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اپنی قوم کے مورال کو سنبھالا دینے کے لیے دشمن نے اس سیکٹر میں مزید کمک بھیج دی۔ وہاں جو ٹینک رجمنٹیں اور دیگر ٹروپس دشمن نے لڑائے اُن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

نمبر اکتالیس ماؤنٹین بریگیڈ۔ نمبر دو انڈی پینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ گروپ۔ نمبر چار انڈین ماؤنٹین ڈویژن۔ نمبر دو رائل لانسرز (ٹینک رجمنٹ)۔ نمبر تین کیولری (ٹینک رجمنٹ)۔ نمبر چودہ سندھ ہارس (ٹینک رجمنٹ)۔ رائل دکن ہارس (ٹینک رجمنٹ)۔ نمبر آٹھ کیولری (ٹینک رجمنٹ)۔ نمبر باسٹھ کیولری (ٹینک رجمنٹ جسے جموں سے بلایا گیا تھا)۔ نمبر ایک سو چار انفنٹری بریگیڈ۔ نمبر سات گورکھا رجمنٹ۔ نمبر نو گورکھا رجمنٹ۔ نمبر تیرہ جاٹ رجمنٹ۔ نمبر تیرہ سکھ رجمنٹ۔ نمبر چار سکھ رجمنٹ۔ اس اتنے بڑے لشکر کی مدد کے لیے کور آرٹلری کے علاوہ نمبر چھیاسٹھ اور نمبر سترسٹھ میڈیم ہیوی آرٹلری اور ان کے پیچھے نمبر ایک ہیوی آرٹلری بریگیڈ تھا۔

نمبر چار سکھ رجمنٹ جس کا کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل اننت سنگھ تھا، جنگ کے تیسرے روز ہی پوری کی پوری اس طرح ختم ہو گئی تھی کہ پاکستان کی ایک بٹالین کے گھیرے میں آگئی۔ سکھوں کی اس رجمنٹ کی آدھی نفری ماری گئی اور باقی نصف کو بچانے کے لیے کرنل اننت سنگھ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح نمبر چار سکھ رجمنٹ کی آدھی نفری اپنے کمانڈنگ آفیسر سمیت جنگی قیدی بن گئی اور جنگ کا باقی عرصہ قیدی کیمپ میں عیش موج کرتی رہی۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دشمن کے توپخانے نے جتنی گولا باری اس محاذ پر پاکستانی ٹروپس

پر کی اتنی شاید چونڈہ میں بھی نہ کی ہو گی جہاں ٹینکوں کی بہت بڑی جنگ لڑی گئی تھی۔ صرف ایک رات کے چار گھنٹوں میں دشمن کے توپ خانے نے پاکستانی مورچوں پر چھوٹی بڑی توپوں کے پینتالیس ہزار گولے فائر کیے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ کے باقی دنوں میں دشمن نے کتنے لاکھ گولے فائر کیے ہوں گے لیکن پاکستانی ٹروپس جہاں پہنچ گئے تھے وہاں سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔

وہ تو ایک قیامت تھی یا وہ آتشِ نمرود تھی جس میں عاشقانِ رسولؐ کود گئے تھے۔



لاہور اور کھیم کرن سیکٹر کے درمیان بیدیاں تھا۔ بیشک وہاں کوئی قابلِ ذکر سرگرمی نہیں تھی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ پاکستانی ٹروپس جو وہاں مورچہ بند تھے وہ چاق و چوبند نہ رہتے۔ اُن کے دائیں بائیں خاصا علاقہ خالی تھا یعنی وہاں پاکستان کا کوئی دفاعی مورچہ نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ نفری بہت کم تھی۔ ان خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے رات کو دس دس بارہ بارہ اور اس سے بھی زیادہ نفری کی لڑاکا گشتی پارٹیاں بھیجی جاتی تھیں تاکہ دشمن "بائی پاس" نہ کر سکے۔ یہ ذمہ داری لیفٹیننٹ اقبال کی بٹالین، ایسٹ بنگال رجمنٹ کی تھی کہ وہ سامنے کے علاوہ دائیں بائیں کا بھی خیال رکھے۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے جنگ کے دوران بریگیڈ ہیڈ کوارٹر یا ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے کوئی حکم نہیں آیا کرتا۔ یہ اس بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ اپنے علاقے کا دفاع کس طرح کرتا ہے۔

اُس روز بیدیاں کے محاذ پر اچانک سکوت چھا گیا۔ اس سے پہلے وہاں بڑی مشین گنوں اور توپ خانوں کے فائر کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا جو دونوں طرف سے یہ اعلان ہوتا تھا کہ ہم موجود ہیں اور لڑنے کے لیے تیار۔ دن کے تیسرے پہر لیفٹیننٹ اقبال کے بٹالین کمانڈر نے تمام افسروں کی کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس میں پلاٹون کمانڈروں تک کو بلایا گیا۔ اس طرح لیفٹیننٹ اقبال بھی کانفرنس میں گیا۔

"آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ محاذ خاموش ہو گیا ہے" — کمانڈنگ آفیسر نے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا — "اس سے آپ لوگ یہ تو نہیں سمجھ رہے ہوں گے کہ اُدھر دشمن ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ اس خاموشی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دشمن بہت بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں نے دیہاتیوں کے ذریعے جو معلومات حاصل کی ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دشمن بہت بڑا حملہ کرے گا۔ دشمن کے لیے کھیم کرن کی صورتِ حال بڑی شرمناک ہو گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہاں دشمن ہمارے ٹروپس کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ وہ یہ چال ضرور چلے گا کہ بیدیاں پر زوردار حملہ کر کے نہر پار کرے گا....

"اس وقت تک آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دشمن کے ہر حملے کا انداز ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہمارا دشمن بڑی تیز اور شدید گولا باری کا اور اس گولا باری کے سائے میں ہجوم کی صورت میں حملہ کرنے کا قائل ہے۔ اس وقت تمام محاذوں کی صورتِ حال یہ ہے کہ دشمن کی اتنی طاقت ور

یلغار کو نہ صرف روک لیا گیا ہے بلکہ کئی علاقوں میں دشمن کو پیچھے دھکیل کر اُسے اتنا زیادہ نقصان پہنچایا گیا ہے کہ اُس کے لیے ری گروپنگ تک دشوار ہوگئی ہے۔ چونڈہ میں اُس کی بکتر بند یلغار کا دم خم توڑ دیا گیا ہے۔ زیادہ خطرہ وہیں تھا کیونکہ پاک آرمی میں ٹینکوں کی بہت زیادہ کمی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہاں تک خطرہ مول لیا گیا ہے کہ کھیم کرن جیسے نازک محاذ سے ایک ٹینک رجمنٹ اور ایک بکتر بند بٹالین کو چونڈہ بھیج دیا گیا ہے۔ لاہور کے محاذ سے ایک ٹینک رجمنٹ کے دو سکواڈرن نکال کر چونڈہ بھیجے گئے ہیں۔"

کمانڈنگ آفیسر اچانک خاموش ہوگیا۔ اُس کی نگاہیں تمام افسروں پر گھوم گئیں۔ سب پر خاموشی طاری تھی۔ کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ آؤٹ پوسٹ کی مشین گنوں کی تھی جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دو برسٹ فائر کرتی تھیں۔ دوسری آوازیں لاہور اور کھیم کرن کے محاذوں کے توپ خانوں اور ٹینکوں کی توپوں کی تھیں۔ یہ آوازیں ایسی تھیں جیسے بچے بینڈ کے بڑے ڈرموں کو پیٹ رہے ہوں۔ بنگال ٹائیگرز کے افسروں کی یہ کانفرنس زمین کے نیچے ہو رہی تھی۔ اوپر سے کوئی جوان اور اِکّا دُکّا ٹرک گزر جاتا تھا۔

"میرے دوستو!"— کمانڈنگ آفیسر نے غیر فوجی لہجے میں کہا —"ہم سیاستدان نہیں، ہم سیاستدانوں کا آلۂ کار ہیں۔ فوج برسرِ اقتدار سیاسی لیڈروں کی تلوار ہوتی ہے۔ وہ جب چاہیں اس تلوار کو نیام سے نکال لیں جب چاہیں نیام میں ڈال لیں۔ ہم تلوار بھی ہیں اور ملک کی ڈھال بھی۔ ہمیں حکم ماننا ہے۔ ہم سوال نہیں کر سکتے لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اپنے سر پر کھڑے دشمن کے عزائم اور اُس کی تیاریوں کو دیکھ کر بھی ہماری حکومت نے اپنی فوج کو بہتر طریقے سے مسلّح کرنے کی اور دشمن کی نفری کے مطابق اپنی نفری بڑھانے کی کبھی بھی نہ سوچی۔ دشمن نے جس نفری اور جس پاور سے حملہ کیا ہے، اگر ہمارے پاس اس کا نصف بھی ہوتا تو ہم ۷، یا ۸ ستمبر کے روز دشمن کے علاقے میں ہوتے اور دشمن کو اپنا ملک بچانے کے لیے جان کے لالے پڑے ہوتے۔ ہم دشمن کو کم از کم پچاس برسوں تک پاکستان کی طرف دیکھنے کے بھی قابل نہ رہنے دیتے۔"

کمانڈنگ آفیسر پھر خاموش ہوگیا۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسّم آگیا۔ اس تبسّم میں شگفتگی کم اور تھکن اور شب بیداری کا تاثر زیادہ تھا۔

"بہرحال!"— اُس نے آہ بھر کر کہا —"ہمیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ نفری اور سامان کی کمی کو جذبے سے پورا کرنا ہے۔ آپ سب نے اور جوانوں نے معجزے کر دکھائے ہیں۔ انہیں اللہ اجر دے گا۔ تمغۂ جرأت، ستارۂ جرأت، ہلالِ جرأت دنیاوی انعام ہیں.... مجھے کہنا یہ ہے کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی بلکہ جنگ کا عروج اب شروع ہُوا ہے۔ دشمن باؤلا ہو رہا ہے۔ اب ہمیں اور زیادہ محتاط رہنا پڑے گا....

"ہماری فائٹنگ پٹرولیں تو چل ہی رہی ہیں لیکن ہمیں دشمن کے آنے والے حملوں کو آنے سے پہلے ہی درہم برہم کرنا ہے.... کیا آپ سمجھتے ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟.... ہاں.... فائٹنگ

پٹرولوں کی نفری زیادہ کریں گے اور اب پٹرولیں ذرا اور آگے جایا کریں گی۔ اپنے جوانوں کو اچھی طرح سمجھا دیں، خاص طور پر عہدیداروں کو سمجھائیں کہ اب پٹرولیں اتنی آگے جایا کریں گی کہ دشمن کی پوزیشنوں کو دیکھ سکیں اور ضرورت سمجھیں تو دشمن کو تباہ کرنے کی کوشش کریں، لیکن اپنے آپ کو بچا کر۔ یہ تو عہدیداروں کو معلوم ہی ہے کہ رات کو دشمن کی کوئی نقل و حرکت دیکھیں تو اس کی پوری رپورٹ دیں۔"

کمانڈنگ آفیسر نے اس ضمن میں تمام ہدایات دے کر آخر میں پوچھا —"کوئی شک؟ کوئی سوال؟"

"یس سر!"— لیفٹیننٹ اقبال نے کہا —"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں سر! آپ نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ فائٹنگ پٹرولیں تو پہلے کی طرح جا رہی ہیں۔ میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ سب سے جونیئر میں ہی ہوں۔ اگر غلطی...."

"کہو، کہو اقبال!"— کمانڈنگ آفیسر نے کہا —"جونیئر ہو تو کیا ہُوا؟ سیکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ کوئی شک، کوئی سوال، کوئی مشورہ، کوئی تجویز ذہن میں آئے تو اسے زبان پر لے آؤ۔ غلط ہونے کی صورت میں تمھاری تصحیح ہو جائے گی۔"

"سر!"— اقبال نے کہا —"میں دشمن کی پوزیشنوں کے عقب میں کمانڈو آپریشن کا مشورہ دیتا ہوں۔"

تمام افسروں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ دشمن کے عقب میں کمانڈو کارروائی انتہائی دلیرانہ اور بڑی ہی خطرناک کارروائی ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ یہ تجویز لیفٹیننٹ اقبال نے پیش کی تھی۔ اُسے سب جانتے تھے کہ وہ افسر کم اور کالج سٹوڈنٹ زیادہ ہے۔ اُس کے ساتھی افسر اور سینئر افسر اُسے صرف اس لیے پسند کرتے تھے کہ وہ زندہ دل اور ہنسنے ہنسانے والا لیفٹیننٹ تھا لیکن اُس کا کمپنی کمانڈر، ایجوٹنٹ اور کوارٹر ماسٹر اکثر کہا کرتے تھے کہ کبھی لڑائی ہوگئی تو اقبال گولی قریب سے گزر جانے سے ہی جامِ شہادت نوش کر جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے ساتھی افسر اُس کا مشورہ سن کر زیرِ لب مُسکرائے تھے۔

انہیں ابھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ جنگ کی ابتدا میں لیفٹیننٹ اقبال ویسا ہی ثابت ہُوا تھا جیسا وہ سمجھتے تھے اور وہ اپنی پلاٹون کے نائب صوبیدار بدر الحق کی نظروں میں ایک مذاق بن چکا تھا لیکن اب اقبال وہ اقبال نہیں رہا تھا۔ اب جو وہ کمانڈو آپریشن کا مشورہ دے رہا تھا وہ دل کی گہرائیوں سے دے رہا تھا اور اس میں جذبے کی حرارت تھی۔

اُس کے ساتھیوں کو پتہ چل ہی نہیں سکتا تھا۔ اُن کی پوزیشنیں ایک دوسرے سے دُور دُور تھیں جو گولا باری کے گرد و غبار میں چھپی رہتی تھیں۔ پہلے دنوں میں تو دشمن کے تابڑ توڑ حملوں نے کسی کو اپنی ہوش بھی نہیں رہنے دی تھی۔ وہ اب سوچ رہے تھے کہ اقبال کی پلاٹون اگر جم گئی تھی تو یہ اُس کے صوبیدار، نائب صوبیدار اور سیکشن کمانڈروں کی بدولت ہے۔ اقبال تو ڈرا ہُوا افسر بنا رہا ہوگا۔

وہ جس کمانڈو ایکشن کا مشورہ دے رہا تھا، وہ کوئی نیا مشورہ نہیں تھا اور یہ کوئی عجیب مشورہ بھی نہیں تھا۔ دوسرے محاذوں پر دشمن کی پوزیشنوں کے عقب میں کمانڈو کارروائیاں کی جا رہی تھیں۔ ٹینک ہنٹنگ (شکار) پارٹیاں بھی جاتی تھیں۔ جب دشمن کی نفری زیادہ ہوا اور اُس کے حملوں میں شدت آگئی ہو تو رات کو آٹھ دس یا اس سے کم یا زیادہ جوانوں کی پارٹی دشمن کے اگلے مورچوں کے پیچھے چلی جاتی ہے اور تباہی پھیلا کر آجاتی ہے لیکن پوری پارٹی کبھی واپس نہیں آتی۔ آٹھ دس میں سے چار پانچ جوانوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

ٹینک شکار پارٹیاں تو اس سے بھی زیادہ شجاعت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ٹینک دن کو آگے لڑتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد یہ لڑنے کے قابل نہیں رہتے۔ اندھے ہو جاتے ہیں۔ انہیں اگلے مورچوں سے دور پیچھے لے جاتے ہیں۔ رات کو ان تک پہنچنا ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کوئی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے میں کود گیا ہو۔ ٹینک شکار پارٹیاں اُن تک پہنچتی اور انہیں راکٹ لانچروں سے تباہ کرتی ہیں مگر ان پارٹیوں کو جانوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔

★

"ہاں اقبال!" — کمانڈنگ آفیسر نے بڑی سنجیدگی سے کہا — "یہ ایسی جنگ ہے جو پاک آرمی کمانڈو پارٹیوں اور ٹینک ہنٹنگ پارٹیوں اور فائٹنگ پٹرولوں کے سہارے لڑ رہی ہے۔ دشمن کو دباتے رکھنے کے لیے پاک آرمی اپنے جوانوں کو ان کارروائیوں میں قربان کر رہی ہے.... میں ابھی فائٹنگ پٹرولوں پر اکتفا کر رہا ہوں۔ شاید ہمیں کمانڈو آپریشن کی بھی ضرورت پڑ جائے۔"

"سر! آپ یہ نہ کہیں، شاید ضرورت پڑ جائے" — اقبال نے یہ کہہ کر سب کو چونکا دیا — "میں آپ کے تجربے اور آپ کی اتھارٹی کو چیلنج نہیں کر رہا۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں کمانڈو ایکشن کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں اور میں یہ درخواست بھی کرتا ہوں کہ پہلی کمانڈو پارٹی کے ساتھ میں خود جاؤں گا۔"

"میں تمہارے جذبے کی تعریف کرتا ہوں اقبال!" — کمانڈنگ آفیسر نے کہا — "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم کمانڈو ایکشن کی ضرورت کیوں محسوس کر رہے ہو؟"

لیفٹیننٹ اقبال کی پلاٹون کے مورچے بالکل باہر یعنی پہلو پر اپنی کمپنی سے خاصے دور تھے۔ اس سے آگے جگہ خالی تھی۔ اقبال نے اور نائب صوبیدار بدرالحق نے دیکھا تھا جیسے دشمن اُس طرف کوئی نقل و حرکت کر رہا ہو۔ دُوربین سے اُسے ٹینک بھی دکھائی دیئے تھے۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ درخت بہت تھے۔ سرکنڈے، اونچی گھاس اور جھاڑیاں بھی تھیں۔ ان کے علاوہ زمین ایسی تھی کہ اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔ وہ زمین نشیبی تھی۔

لیفٹیننٹ اقبال نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو تفصیل سے بتایا کہ وہ دو دنوں سے کیا دیکھ رہا ہے۔

"سر!" اُس نے کہا — "آپ نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ آپ کو اپنے ذرائع سے پتہ

چلا ہے کہ دشمن حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دشمن اپنے ٹروپس کو وہیں جمع کر رہا ہے۔ ہمارے پاس میڈیم یا ہیوی توپخانے کی بیٹری نہیں.... آپ مجھے کمانڈو ایکشن کی اجازت دیں۔"

"کتنی نفری کی پارٹی لے جاؤ گے؟"

"صرف دس!" — اقبال نے جواب دیا — "ایک حوالدار ساتھ ہوگا۔"

"اقبال!" — کمانڈنگ آفیسر نے کہا اور اس سے آگے وہ نہ بول سکا۔ اُس نے تمام افسروں پر نگاہ دوڑائی اور سر جھکا لیا۔ چند سیکنڈ بعد اُس نے سر اٹھایا اور کہنے لگا — "چونکہ ہمارے سامنے ویسی سرگرمی نہیں تھی جیسی دوسرے محاذوں پر ہے اس لیے میں کمانڈو ایکشن کو نظرانداز کر رہا تھا۔ میں اس کارروائی کو کسی اور وقت کے لیے، کسی اور صورتِ حال کے لیے التوا میں ڈال رہا تھا۔ تم نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے تو میں نہیں چاہتا کہ تمہارے جذبے کا میں گلا گھونٹ دوں۔ اپنا پلان بتاؤ۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ صورتِ حال کمانڈو ایکشن کا ہی مطالبہ کرتی ہے تو تمہیں اجازت دے دوں گا.... لیکن اقبال! میں تم سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ تمہیں معلوم ہے کہ کمانڈو ایکشن کس قدر نازک اور کتنی خطرناک کارروائی ہے؟"

"یس سر!" — اقبال نے جواب دیا اور مُسکرا کر بولا — "یہ دشمن کے عقب میں جا کر ہی پتہ چلے گا کہ یہ کارروائی کتنی نازک اور کتنی خطرناک ہوتی ہے۔"

فوج میں اس انداز اور اس لہجے میں بات نہیں کی جاتی جس طرح اقبال کا بٹالین کمانڈر کر رہا تھا اور جس طرح اقبال مشورہ دے رہا تھا۔ فوج میں دوٹوک بات ہوتی ہے۔ یہ کام کرو یا نہ کرو۔ لیکن جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء ایسی نوعیت کی جنگ تھی جسے پاک افواج کا ہر افسر اور جوان اپنی ذاتی جنگ سمجھ رہا تھا۔ فوجی ڈسپلن اور عہدوں کی اونچ نیچ کو نظرانداز کیے بغیر ہر کوئی اپنا اپنا دماغ استعمال کر رہا تھا اور ہر کوئی سوچتا تھا کہ اپنے ملک کے دفاع کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔

کمانڈنگ آفیسر نے اقبال کو اجازت دے دی۔

★

"اوئے بالے!" — کانفرنس سے باہر آکر اقبال کے ایک ساتھی لیفٹیننٹ نے اُسے کہا — "آگے جانے سے پہلے گھر سے ہو آ۔ اپنے ماں باپ سے کہہ آ کہ میں کمانڈو پارٹی آگے لے جا رہا ہوں، میری قبر تیار رکھنا۔"

"انہیں کہہ آنا کہ رشتہ داروں کو ابھی اطلاع دے دیں کہ اقبال شہید ہو گیا ہے" — کیپٹن کوارٹر ماسٹر نے اُسے کہا — "انہیں جنازے کا ٹائم بتا آنا۔"

"لاش تو اس کی ملے گی نہیں" — اُس کے ساتھی لیفٹیننٹ نے کہا — "نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھی جائے گی۔"

اقبال ہنس رہا تھا۔ اُسے یہ ہنسی مذاق اچھا لگ رہا تھا۔

"بالے!" — کیپٹن کوارٹر ماسٹر جو اُس کا دوست تھا، بولا — "تمہاری زندگی تو بس آج ہی آج

ہے۔ میرا ایک کام کرتے جاؤ.... وہ فوٹو مجھے دیتے جاؤ.... کیا نام ہے اُس کا؟.... ہاں، کیپٹن عصمت.... نرسنگ سروس میں ہے نا! ایک تو اُس کا فوٹو دیتے جاؤ اور دوسرے اُس کے نام ایک رقعہ لکھ دو۔"

"رقعے میں کیا لکھوں؟" ___ اقبال نے پوچھا۔

"لکھ دو" ___ کیپٹن کوارٹر ماسٹر نے کہا ___ "بس اتنا لکھ دو کہ میں آج رات شہید ہو رہا ہوں، لہٰذا اب تم حاملِ رقعہ ہذا کے ساتھ شادی کر لو۔"

"اپنا منہ دھو کر رکھو" ___ اقبال نے کہا ___ "میں اُس کے ساتھ شادی کرنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ اُس کی محبت مجھے زندہ رکھے گی۔ وہ تو تمہارے مُنہ میں...."

"چلو اُسے چھوڑو یار!" ___ لیفٹیننٹ نے کہا ___ "وہ جو کچھ ستمبر سے پہلے تم کہتے تھے کہ اپنی نوکرانی کو دھوکے میں لاہور بلاؤ گے اور کسی ہوٹل میں ایک رات رکھو گے، اُس کے نام لکھ دو کہ میرے ساتھ آجاتے۔"

"اوئے خبیثو!" ___ اقبال نے انہیں کہا ___ "اچھے دوست ہو۔ یہ دُعا کیوں نہیں کرتے کہ خدا مجھے زندہ واپس لاتے۔"

"میرا خیال ہے تم زندہ ہی واپس آؤ گے" ___ لیفٹیننٹ نے کہا ___ "شہادت کا رُتبہ تم جیسے لفنگوں کو نہیں مِلا کرتا۔"

"واپس آکر بات کروں گا" ___ اقبال نے ہنستے ہوتے کہا ___ "مجھے ابھی جا کر کمانڈو پارٹی تیار کرنی ہے" ___ اور وہ چل پڑا۔

"بالے!" ___ کیپٹن کوارٹر ماسٹر نے اسے پکارا۔

اقبال نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ کیپٹن اور لیفٹیننٹ وہیں کھڑے تھے۔ دونوں اقبال کی طرف چل پڑے۔ اقبال اُن کی طرف چلا اور اُن کے سامنے جا رکا۔ اُس نے دیکھا کہ دونوں کے چہروں پر سنجیدگی تھی۔ کیپٹن نے اُسے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔ اُس نے چھوڑا تو لیفٹیننٹ اُس کے گلے لگ گیا۔

"اللہ تجھے کامیابی اور زندگی دے بالے!" ___ کیپٹن کوارٹر ماسٹر نے کہا ___ "جا، اللہ تیرے ساتھ جائے گا۔"

"قوم کا ہم پر قرض ہے بالے!" ___ لیفٹیننٹ نے کہا ___ "شہیدوں کا ہم پر قرض ہے جو ہم تم ادا نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا.... تُو نہ رہا تو میں تیرے پیچھے جاؤں گا۔ دشمن بی آر بی سے اِدھر نہیں آتے گا۔"

اقبال پر جذبات کی رقّت طاری ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ اُس نے دونوں کو سلیوٹ کیا اور اپنی پلاٹون کے مورچوں کی طرف چلا گیا۔ چلتے چلتے رُک گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر فوٹو نکالا۔ یہ نرسنگ سروس کی کیپٹن عصمت کا فوٹو تھا۔ فوٹو میں عصمت مُسکرا رہی تھی۔ اتنی جانفزا مسکراہٹ کہ اقبال جیسے بھول گیا ہو کہ وہ میدانِ جنگ میں کھڑا ہے۔

وہ کیپٹن عصمت کی مُسکراتی ہوئی تصویر میں گُم ہو گیا۔ فضا میں ایک گرجدار زناٹے نے اُسے اِس طلسم سے بیدار کر دیا۔ اِس زناٹے کے ساتھ ہی انتہائی تیز "تڑ تڑ تڑ" بلند ہوئی۔ اقبال کے دائیں

طرف بمشکل تین چار گز دور زمین میں گولیاں لگیں۔ اقبال بائیں کو گرا اور زمین کے ساتھ چپک گیا ___ دشمن کا ایک طیارہ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے مورچوں پر گولیاں برساتا گذر گیا تھا۔ مورچوں کی طیارہ شکن مشین گنوں نے بے تحاشہ فائر کھول دیا۔ اقبال پیٹ کے بل رینگتا ایک درخت کے تنے تک چلا گیا اور اُس کی آڑ میں ہو گیا۔

فوراً بعد دوسرا طیارہ آیا اور پہلے کی طرح مشین گنوں سے گولیوں کا مینہ برساتا گزر گیا۔ طیارہ شکن گنوں کی نالیاں اُس کے تعاقب میں گھوم کر اُس پر فائر کر رہی تھیں۔ دونوں طیاروں کی بلندی خاصی کم تھی لیکن دوسری مرتبہ آتے تو اُن کی بلندی زیادہ تھی اور وہ مورچوں پر فائر کرنے کی بجاتے مورچوں کے پیچھے خالی علاقے میں گولیاں برسا کر چلے گئے۔

اقبال درخت کے تنے سے ہٹا اور اپنی پلاٹون کے مورچوں میں چلا گیا۔ نائب صوبیدار بدرالحق اُسے دیکھ کر دوڑتا آیا۔

"کیا آڈر ملا شاب؟" ___ نائب صوبیدار بدرالحق نے پوچھا۔

"آج رات کمانڈو پارٹی بھیجنی ہے" ___ لیفٹیننٹ اقبال نے کہا ___ "میرے ساتھ آئیں۔"

"جرور کریں گا کمانڈو ایکشن شاب!" ___ بدرالحق نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

لیفٹیننٹ اقبال اُسے اپنے مورچے میں لے گیا۔

سورج غروب ہونے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا۔

★

کھاریاں چھاؤنی کا فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھر گیا تھا۔ ڈاکٹروں اور ہسپتال کے سٹاف کو اب تو پانی کا گھونٹ پینے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ شہریوں کا ہجوم الگ تھا۔ یہ لوگ زخمیوں کے لیے تحفے، فروٹ، دُودھ اور مٹھائی وغیرہ لاتے تھے۔ وہ وارڈوں میں جا کر زخمیوں کو عقیدت، احترام اور پیار سے ملتے تھے۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود لوگ یہ محسوس کیے بغیر کہ زخمیوں کو آرام اور نیند کی ضرورت ہے، وارڈوں سے نکلتے نہیں تھے۔

نوجوان لڑکیاں اور لڑکے نرسوں اور نرسنگ سپاہیوں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اِن میں لیفٹیننٹ اقبال کی بہن شمع بھی تھی۔ وہ ایک وارڈ میں نرسنگ ڈیوٹی کر رہی تھی۔

"کیا محسوس کر رہی ہو؟" ___ کیپٹن عصمت نے اُس سے پوچھا ___ "وارڈ میں خون اور پسینے سے جی متلاتا تو نہیں؟.... خون اور پسینے کی بُو کے ساتھ جب دوائیوں کی بُو ملتی ہے تو برداشت نہیں ہوتی۔"

"نہیں عصمت!" ___ شمع نے کہا ___ "تم نے بُو کا ذکر کیا ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ زخمیوں سے بُو بھی آتی ہے۔ یقین کرنا عصمت! تم تو کہتی ہو کہ بدبُو سے میرا جی متلاتا ہو گا، میں نے بدبُو محسوس ہی نہیں کی، جی کیوں متلائے گا!.... ہاں میں نے جو محسوس کیا ہے بس تمہیں وہ بتاتی ہوں۔ میں کچھ اور تھی، اِن زخمیوں کو دیکھ کر کچھ اور ہو گئی ہوں۔ مجھے یہ سبق ملا ہے کہ اپنے دُکھ کم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے دُکھ کم کرنے کی کوشش کرو۔"

"تمہیں اقبال یاد نہیں آتا؟" ___ عصمت نے پوچھا۔

"اقبال؟" — شمع نے کہا — "یاد کیوں نہیں آتا؟ وہ کون سی بہن ہے جسے اپنا سگا بھائی یاد نہ آتا ہوگا.... سچی بات بتاؤں عصمت؟ .... محاذوں سے جو کوئی زخمی ہو کر آتا ہے اُس کا چہرہ مجھے اقبال جیسا لگتا ہے۔ معلوم نہیں بھائی جان کس حال میں ہوں گے!"

"میں تو ہر لمحہ ڈرتی ہوں کہ آپریشن ٹیبل پر آنے والا اگلا زخمی اقبال ہی نہ ہو" — کیپٹن عصمت نے کہا — "یہ تمام زخمی میرے ہاتھوں سے گذر کر وارڈوں میں گئے ہیں۔ اِن میں کم عمر سپاہی اور لیفٹیننٹ بھی ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر خوبرو ہے لیکن اقبال کو زخمی حالت میں دیکھ کر معلوم نہیں میری حالت کیا ہوگی"۔

"عصمت!" — شمع نے پوچھا — "کیا تم واقعی بھائی جان اقبال کے ساتھ شادی کرو گی؟"

"تم ابھی شک میں ہو؟" — کیپٹن عصمت نے کہا — "جنگ شروع نہ ہو جاتی تو ہماری شادی ہو چکی ہوتی۔"

"بھائی جان نے گھر میں کبھی تمہارا ذکر نہیں کیا" — شمع نے کہا — "وہ امّی اور ابّا جان سے بات کریں گے پھر وہ تمہارے ماں باپ کے پاس رشتہ مانگنے جائیں گے۔ معلوم نہیں تمہارے والدین کا فیصلہ کیا ہو"۔

"ہمیں کسی کے فیصلے کی پرواہ نہیں" — کیپٹن عصمت نے کہا — "ہم فیصلہ کر چکے ہیں"۔

"میں نے تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تمہارے ڈیڈی کیا کام کرتے ہیں" — شمع نے کہا — "اور تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"میں جب تمہاری بھابی بن کر آؤں گی تو تمہیں پتہ چل جائے گا" — عصمت نے کہا — "شمع! سچے دل سے بتاؤ کہ تم مجھے اقبال کے قابل سمجھتی ہو؟"

"کیا کمی ہے تم میں!" — شمع نے کہا — "تم سے زیادہ خوبصورت اور کون ہوگی"۔

"اوہ، شمع!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "مجھے اب جانا چاہیے .... تم میرے ساتھ آؤ میں تمہیں جنرل وارڈ سے ہٹا کر ایک کمرے میں بھیج رہی ہوں۔ یہ سنگل بیڈ کا کمرہ ہے۔ وہاں چونڈہ کے محاذ کا ایک لیفٹیننٹ زخمی ہو کر آیا ہے۔ اُسے گہرے زخم آتے ہیں۔ ایک ٹانگ کی ہڈی بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔

اُسے ہم نے بچا لیا ہے اور اُسے مسلسل خون اور گلوکوز دیا جا رہا ہے"۔

"اُسے الگ کمرے میں کیوں رکھا گیا ہے؟"

"افسروں کو الگ الگ کمروں میں رکھا جاتا ہے" — کیپٹن عصمت نے جواب دیا — "یہ زخمی لیفٹیننٹ بالکل نوجوان ہے۔ ابھی اُس پر بے ہوشی کی دوائی کا اثر ہے جو انجکشن کے ذریعے اُسے آپریشن ٹیبل پر دی گئی تھی۔ نیند کی بھی دوائی دی جا رہی ہے، اس لیے وہ زیادہ وقت غنودگی اور نیم غشی کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کیفیت میں وہ کچھ بولتا ہے اور بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اُس سے ڈر نہ جانا۔ اُسے دلجوئی کی ضرورت ہے"۔

"اُس کے گھر والوں کو کون اطلاع دے گا کہ اُن کا بیٹا زخمی حالت میں سی۔ ایم۔ ایچ کھاریاں میں پڑا ہے؟" — شمع نے پوچھا۔

"سرکاری اطلاع جا چکی ہے" — کیپٹن عصمت نے جواب دیا — "اُس کے رشتہ دار آئیں گے۔ تم اس زخمی لیفٹیننٹ کا خیال رکھنا۔ چلو میرے ساتھ آؤ میں تمہیں اُس کے کمرے میں داخل کر دوں"۔

★

کیپٹن عصمت نے شمع کو ایک کمرے میں داخل کر دیا۔ بیڈ پر ایک زخمی پڑا تھا۔ اُس کا چہرہ ننگا تھا، باقی جسم پر چادر تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ سانولا سا تھا جس میں پیلاہٹ کی جھلک بھی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ رنگ اِس نوجوان کا قدرتی رنگ نہیں، یہ دھوپ کا، رات رات جاگنے کا اور محاذ کے گرد و غبار کا رنگ ہے اور یہ رنگ جسم سے بے شمار خون نکل جانے کی وجہ سے پیلا پڑ گیا ہے۔

زخمی کی آنکھیں بند تھیں اور وہ قدرتی رفتار سے سانس لے رہا تھا جیسے گہری نیند سویا ہوا ہو۔ اُس کی عمر بیس اکیس سال تھی لیکن وہ معصوم سا بچہ لگ رہا تھا۔ شمع اُس کے بیڈ کے ساتھ جا کھڑی ہوئی اور اُس کی نظریں معصوم سے اِس چہرے پر جم گئیں۔ چہرہ بدلتے بدلتے اقبال کا چہرہ بن گیا۔ شمع کے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا اور اُس کا جسم کانپنے لگا۔ شمع کا ہاتھ اپنے آپ لیفٹیننٹ کے ماتھے پر چلا گیا اور وہاں سے سرکتا زخمی کے بالوں پر آ گیا اور انگلیاں بالوں میں اُلجھ گئیں۔

شمع نے انگلیوں سے زخمی کے بالوں کو کنگھی کرنا چاہی مگر انگلیاں بالوں میں پھنس گئیں۔ بال پسینے اور مٹی سے جڑے ہوتے تھے۔ کانوں پر مٹی کی تہہ صاف نظر آ رہی تھی۔ شمع نے بالوں سے انگلیاں نکال کر زخمی کے کانوں سے مٹی صاف کرنے کی کوشش کی لیکن مٹی جمی رہی۔ زخمی کے ماتھے پر ایک لکیر سی ایک کنپٹی سے دوسری کنپٹی تک چلی گئی تھی۔ یہ سٹیل ہیلمٹ کا نشان تھا جو زخمی ہونے تک اس نوجوان لیفٹیننٹ کے سر پر رہا تھا۔ اتنے دن اور راتیں اُسے سونے یا کچھ دیر کے لیے لیٹنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ ہیلمٹ اتار دیتا۔

زخمی کے جسم میں کچھ حرکت ہوئی پھر اُس کا سر دائیں بائیں ہلا۔ اُس کے اُس بازو کو بھی حرکت ہوئی جس کی رگ میں گلوکوز لگا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے خون اتار لیا گیا تھا۔ جب گلوکوز کی سوئی والا بازو ہلا تو شمع نے اس بازو کو پکڑ لیا اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"نہیں نہیں!" — زخمی صاف آواز میں بڑبڑانے لگا — "سب جوان ابھی نہیں پہنچے ..... ٹھہرو، ٹھہرو .... کسی زخمی کو اِدھر نہیں چھوڑیں گے .... نہیں نہیں .... میں ٹھیک ہوں، جوانوں کو دیکھو — زخمی کی آواز دبتی گئی اور فیڈ آوٹ ہو گئی۔

"یہ ابھی تک محاذ پر لڑ رہا ہے" — شمع کو کیپٹن عصمت کی آواز سنائی دی۔

شمع نے چونک کر دیکھا۔ وہ تو بھول ہی گئی تھی کہ عصمت بھی اِس کمرے میں موجود ہے۔

"اِسے بے ہوشی کی حالت میں لاتے تھے" — کیپٹن عصمت نے کہا — "آپریشن تھیٹر میں اسے بے ہوشی کا ایک اور انجکشن لگایا گیا کیونکہ زخموں کی حالت بہت بُری تھی۔ ایسے زخموں کو ٹانکے لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ٹانگ کی ہڈی بھی جوڑنی تھی۔ اسے بے ہوش رکھنا ضروری تھا۔ اس انجکشن کا اثر اُتر رہا ہے۔ ڈر نہ جانا شمع! یہ ابھی ایسی باتیں اور ایسی حرکتیں کرے گا کہ تم گھبرا جاؤ گی۔

تم نے وارڈ میں زخمیوں کو دیکھا ہے نا! .... یہ خیال رکھنا کہ اس کا یہ بازو نہ ہلے۔"

"عصمت!" — شمع نے کہا — "محاذوں کے زخمی درد سے کراہتے کیوں نہیں؟"

"یہ اپنے ملک کی جنگ لڑ رہے ہیں شمع!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "جذبہ ان کی رُوح میں اُترا ہُوا ہے۔ اس لڑکے کو تم جسم نہ سمجھو۔ یہ روح ہے۔"

"روحانی جذبہ!" — شمع نے آہ لینے کے انداز سے کہا۔

"تم اب اسی کے پاس رہو گی" — کیپٹن عصمت نے کہا — "یہ جب ہوش میں آئے گا تو اس کی باتیں سننا۔"

"عصمت!" — شمع نے عصمت کے قریب آ کر سرگوشی میں کہا — "میں اکیلی اس کے ساتھ رہوں گی؟ .... رات کو بھی؟"

"ہاں اکیلی!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "رات کو بھی۔ یہ مکمل طور پر ہوش میں آ جائے گا تو بھی تم اس کے ساتھ رہو گی۔"

شمع کے ہونٹوں پر شرم و حجاب کی مُسکراہٹ آ گئی۔

"تم خود محسوس کرو گی کہ اس کی نظروں میں تم ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی نہیں ہو" — عصمت نے کہا — "تمہیں یہ پاکستان کی آبرو کی علامت سمجھے گا .... میں نے کتنے زخمیوں کے ساتھ باتیں کی ہیں اور اُن کی باتیں سنی ہیں۔ تم اس کی باتیں سننا۔ اس کی دل جوئی کرنا لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ یہ دل جوئی کی خواہش کرے گا ہی نہیں۔ صرف ایک بات کہے گا کہ مجھے آگے بھیجو۔"

"وہ نظر آ رہا ہے" — زخمی لیفٹیننٹ پھر بڑبڑانے لگا۔ اب کے وہ اور زیادہ صاف بول رہا تھا — "ٹینک ہے .... لانچر مجھے دو" — اُس نے بلند آواز سے کہا — "مار لیا .... اب .... اب .... اس کے شعلوں کی روشنی میں .... آڑ میں رہو اکرم ....!" اُس کی آواز فیڈ آؤٹ ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔

"میں جا رہی ہوں شمع!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "جب کوئی ڈاکٹر آئے تو اُسے بتا دینا کہ یہ تھوڑی دیر بعد جسم کو اکڑاتا ہے اور جوشیلی باتیں کرتا ہے .... ڈاکٹر کو یہ بتانا ضروری ہے کیونکہ یہ جسم کو بار بار اتنا زیادہ اکڑاتا رہا تو زخموں کے ٹانکے کھل جانے کا خطرہ ہے۔ ویسے بھی خون میں اتنا جوش پیدا کرنا اس کے لیے ٹھیک نہیں۔"

"ڈاکٹر کیا کرے گا؟" — شمع نے پوچھا۔

"وہ ذہنی سکون کی کوئی دوائی یا انجکشن دے دے گا" — عصمت نے کہا — "اچھا میں اب جاتی ہوں۔"

عصمت کے جانے کے بعد شمع اس نوجوان لیفٹیننٹ کے سرہانے بیٹھ گئی اور نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اُس کی نظروں میں یہ چہرہ جھلملانے لگا جیسے وہ اُس کا عکس کسی جھیل میں دیکھ رہی ہو۔ جھلملاتا ہُوا یہ چہرہ ایک بار پھر شمع کے بھائی اقبال کا چہرہ بن گیا۔ تب اُسے محسوس ہُوا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ اُس نے زخمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اچانک اُسے رشید یاد آ گیا جس کے ساتھ وہ ریلوے لائن پر پکڑی گئی تھی۔ نفرت کی ایک لہر اُس کے سارے وجود میں پھر گئی۔

اب اُس نے زخمی لیفٹیننٹ کے چہرے کو دیکھا تو اُسے یہ چہرہ آسمان کے پانیوں میں دُھلا ہُوا نظر آیا۔ بار بار اقبال اُس کے ذہن میں آتا تھا۔

★

لیفٹیننٹ اقبال نے کمانڈو پارٹی تیار کر لی تھی جس میں اُس نے اپنی کمپنی کے دس چُنے ہوئے جوان رکھے تھے۔ اُس نے حوالدار وہ منتخب کیا تھا جس نے سائیفن کے پار دشمن کو کئی گھنٹے روکے رکھا تھا۔ نائب صوبیدار بدر الحق بھی اُس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن وہ لڑائی تھی میلہ نہیں تھا کہ جس کا جی چاہتا وہ ساتھ چل پڑتا۔ یہ جذبے کی انتہا تھی کہ جو سنتا تھا کہ کمانڈو پارٹی دشمن کے اگلے مورچوں کے پیچھے جا رہی ہے وہ درخواست کرتا کہ اُسے اس پارٹی میں شامل کیا جائے۔

"نہیں نائب صاحب!" — اقبال نے نائب صوبیدار بدر الحق سے کہا — "آپ کو میں کیسے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ پلاٹون کی کمانڈ کون کرے گا؟"

"ٹھیک ہے شاب!" — نائب صوبیدار بدر الحق نے مایوس سے لہجے میں کہا — "ٹھیک ہے .... لیکن شاب! اپنا خیال رکھنا۔"

"اپنا؟" — اقبال نے کہا — "نائب صاحب! اگر ہم نے اپنا اپنا خیال رکھا تو ملک کا ڈیفنس کون کرے گا؟"

نائب صوبیدار بدر الحق نے جذبات کی شدّت سے عہدوں کی اونچ نیچ کو بھول کر اقبال کو گلے سے لگا لیا۔

"آپ نے ٹھیک بولا شاب!" — بدر الحق نے رقّت سے دبی ہوئی آواز میں کہا — "ملک کے ڈیفنس کے لیے آپ کو یا ہم کو جرور مرنا پڑے گا .... ہم مر جائے تو ٹھیک ہے۔ آپ ابھی لڑکا ہے .... ٹھیک ہے شاب، ٹھیک ہے۔ ہم آپ کے لیے دُعا کرے گا" — اُس نے لیفٹیننٹ اقبال کے ساتھ اتنی زور سے ہاتھ ملایا جیسے وہ اپنے بیٹے کو رخصت کر رہا ہو۔

اقبال قوم کے بیٹے کے رُوپ میں آ چکا تھا۔

اُسے اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ دشمن کی اگلی پوزیشنیں کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں، اُن کے پیچھے کیا ہے اور جس زمین سے اُس نے گذر کر جانا ہے وہ کیسی ہے۔ اُسے یہ معلومات اُس کے بٹالین کمانڈر نے دے دی تھیں اور نقشے پر اُسے سارا علاقہ ذہن نشین کرا دیا تھا۔ بٹالین کمانڈر نے یہ معلومات اپنے ذرائع سے حاصل کی تھیں۔ اقبال نے اپنی پارٹی کا معائنہ کیا۔ سب نے پی ٹی شوز پہن رکھے تھے۔ اُس نے ایک خیال یہ رکھا کہ کسی کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جو جھنکار پیدا کرتی ہو اور کوئی جوان ایسا نہ ہو جسے کھانسی آتی ہو۔

"تم سب اردو اچھی طرح سمجھ سکتے ہو" — لیفٹیننٹ اقبال نے اپنی پارٹی کے جوانوں کو روانہ ہونے سے پہلے لیکچر دیا — "اگر کسی کو کوئی بات یا کوئی لفظ سمجھ نہ آئے تو مجھے روک لے اور پوچھ لے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیا کرنے جا رہے ہیں۔ تم رنگروٹ نہیں ہو، پرانے سپاہی ہو۔ تم فائٹنگ پٹرولوں پر جاتے رہے ہو۔ اب یوں سمجھو کہ فائٹنگ

پٹرول دشمن کے اگلے مورچوں کے پیچھے جاتے گی ..... لیکن میرے دوستو! ہم جائیں گے آئیں گے نہیں۔ تم آج کسی افسر کے حکم سے نہیں خدا کے حکم سے جا رہے ہو۔ اس کا انعام تمہیں خدا دے گا۔ تم دس جوانوں نے آج رات وہ کام کرنا ہے جو پورا ڈویژن کیا کرتا ہے۔ ہمارے پاس فوج بہت کم ہے۔ دشمن اسی لیے پاکستان پر چڑھ دوڑا ہے کہ اُس کی نفری اور فائر پاور ہم سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ مسلمان سپاہی کے ساتھ اُس کا خدا ہوتا ہے اور مسلمان کا خدا سچا ہے۔"

اقبال انہیں مشن کے متعلق فوجی ہدایات دے چکا تھا۔ چونکہ مشن بہت خطرناک تھا اور جوانوں سے ایک معجزے کی توقع کی جا رہی تھی اس لیے ان کے جذبے اور مورال کو مضبوط رکھنے کے لیے جوشیلے اور جذباتی لیکچر کی ضرورت تھی لیکن بنگالی جوانوں کے جذبے کی کیفیت یہ تھی کہ فوراً آگے جانے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ اُن کا جوش و خروش بتا رہا تھا کہ انہیں کسی لیکچر کی ضرورت نہیں۔

جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں یہی جذبہ کارفرما تھا جسے جذبۂ سمنبر کہتے ہیں۔

آخر وہ لمحہ آیا جب لیفٹیننٹ اقبال اپنی کمانڈو پارٹی کے ساتھ سائیفن پار کر گیا۔



رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کمانڈنگ آفیسر اُس وقت سائیفن پر کھڑا تھا۔ اُس نے اقبال سے ہاتھ ملایا اور اُسے دعاؤں سے رخصت کیا تھا۔ آگے دونوں فوجوں کے درمیان خالی جگہ تھی۔ اقبال اپنی پارٹی کو "سنگل فائل" میں نہر کے دوسرے کنارے کے ساتھ لے جا رہا تھا۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چند قدم چل کر وہ سرگوشیوں میں اپنے جوانوں سے ہنسی مذاق کی کوئی بات کہہ دیتا۔ اس سے جوان اُس ہیجانی کیفیت سے آزاد ہو جاتے جو اُن پر طاری تھی۔ اس قسم کی مہم سے پہلے ہیجانی کیفیت کا طاری ہونا لازمی ہوتا ہے۔

نہر کے ساتھ ساتھ پارٹی کم و بیش دو میل دُور چلی گئی۔ کھیم کرن اور لاہور کے محاذوں کی توپوں کے دھماکے صاف سنائی دے رہے تھے۔ اُس رات برکی کا محاذ سب سے زیادہ گرم تھا۔ دشمن نے برکی پر قبضہ کرنے کے لیے بڑا زوردار حملہ کیا تھا اور پاکستانی توپخانہ بڑی زبردست گولا باری کر رہا تھا۔ حملے میں جان ڈالنے کے لیے دشمن رات کے وقت بھی ٹینک استعمال کر رہا تھا۔ ان کے مقابلے کے لیے پاک فوج کا ایک بھی ٹینک آگے نہیں تھا۔ پاک فوج کے مورچے نہر کے لاہور والے کنارے پر تھے ٹینک کم ہی ہونے چاہئیں تھے وہاں ٹینکوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دشمن کو معلوم تھا اس لیے وہ برکی تک رات کو بھی ٹینک لے آیا تھا۔ یہ ٹینک فائر کر سکتے تھے لیکن رات کو لڑ نہیں سکتے تھے۔

دو میل دُور جا کر لیفٹیننٹ اقبال اپنی پارٹی کو نہر کے کنارے سے ہٹا کر دشمن کے مورچوں کی طرف لے گیا۔ ریکی رپورٹوں کے مطابق اُس جگہ دشمن کا کوئی مورچہ نہیں تھا لیکن کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔ آگے خاصی سرگرمی اور حرکت تھی۔ محاذ کے گرد و غبار کی وجہ سے چاندنی بہت پھیکی تھی۔

اقبال اپنی پارٹی کو سرکنڈوں کے جنگل کے اُس طرف لے گیا جو اُس جگہ سے دُور تھی جہاں کوئی سرگرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس طرف درخت زیادہ تھے۔ اونچی گھاس بھی تھی اور ذرا کم گہرے اور زیادہ گہرے گڑھے بھی تھے۔ اب وہ اس قدر خاموشی سے جا رہے تھے جیسے اپنی سانسوں کو

بھی روکے ہوتے ہوں۔

"اوئے کون ہو؟"

اچانک جیسے سرکنڈوں کے جنگل میں سے آواز اُٹھی ہو۔ اقبال نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ اُس کے اشارے پر اُس کے جوان جہاں تھے وہیں گر کر زمین کے ساتھ چپک گئے تھے۔

پکارنے والا انڈین آرمی کا جوان تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور جوان تھا۔ یہ گشتی سنتری تھے۔ ان سے کچھ دُور دو اور سنتریوں کو ہونا چاہیئے تھا۔ آگے والے دو سنتریوں کو شک ہوا تھا کہ کوئی آ رہا ہے۔ شاید انہوں نے کسی کو دیکھ بھی لیا تھا۔ دونوں سنتری درختوں کی طرف یہ دیکھنے کے لیے آتے کہ اِدھر کون آ رہا تھا۔ دونوں نے رائفلیں جن کے آگے سنگینیں لگی ہوئی تھیں، آگے کر رکھی تھیں۔

اچانک پیچھے سے دونوں کی گردنیں ایک ایک بازو کے شکنجے میں آ گئیں۔ ایک کو لیفٹیننٹ اقبال نے اور دوسرے کو اُس کے پلاٹون حوالدار نے اس طرح دبوچ لیا تھا کہ پیچھے سے بازو اُن کی گردنوں کے گرد لپیٹ دیتے تھے۔ دو بنگالی جوان بڑی تیزی سے گڑھوں سے نکلے۔ اُن کے ہاتھوں میں کُھلے ہوتے چاقو تھے جن سے انہوں نے انڈین آرمی کے اِن دونوں سپاہیوں کے پیٹ چاک کر دیئے۔

"دل پر!"— اقبال نے سرگوشی کی —"دِل پر!"

دو نو بنگالیوں نے چاقو دونوں کے دلوں میں اتار دیئے۔ اقبال اور حوالدار نے انہیں چھوڑ دیا۔ دونوں گر پڑے۔ اقبال کے کہنے پر دونوں لاشوں کو گھسیٹ کر ایک گہرے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔

"یہ دشمن کی فائٹنگ پٹرول نہیں"— لیفٹیننٹ اقبال نے اپنے جوانوں سے کہا —"یہ گشتی سنتری تھے۔ ان کے پیچھے دو اور ہوں گے۔ یہیں چھپے رہو۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ ان میں سے ایک کو زندہ رکھنا ہے۔"



اقبال نے بات ختم کی ہی تھی کہ آہستہ آہستہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اقبال نے ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو کر دیکھنے کی کوشش کی۔ دو سائے چلے آ رہے تھے۔ سب نے سانس روک لیے۔ جونہی یہ دونوں اِس پارٹی کے قریب سے گذرے، دونوں عقب سے دو مضبوط بازوؤں میں جکڑے گئے۔ دونوں کی گردنیں ایک ایک بازو کے مضبوط گھیرے میں آئی ہوئی تھیں۔ انہیں گھسیٹ کر درختوں کے جھنڈ میں لے آئے۔ دونوں کے پاس سٹین گنیں تھیں جو اُن سے لے لی گئیں۔ انہیں بٹھا لیا گیا۔ دونوں نے منت سماجت شروع کر دی۔

"اِدھر آگے کیا ہو رہا ہے؟"— اقبال نے اُن سے پوچھا۔

"ہمیں جان سے تو نہیں مارو گے؟"— ایک نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بالکل ٹھیک بتا دو گے تو نہیں ماریں گے"— اقبال نے کہا "نہیں بتاؤ گے تو آؤ میں تمہیں تمہارے اگلے دو ساتھیوں کی لاشیں دکھا دیتا ہوں۔ تمہاری لاشیں بھی اُن کے ساتھ رکھ دیں گے۔"

"تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے ایمونیشن ٹرکوں سے اُتر رہا ہے"— ایک نے کہا— "اس میں آرٹلری کا ایمونیشن بھی ہے ٹینکوں کا بھی اور چھوٹا ایمونیشن بھی۔"

"وہاں بہت بڑا گڑھا ہے"— دوسرے نے کہا— "اِسے اور زیادہ کھُلا کر لیا گیا ہے۔ ایمونیشن کے بکس اس میں اتارے جا رہے ہیں۔"

"آگے کیا ہے؟"— اقبال نے پوچھا— "مورچے کہاں ہیں؟"

ایک نے بتایا کہ وہ کون سی رجمنٹ کے ہیں اور اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ اُن کے مورچے کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ قریب ہی اس رجمنٹ کی آؤٹ پوسٹ تھی جس میں ایک مشین گن میڈیم تھی اور ایک لائٹ مشین گن تھی۔

"ٹینکوں کا لیگر کہاں ہے؟"— اقبال نے پوچھا۔

"ہماری پوزیشنوں کے پیچھے"— ایک نے بتایا۔

"بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟"— اقبال نے پوچھا۔

"ہم سپاہی ہیں"— ایک قیدی نے کہا— "ہمیں معلوم نہیں کہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔"

"میرا خیال ہے دو میل دُور ہے"— دوسرے نے کہا— "وہ جس طرف ہے میں وہ بتا دیتا ہوں، جگہ معلوم نہیں۔"

"صبح کے لیے تمہیں کیا حکم ملا ہے؟"— اقبال نے پوچھا۔

"صبح کے لیے حکم تو صبح ہی ملے گا صاحب!"— قیدی نے جواب دیا— "ہم سپاہی ہیں۔ جو حکم ملتا ہے وہ پورا کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ ہماری کیا دشمنی ہے صاحب بہادر!"

"اوئے میں صاحب بہادر نہیں ہوں یار!"— لیفٹیننٹ اقبال نے کہا— "میں تو کچا لیس (لانس نائک) ہوں۔"

ہندو سپاہی ہنس پڑا اور بولا— "میں بیوقوف تو نہیں ہوں جناب! آپ کے کندھے پر رینک کے پھول نہیں ہیں تو کیا ہُوا، آپ آفیسر ہیں"— اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا— "مجھے معافی دے دیں۔ میری ماں اندھی ہے۔ اُس کو ساری تنخواہ بھیج دیتا ہوں۔"

"میں تو اس سے بھی زیادہ غریب ہوں صاحب بہادر!"— دوسرے نے بھی ہاتھ جوڑ دیئے اور رندھی ہُوئی آواز میں بولا— "میری بیوی بڑی بدمعاش ہے۔ میں نے تنخواہ اُس کے نام لکھوائی ہوئی ہے۔ وہ سارے پیسے ہضم کر جاتی ہے، میری ماں کو کچھ نہیں دیتی۔"

لیفٹیننٹ اقبال کے بنگالی جوان یوں ہنس پڑے جیسے پارک میں بیٹھے ہُوئے ہوں۔ اقبال نے سرگوشی میں ڈانٹ کر اُنہیں چپ کرایا۔

وہ دونوں سپاہی تھے۔ سپاہیوں کو تو اپنی پلاٹون کے پلان یا اگلے پروگرام کا علم نہیں ہوتا۔

وہ اقبال کو کوریا ڈویژن کے پلان کے متعلق کیا بتاتے۔ پھر بھی اقبال نے اُن سے اتنی زیادہ باتیں پوچھیں کہ اُسے اندازہ ہو گیا کہ دشمن کا کم از کم ایک ڈویژن صبح حملہ کرے گا اور یہ سائیفن سے گزرنے کی ایک زبردست کوشش ہوگی۔ محاذ کی خاموشی تصدیق کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اقبال نے اُن سے مختلف ایسی جگہیں بھی معلوم کر لی تھیں جو کمانڈو پارٹی کے لیے نہایت اچھے ٹارگیٹ تھے۔

اقبال اپنے حوالدار کو ذرا پرے لے گیا اور اُسے کہا— "ان دونوں کو کسی گہرے گڑھے میں لے جاؤ۔ مار نہ دینا انہیں۔ غریب آدمی ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں اور منہ باندھ کر گڑھے میں چھوڑ آؤ.... بہت جلدی۔"

حوالدار اپنے دو جوانوں کو ساتھ لے کر دشمن کے ان دونوں سپاہیوں کو ذرا دور لے گیا۔



حوالدار اپنے دونوں جوانوں کے ساتھ واپس آ گیا۔

"پکّا باندھا ہے نا؟"— اقبال نے حوالدار سے پوچھا— "منہ بھی باندھے ہیں؟"

"بلے گا نہیں سَر!"— حوالدار نے جواب دیا— "منہ پکّا بند کر دیا۔ ان کو اپنا بھگوان بلائے گا۔ یہ شالا پھر بھی نہیں بولے گا.... پھکر مت نیّں کرو سَر! لڑائی کھتم ہونا ہے گا۔ یہ پھر بھی نہیں بولے گا۔"

"منیر الحسن!"— لیفٹیننٹ اقبال نے حوالدار سے پوچھا— "تم نے.... ؟"

"ہاں ہاں سَر!"— حوالدار نے جواب دیا— "پھکر نیّں، پھکر نیّں۔ ہم دونوں کو مار دیا۔ دسمن ہے سَر! دسمن ہے، ہمارا شالا نیّں ہے.... یہ گریب ہے تو ہم جیاستی گریب ہے۔ ہمارا پاکیستان بھی گریب ہے۔ اس شالے کے پاس ٹینک ہے، ہمارے پاس ٹینک نیّں ہے"— اُس نے اپنے بازو آگے کر کے کہا— "ہمارے پاس یہ باجُو ہے۔ ہم باجُو کے جور سے شالے کا ٹینک توڑے گا.... چلو سَر! ایڈبانس کرو"— اُس نے اپنے جوانوں سے کہا— "ایڈبانس کرو بے ایڈبانس!"

لیفٹیننٹ اقبال خاموشی سے اپنے حوالدار کی باتیں سنتا رہا۔ اُسے غصہ نہ آیا کہ اُس کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ وہ کچھ محسوس ضرور کر رہا تھا۔ وہ جب اپنی پارٹی کو لے کر آگے چلا تو اُس کے اندر سے جیسے کوئی بولا ہو— "دشمن کو دشمن سمجھنے والے کبھی شکست نہیں کھایا کرتے۔ شکست انہیں ہوتی ہے جو دشمن کو اپنا سالا سمجھتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ دشمن انہیں اپنا سالا بنا لیتا ہے۔ سانپ کا منہ بند کرنے سے اُس کا زہر مارا نہیں جاتا۔"

لیفٹیننٹ اقبال کا بٹالین کمانڈر اپنے سیکنڈ اِن کمانڈ کے ساتھ سائیفن پہ کھڑا دشمن کے مورچوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اقبال کا کمپنی کمانڈر نائب صوبیدار بدر الحق کے ساتھ اپنے مورچوں کے پاس نہر کے کنارے پر کھڑا اُدھر دیکھ رہا تھا جدھر اقبال کو جانا تھا۔

"کبھی خیال آتا ہے کہ اس لڑکے کو آگے بھیج کر میں نے غلطی کی ہے"— بٹالین کمانڈر نے اپنے سیکنڈ اِن کمانڈ سے کہا— "غیر ذمّہ دار سا لڑکا ہے۔"

”جنگ ہے سر!“— سیکنڈ اِن کمانڈ نے کہا— ”ہمارے پاس جو کچھ ہے ہمیں اسی سے کام لینا ہے۔ اگر یہ لڑکا غیر ذمّہ دار ہے تو آج اِسے ذمّہ داریوں کا احساس ہو جائے گا۔ اِس نے اپنے آپ کو والنٹیئر کیا تھا سر!“

”مارا جائے گا“— بٹالین کمانڈر نے کہا— ”اب تک اُسے ٹارگیٹ پر ہونا چاہیئے تھا۔“

”نائب صاحب!“— کمپنی کمانڈر نائب صوبیدار بدرالحق سے پوچھ رہا تھا— ”آپ کا کیا خیال ہے۔ لیفٹیننٹ اقبال کچھ کرے گا؟“

”جرور کرے گا شاب!“— بدرالحق نے کہا— ”اقبال شاب اب نہیں ڈرتا۔“

”کچھ نہیں کر سکے گا“— کمپنی کمانڈر نے کہا۔

”شکے گا شاب! جرور شکے گا“— نائب صوبیدار بدرالحق نے کہا— ”ہم نے حوالدار منیر الحسن کو ساتھ بھیجا ہے۔ جبردشت حوالدار ہے۔“

یہ سب بے چین اور بیتاب ہوئے جا رہے تھے۔ اِس وقت تک دشمن کی اگلی پوزیشنوں کے پیچھے دھماکہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ اب ان سب کو شک ہونے لگا تھا کہ اقبال جوش میں آ کر چلا تو گیا ہے لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو گا۔ پکڑا جائے گا یا مارا جائے گا۔

★

اُس وقت اقبال کی پارٹی اُس وسیع گڑھے سے کوئی ایک سو گز دُور پہنچ چکی تھی جس میں بڑے اور چھوٹے ایمونیشن کے بکس ٹرکوں سے اتار اتار کر رکھے جا رہے تھے۔ وہاں کوئی روشنی نہیں تھی پھیکی چاندنی میں دو ٹرک گڑھے کے اوپر کھڑے تھے اور ان سے بکس اُتر رہے تھے۔ دونوں ہندو سپاہیوں کے بیان کے مطابق یہاں شام کے فوراً بعد ایمونیشن آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گڑھا بھر گیا تھا۔

جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارتیوں نے تقریباً تمام محاذوں پر ایمونیشن مورچوں سے تھوڑی دُور پیچھے گڑھوں میں رکھنے کا طریقہ اختیار کیا تھا تاکہ ایمونیشن کی سپلائی میں وقت ضائع نہ ہو۔ ایسا اکثر ہُوا کہ پاکستانی توپخانے کی گولاباری ہُوئی تو ایک دو گولے دشمن کے ایمونیشن والے گڑھے میں جا پھٹے اور تمام تر ایمونیشن ایک مہیب دھماکے سے اڑ گیا۔

یہاں بھی دشمن توپوں اور ٹینکوں کا اور انفنٹری کا ایمونیشن جمع کر رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دشمن زبردست حملہ کرے گا۔ اقبال نے اپنے جوانوں سے کہا کہ وہ دُور پیچھے گڑھوں میں لیٹ جائیں اور انگلیاں کانوں میں دبا لیں۔ حوالدار منیر الحسن کو اُس نے اپنے ساتھ رکھا۔

”منیر!“— اقبال نے اپنے حوالدار سے کہا— ”فاصلہ ایک سو گز ہے۔ اتنی دُور گرنیڈ پہنچا سکتے ہو؟“

”آگے چلو شر!“— حوالدار نے کہا— ”گرنیڈ جائع نہیں کرے گا“— وہ آگے کو سرکنے لگا۔

انہیں ساٹھ ستر گز کے فاصلے تک جانا تھا۔ وہاں سے پوری طاقت سے پھینکنے سے گرنیڈ گڑھے کے اندر جا سکتے تھے۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ اتنے فاصلے پر وہ ایمونیشن کے دھماکے کی زد میں آ سکتے تھے۔ اقبال اس خطرے سے آگاہ تھا لیکن اُس نے پرواہ نہ کی۔

وہ پیٹ کے بل رینگتا حوالدار منیر الحسن کے ساتھ آگے ہی آگے جاتا رہا۔ فاصلہ ساٹھ گز سے بھی کم ہو گیا تھا۔ دھماکے کے ساتھ اُڑ جانے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔

اقبال کو اپنے قریب ایک گڑھا نظر آ گیا۔ یہ اچھا خاصا کھڈ تھا جس میں اقبال اپنے حوالدار سمیت سما سکتا تھا۔ اُس نے حوالدار سے کہا کہ گرنیڈ نکالے۔ اُس نے خود بھی گرنیڈ نکال لیا۔ انہیں ایمونیشن اتارنے والوں کی باتیں سنائی دینے لگی تھیں۔

”اٹھو منیر الحسن!“— اقبال نے کہا— ”پن نکالو، بسم اللہ شریف پڑھو اور پُوری طاقت سے گرنیڈ پھینکو۔“

دونوں اکٹھے اٹھے۔ اکٹھے ہی اُنہوں نے اپنے اپنے گرنیڈ سے پن نکالے۔ دونوں نے ذرا اونچی آواز میں بسم اللہ شریف پڑھی۔ دونوں کے دائیں بازو اکٹھے پیچھے گئے اور بجلی کی تیزی سے کندھوں کے اوپر سے گھوم کر آگے گئے۔ دو گرنیڈ ہوا میں بلند ہو کر ایمونیشن کے گڑھے کی طرف گئے۔ اقبال اور اُس کا حوالدار پلک جھپکتے اپنے قریب گڑھے میں جا گرے۔ لیٹ کر انہوں نے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔

چار ساڑھے چار سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ پہلے گرنیڈوں کے دھماکے سنائی دیئے اور اس کے ساتھ ہی اتنی زور کا دھماکہ ہُوا کہ اقبال اور حوالدار لیٹے لیٹے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ توپوں کے گولے ایک ہی بار پھٹنے سے چمک ایسی ہُوئی جیسے سورج زمین پر آ پڑا ہو۔ اقبال اور حوالدار کو اپنے اوپر زناٹے سنائی دیئے جو گزر گئے۔ یہ پھٹنے والے گولوں کے ٹکڑے تھے۔ کانوں میں ٹھونسی ہوئی انگلیوں کے باوجود اُن کے کان بند ہو گئے۔

پھر دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ تمام ایمونیشن ایک ہی بار نہیں پھٹا تھا۔ بڑے گولے ایک ایک دو دو پھٹ رہے تھے۔ اقبال نے خطرہ مول لے کر سر اٹھایا۔ اُسے دونوں ٹرک جلتے ہوئے نظر آئے۔ ذرا ہی دیر بعد ٹرکوں میں جو ایمونیشن تھا، وہ پھٹا۔

”وہ مار لیا“— سائیفن پر کھڑے بٹالین کمانڈر نے نعرہ لگایا— ”میرے خدا.... کیا تھا وہاں؟“

”ایمونیشن لگتا ہے“— سیکنڈ اِن کمانڈ نے کہا— ”اللہ سب کو خیریّت سے لے آئے۔“

”وہ دیکھو شاب!“— اُدھر نائب صُوبیدار بدرالحق نے اچھل کر کہا— ”ہم ٹھیک بولا تھا۔ اقبال شاب ہمارا ٹائیگر ہے۔“

کمپنی کمانڈر کا نعرہ سب سے زیادہ اُونچا تھا۔

جلتے ہُوئے ٹرکوں کے شعلے اپنے مورچوں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ دھماکے کا شعلہ تو اتنی دور اوپر گیا تھا جیسے آسمان تک پہنچے گا۔

★

دشمن کے اگلے اور پچھلے مورچوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ کسی کو ہوش نہیں تھا کہ دیکھتا کہ ایمونیشن کو کس نے تباہ کر دیا ہے۔ لیفٹیننٹ اقبال حوالدار کے ساتھ گڑھے سے نکلا اور دوڑ کر اپنے جوانوں تک گیا۔ ان میں سے دو کے پاس راکٹ لانچر تھے۔ اُن دونوں سنتریوں نے جنہیں

انہوں نے پکڑا تھا، بتا دیا تھا کہ ٹینک کہاں کھڑے ہیں۔ اقبال نے حوالدار منیر الحسن کو کوئی اور تارگیٹ بتائے اور خود راکٹ لانچروں والے جوانوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔

انہیں زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ نصف میل سے ذرا زیادہ دور جا کر انہیں دو ٹینک ایک درخت کے نیچے کھڑے دکھائی دیئے۔ چاندنی میں ان کے ہیولے سے نظر آرہے تھے۔ اقبال دونوں جوانوں کو آگے لے گیا۔ وہاں بھی سب بیدار ہو چکے تھے اور وہاں بھاگ دوڑ سی تھی۔

اقبال نے دونوں جوانوں کو الگ الگ دو ٹینک دکھائے۔ دونوں جوان موزوں فاصلے پر پہنچنے کے لیے آگے چلے گئے۔ یہ موزوں فاصلہ بہت خطرناک ہوتا ہے — صرف پچاس گز — دونوں نے پورے اطمینان سے لانچر کندھوں پر رکھ کر شست لی اور راکٹ فائر کر دیئے۔ دونوں راکٹ سیدھے ٹینکوں میں لگے۔ ٹینکوں کے اندر امونیشن تھا اور یہ پٹرول سے بھرے ہوئے تھے۔ دونوں کا امونیشن بڑے خوفناک دھماکوں سے پھٹا اور شعلے اٹھنے لگے۔

اب اقبال اور اُس کی پارٹی کے لیے بڑا مشکل وقت آگیا۔ دشمن کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ پاکستانیوں کی کمانڈو پارٹی یا ٹینک ہنٹنگ پارٹی آگئی ہے۔ دشمن نے روشنی راؤنڈ فائر کرنے شروع کر دیئے۔

اِدھر سائفن پر لیفٹیننٹ اقبال کا کمانڈنگ آفیسر اپنے سیکنڈ اِن کمانڈ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُسے دشمن کے اگلے مورچوں کے دور پیچھے دو اور دھماکے سنائی دیئے اور دو اور شعلے دکھائی دیئے۔ اُس نے وائرلیس آپریٹر کو جو قریب ہی کھڑا تھا، اپنے پاس بلایا اور خود بات کرنے لگا۔

اُدھر اقبال کے ساتھ بھی وائرلیس آپریٹر تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اقبال کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ پیغام ہے۔ اقبال بھی اپنے کمانڈنگ آفیسر کی طرح خود بات کرنے لگا۔ وہ کوڈ میں نہیں بلکہ اپنے مقرر کیے ہوئے الفاظ اور اشاروں میں بات کر رہے تھے۔ اقبال نے کچھ فاصلے بتاتے اور بات ختم کر دی۔

کمانڈنگ آفیسر نے توپخانہ بیٹری سے ملاپ کر کے فائر آرڈر دیا اور اُس کے ساتھ ہی بیٹری کی توپوں نے گولے داغنے شروع کر دیئے۔ یہ گولے اُس علاقے سے ہٹ کر گر رہے تھے جہاں اقبال کی پارٹی اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔ یہ پہلے سے طے تھا کہ دشمن کی توجہ تقسیم کرنے کے لیے اِدھر سے گولہ باری شروع کرا دی جاتے گی۔ وہ اقبال کے اشارے پر کرا دی گئی لیکن مشکل یہ تھی کہ اپنے پاس توپیں بہت تھوڑی تھیں اس لیے گولہ باری اتنی زیادہ نہیں کی جارہی تھی جتنی ضروری تھی۔

دشمن کے پاس آرٹلری کی دو رجمنٹیں تھیں۔ میڈیم توپیں بھی تھیں۔ پاکستانی توپوں کو خاموش کرنے کے لیے دشمن کی ان تمام توپوں نے گولہ باری شروع کر دی۔

اقبال کا حوالدار منیر الحسن دشمن کے علاقے کے اندر چلا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ پانچ جوان تھے۔ دشمن روشنی راؤنڈ فائر کر رہا تھا۔ ان کی روشنی میں اپنے آپ کو بچاتے رکھنا بہت مشکل تھا پھر بھی ان بنگالیوں نے گرینیڈوں سے چند اور ٹرک تباہ کر دیئے اور جہاں آدمی ملا، اس کے پیچھے جو کر شین گنوں اور ایک لائٹ مشین گن کا فائر بھی کیا۔

اقبال کے دونوں جوان دو اور ٹینک تباہ کر چکے تھے۔ دشمن کو وہ نظر نہیں آتے تھے۔ دشمن کی مشین گنوں نے ان کی طرف لگاتار بوچھاڑیں فائر کرنی شروع کر دیں۔ دشمن کو جہاں شک ہوا وہاں اُس نے گرینیڈ پھینکے۔

ایک اور ٹینک دھماکے سے پھٹا۔

دشمن نے ایک کمپنی کو بلا کر اقبال اور اُس کے جوانوں کو گھیرے میں لینے کے لیے پھیلا دیا۔ اقبال اور اُس کے بنگالی جوانوں نے دیکھ لیا اور وہ نکلنے کی کوشش کرنے لگے لیکن نکلنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ہر طرف گولیاں اُڑ رہی تھیں۔ مشین گنوں کی ٹریسر گولیاں آتشیں لکیروں کا جال تن رہی تھیں۔ اقبال کی پارٹی بکھر گئی تھی اور ہر جوان کو اپنے اپنے طور پر واپس آنا تھا لیکن واپسی مخدوش ہو گئی تھی۔

★

پو پھٹنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی جب پارٹی کا پہلا جوان سائفن پر پہنچا۔ اُس کے بازو کے پٹھے سے گولی گزر گئی تھی جس پر اُس نے فیلڈ پٹی باندھ رکھی تھی۔ بٹالین کمانڈر ابھی تک سائفن پر کھڑا تھا۔ اس بنگالی جوان کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے مختصر سی رپورٹ دی کہ اُسے کسی اور کے متعلق کچھ خبر نہیں۔ اُس نے اپنے راکٹ لانچر کے علاوہ دشمن کی دو آٹومیٹک رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ اُسے میڈیکل آفیسر کے حوالے کر دیا گیا۔

پھر دو اور جوان آئے۔ انہیں لیفٹیننٹ اقبال اور حوالدار منیر الحسن کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ اُنہوں نے یہ بتایا کہ ان کا شب خون توقع سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔

ایک اور گھنٹہ گزر گیا۔ اقبال کے متعلق سب مایوس ہو گئے تھے۔ پندرہ بیس منٹ اور گزرے تو اقبال آگیا۔ اُس نے کندھے پر ایک زخمی جوان کو اٹھا رکھا تھا۔ اقبال بالکل ٹھیک تھا اور جس جوان کو اُس نے اُٹھا رکھا تھا، اُس کی ایک ٹانگ مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ سے اس قدر زیادہ زخمی ہو گئی تھی کہ دو جگہوں سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اس ٹانگ کو اب جسم سے الگ ہونا تھا۔ ہڈی جُڑنے کے قابل نہیں تھی۔

حوالدار منیر الحسن اور باقی جوان کبھی بھی واپس نہ آسکے۔ وہ پاکستان کی آن پر قربان ہو گئے تھے۔

اقبال کو کمانڈنگ آفیسر نے گلے لگا لیا۔ اقبال نے محاذ کا سکوت توڑ دیا تھا اور اُس کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ دشمن جس حملے کی تیاری مکمل کر چکا تھا، اس حملے کا پلان تباہ ہو گیا۔

★

اقبال کی بہن شمع رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ نرس نے اُسے فارغ کر دیا تھا۔ وہ کیپٹن عصمت کے کمرے میں چلی گئی اور سو گئی لیکن اُس نے الٹا سا خواب دیکھا کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھر وہ سونے کی بجاتے بے چین ہی ہوتی چلی گئی اُسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ ابھی ابھی اُس نے کیا خواب دیکھا ہے۔ خواب ڈراونا تھا۔ ذہن پر زور دیا تو دھماکے اور آگ۔ یاد آئی پھر اُس [illegible]

خون دیکھا تھا... کس کا خون؟ اُسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اُسے رہ رہ کر اقبال یاد آ رہا تھا۔ شاید بہن کا پیار اُسے اشارہ دے رہا تھا کہ اس کا خوبصورت بھائی موت کے مُنہ میں گیا ہُوا ہے۔

رات کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ وہ کمرے سے نکلی اور آہستہ آہستہ چلتی ہسپتال کے برآمدے میں پہنچ گئی۔ ہسپتال جاگ رہا تھا۔ وہ بے خیالی سی میں چلی جا رہی تھی۔ جب وہ ایک کمرے میں داخل ہُوئی تو وہ بیدار ہو گئی۔ زخمی لیفٹیننٹ غشی میں تھا یا گہری نیند میں۔ اُسے گلوکوز لگا ہُوا تھا اور ایک نرسنگ سپاہی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ شمع کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"گلوکوز کی یہ آخری ڈرپ ہے" —— نرسنگ سپاہی نے کہا —— "آدھی رہ گئی ہے۔ میڈیکل آفیسر صاحب نے کہا ہے کہ یہ ختم ہو جائے تو اتار دینا.... آپ جائیں۔ آرام کریں۔"

"نہیں" —— شمع نے کہا —— "میں آرام کر آئی ہوں۔ تم اگر جانا چاہو تو چلے جاؤ" —— شمع دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"گلوکوز اتار کر جاؤں گا" —— نرسنگ سپاہی نے کہا —— "مس صاحبہ! بڑی ظالم جنگ ہے۔ آج جو زخمی آئے ہیں ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ معلوم نہیں یہاں تک زندہ کیسے پہنچے ہیں۔"

"ملک کو دشمن سے بچانا ہو تو اپنے جوانوں کی یہی حالت کرانی پڑتی ہے" —— شمع نے کہا —— "میرا اپنا بھائی آگے ہے۔ معلوم نہیں کس حال میں ہے.... یہ ابھی ہوش میں نہیں آیا؟"

"یہ سو رہے ہیں" —— نرسنگ سپاہی نے کہا —— "ڈاکٹر نیند اور سکون کا انجکشن دے گیا ہے۔"

دو گھنٹوں بعد گلوکوز ختم ہو گیا۔ نرسنگ سپاہی نے زخمی لیفٹیننٹ کے بازو سے سُوئی نکال کر وہاں سپرٹ والی روئی رکھ دی۔ شمع نے آگے ہو کر روئی کو اپنی انگلی سے دبا لیا۔ نرسنگ سپاہی چلا گیا۔ شمع کو نیند کا ہلکا سا احساس بھی نہ رہا اور باقی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ ہی ایک اور نرسنگ سپاہی کمرے میں آیا اور شمع کو بتایا کہ زخمی کے عزیز آتے ہیں۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک عورت اندر آئی۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ ان کے پیچھے ایک جوان عورت اور دو لڑکے تھے۔ عورت نے اِدھر اُدھر نہ دیکھا۔ وہ سیدھی زخمی پر جھپٹی اور اُس کا منہ چُومنے لگی۔

"میرا بچّہ" —— اس عورت نے وارفتگی سے کہا —— "میرا چاند.... میرا شیر پُتّر۔"

وہ زخمی لیفٹیننٹ کی ماں تھی۔ زخمی کا باپ زخمی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ شمع آگے بڑھی اور زخمی کی ماں کو پیچھے ہٹانے لگی۔

"امّاں جی!" —— اُس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "یہ سویا ہُوا ہے۔ گھبرائیں نہیں۔ اللہ نے اس کی جان بچا لی ہے۔"

ماں نے گھوم کر شمع کی طرف دیکھا تو وہ چونکی۔ شمع کو بھی دھچکہ لگا اور ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

"شمع؟" —— ماں نے کہا اور اپنے ساتھ آئی ہوئی دوسری عورت سے کہنے لگی —— "اری

گُلّی! تُو نے بھی اِسے نہیں دیکھا تھا؟.... تم یہاں کیا کر رہی ہو شمع؟"

"زخمیوں کی خدمت" —— شمع نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اس زخمی کو پہچانتی ہو؟" —— زخمی کی ماں نے پُوچھا۔

"نہیں تو۔"

"تو کیسے پہچانے گی" —— دوسری عورت نے شمع سے کہا —— "اسی کے لیے ہم نے تیرا رشتہ لیا ہے۔ تُو نے تو اسے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔"

یہی وہ لیفٹیننٹ تھا جس کے ساتھ شمع کا رشتہ طے ہُوا تھا اور وہ کہتی تھی کہ کسی فوجی کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔

"ہمیں رات کو اس کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی ہے" —— زخمی کی ماں نے کہا —— "رات کو ہی ہم نے وزیر آباد تمھارے گھر ایک آدمی کے ہاتھ پیغام بھیج دیا تھا۔ شاید تمھارے ابّاجان اور امّی آ جائیں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد شمع کا باپ اُس کی ماں کے ساتھ آ گیا۔ زخمی لیفٹیننٹ لطیف اُن کا ہونے والا داماد تھا۔ وہ صبح سویرے چل پڑے تھے۔ شمع کو اپنے منگیتر کے کمرے میں دیکھ کر وہ کچھ حیران ہُوئے۔

"دیکھ لے اپنے دولہا کو" —— ماں نے شمع کے کان میں کہا۔

شمع نے زخمی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ ابھی بیدار نہیں ہُوا تھا۔ شمع نے دروازے کی طرف دیکھا جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔

شمع وہاں سے بھاگ ہی نکلی اور کیپٹن عصمت کو ڈھونڈنے لگی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ کیپٹن عصمت اُسے اپنے دفتر میں بیٹھی مل گئی۔ اُسے آپریشن تھیٹر سے فراغت ملتی ہی نہیں تھی۔ زخمیوں کا ایک ریلا تھا جو چلا ہی آرہا تھا۔ ہر روز ہسپتال سے ایک دو تابوت نکلتے تھے، کلمۂ شہادت کی مقدس گونج اُبھرتی تھی اور یہ گونج فوجی گاڑیوں میں ہسپتال سے نکل جاتی، پاکستان کے دیہات میں جا پہنچتی اور بلند، بہت ہی بلند ہو جاتی تھی۔ جب جنازے اُٹھتے تھے تو لگتا تھا جیسے سارے علاقے کی آبادی قبرستان میں جمع ہو گئی ہو۔

"شہید زندہ ہوتے ہیں۔"

"کوئی نہیں روئے گا.... کوئی نہیں روئے گا۔"

"شہید کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔"

"اللہ موت دے تو ایسی دے۔"

آوازیں — جوشیلی آوازیں — جذباتی آوازیں — سسکیاں — ماؤں کی، بہنوں کی، بیٹیوں اور بیویوں کی دبی دبی، گھٹی گھٹی سسکیاں — "رونا نہیں، رونا نہیں.... شہید کی روح کو تکلیف ہو گی!" مائیں سسکتی بھی نہیں تھیں — "میرے بچے کی روح کو تکلیف ہو گی" — ماؤں نے بین اور آہ و فغاں اپنے سینوں میں روک لی تھی — دہکتے ہوئے انگارے نگل لیے تھے۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو اس لیے جلا لیا تھا کہ ان کے شہید بچوں کی روحوں کو تکلیف نہ ہو۔

ماؤں کے تصوّروں میں لمحوں کے قافلے پیچھے کو چل پڑے تھے۔ ہر شہید کی ماں کو وہ وقت یاد آ رہا تھا جب اُس کا بچہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا تھا۔ گیند پھینکتا اور اُس کے پیچھے رینگتا تھا — پھر یہ وقت آیا جب یہ بچہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ہی چلتا گیا۔ اب اُس کے ہاتھ میں گیند نہیں گرنیڈ تھا۔ جب گیند اُس کے ہاتھ میں ہوتا تھا تو اُس کی ماں مُسکرایا کرتی تھی اور جب گیند گرنیڈ بن گیا تو خدا مُسکرا اُٹھا۔

ماؤں کے دودھ کی دھاریں جذبۂ حریت کے شعلے بن گئی تھیں۔

فوجی ہسپتالوں کے آپریشن تھیٹروں میں جو لہو بہہ رہا تھا وہ اُس سبز پرچم کی آبیاری کر رہا تھا جو ہسپتالوں کی منڈیروں پر بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔

"کیوں شمع؟" — کیپٹن عصمت نے شمع کو اپنے کمرے میں دیکھ کر پوچھا — "گھبرائی گھبرائی سی کیوں ہو؟"

شمع کی ہنسی نکل گئی۔ وہ عصمت کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کہنیاں میز پر رکھ کر سر ہاتھوں

پر پھینک دیا۔

"عجیب اتفاق ہے" — شمع نے کہا — "سچّی عصمت! مجھے تو بڑی شرم آ رہی ہے۔"

"کیوں؟" — کیپٹن عصمت نے مسکراتے ہوئے پوچھا — "وہ زخمی لیفٹیننٹ ہوش میں آ گیا ہے؟.... معلوم ہوتا ہے اُس نے.... لڑکا سا ہی تو ہے وہ.... تمہیں خدا نے ایسا حُسن دیا ہے...."

"نہیں، نہیں" — شمع نے کہا — "وہ بیچارہ تو ابھی ہوش میں نہیں آیا، ہُوا یہ ہے کہ ابھی ابھی اُس کے ابّو، امّی، خالہ اور میری امّی اور ابّا جان آئے ہیں۔ اُنہوں نے بتایا ہے کہ یہی وہ لیفٹیننٹ ہے جس کے ساتھ میرا رشتہ طے ہُوا ہے.... مجھے کسی اور جگہ لگا دو عصمت! شرم آتی ہے۔"

"عجیب بیوقوف ہو" — کیپٹن عصمت نے کہا — "اُس کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لیے تمہیں خُدا نے بڑا اچھا موقع دے دیا ہے.... تم نے تو اُسے پہلے نہیں دیکھا تھا، کیا اُس نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا ہے؟"

"نہیں" — شمع نے جواب دیا۔

"وہ ابھی ہوش میں نہیں آیا" — عصمت نے کہا — "اُس کے عزیز چلے جائیں گے۔ کسی کو یہاں رہنے کی اجازت نہیں۔ اُس وقت تک وہ ہوش میں نہیں آئے گا۔ تم اپنے متعلق اُسے نہ بتانا۔ دیکھنا وہ تمھارے ساتھ کیسی باتیں کرتا ہے۔ اُسے پتہ تو چل ہی جائے گا۔ چلنے دو۔ اُس کے ساتھ رہو۔ گھبراؤ نہیں۔"

کیپٹن عصمت نے اُسے بہت کچھ سمجھا دیا۔

"عصمت!" — شمع نے پُوچھا — "میری امّی اور ابّا جان سے نہیں ملو گی؟ تم ان کی بہو بن رہی ہو!"

"مل لوں گی" — عصمت نے ایسے لہجے میں کہا جس میں خواہش اور اشتیاق نہیں تھا۔ سرد سے لہجے میں بولی — "تم چلو، میں آتی ہوں۔"

شمع جب لیفٹیننٹ لطیف کے کمرے میں گئی اُس وقت وہ ہوش میں آ چکا تھا اور بول رہا تھا لیکن اُس کے بولنے کا انداز نارمل نہیں لگتا تھا۔ ماں رہ رہ کر اُس کا ماتھا کبھی اُس کے گال چومتی اور اُس سے پوچھتی تھی کہ کہیں درد تو نہیں ہو رہا مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی کو پہچان نہیں رہا۔

"لطیف بیٹے!" — اُس کی خالہ نے اُسے کہا — "یہ شمع ہے نا، وزیر آباد والے چوہدری کرامت صاحب کی بیٹی۔"

لطیف نے شمع کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ شمع شرما کر اپنی ماں کے پیچھے ہو گئی۔

"ہاں، اِسی جیسی لڑکیاں تھیں وہ!" — لطیف نے کہا — "یہ پہلے نکل آئی ہو گی۔ حملے سے پہلے جو لوگ نہیں نکل سکے تھے اُن کی لڑکیوں کو کافر اٹھا کر لے گئے ہیں" — لطیف کے چہرے پر سُرخی آگئی۔ کہنے لگا — "میں واپس جاؤں گا۔ قوم کی بے عزّتی کا انتقام لوں گا" —

وہ ہنس پڑا اور بولا — "ہمارے ڈاکٹر بیوقوف لوگ ہیں۔ مجھے ذرا سا زخم آیا تو مجھے بیہوشی کا انجکشن لگا کر یہاں لے آئے.... یہ سیالکوٹ ہے نا!"

"نہ بیٹا!" — اُس کے باپ نے کہا — "یہ کھاریاں ہے۔ تم سی۔ ایم۔ ایچ میں ہو۔"

"ادھر آؤ" — لیفٹیننٹ لطیف نے شمع سے کہا۔

شمع ماں کی اوٹ میں ہوگئی۔

"آجا بیٹی!" — لطیف کی ماں نے شمع سے کہا۔

"جا شمع!" — اُس کی اپنی ماں نے کہا۔

"اس کی حالت دیکھ شمع بیٹی!" — لطیف کی خالہ نے شمع کا بازو پکڑ کر سرگوشی میں کہا — "اِس میں شرمانے والی کون سی بات ہے.... آگے ہو جا ذرا۔"

شمع بیڈ کے قریب چلی گئی۔

"تمہارا گاؤں کون سا تھا؟" — لیفٹیننٹ لطیف نے شمع سے پوچھا — "چونڈہ سے آگے بارڈر پر ہوگا!"

"بیٹا!" — لطیف کی ماں نے اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا — "یہ شمع ہے.... اقبال کی بہن.... وزیر آباد والے چوہدری کرامت صاحب کی بڑی بیٹی!.... لیفٹیننٹ اقبال یاد نہیں آرہا؟"

چوہدری کرامت لطیف کے بیڈ کے قریب بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ لطیف کے مُنہ کی طرف ہوگیا۔

"مجھے نہیں جانتے لطفی بیٹا؟" — چوہدری کرامت نے پیار سے پوچھا۔

"السلام علیکم چوہدری صاحب!" — لیفٹیننٹ لطیف نے دایاں ہاتھ چوہدری کرامت کی طرف بڑھا کر کہا — "آپ بزرگ ہیں۔ ان لوگوں سے کہیں مجھے جانے دیں۔ اگر ذرا ذرا سے زخموں کی وجہ سے یہ افسروں اور جوانوں کو محاذوں سے اُٹھا اُٹھا کر لاتے رہے تو وہاں لڑنے کے لیے کون رہ جائے گا؟"

"تمہارے زخم ذرا ذرا سے تو نہیں لطفی!" — چوہدری کرامت نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں" — کمرے کے دروازے سے آواز آئی — "آپ سب اس پر گرے ہوئے کیوں ہیں!.... پلیز.... پیچھے ہو کر بیٹھ جائیں"۔

سب نے دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر سویلین ڈاکٹر تھا۔ جنگ کے دوران کئی سویلین ڈاکٹروں نے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر فوج کو پیش کر دی تھیں۔ یہ ان ڈاکٹروں میں سے ایک تھا۔ وہ زخمیوں کو دیکھتا پھر رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ لطیف کے لواحقین اُسے نرغے میں لیے ہوئے اُس کے اُوپر جھکے ہوئے تھے۔

"اِس کا دم گھُٹ جائے گا" — ڈاکٹر نے کہا — "ذرا دیکھیں، گرمی کتنی ہے.... اس کے ساتھ ابھی زیادہ باتیں بھی نہ کریں۔"

"ڈاکٹر صاحب!" — لیفٹیننٹ لطیف کے باپ نے دُکھیاری سی آواز میں کہا — "میں اس کا باپ ہُوں۔ یہ ہوش میں ہے۔ باتیں بھی صحیح کرتا ہے لیکن ہمیں پہچانتا نہیں۔ شاید اس کا دماغ چوٹ سے....!"

"نہیں محترم!" — ڈاکٹر سب کو کمرے سے باہر لے گیا اور انہیں بتایا — "اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ انستھیسیا کا اثر اُتر رہا ہے۔ یہ وہ دوائی ہوتی ہے جو آپریشن سے پہلے مریض کو بیہوش کرنے کے لئے انجکشن کے ذریعے دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے مسلسل بیہوشی یا نیند میں رکھنے کے لیے دوائیاں دی جاتی رہی ہیں۔ یہ ان دوائیوں کے اثرات ہیں۔ جب ان کا نشہ اُتر رہا ہوتا ہے تو مریض اسی طرح باتیں کرتا ہے جیسے آپ کا بیٹا کر رہا ہے۔ سننے والے سمجھتے ہیں کہ مریض ہوش میں ہے لیکن وہ مکمل طور پر ہوش میں نہیں ہوتا۔"

"ڈاکٹر صاحب!" — لطیف کی ماں نے پوچھا — "کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟"

"نہیں میری بہن!" — ڈاکٹر نے تسلّی آمیز لہجے میں کہا — "بالکل نہیں۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔ آپ میں سے کسی کو بھی اس کے کمرے میں نہیں رہنا چاہیئے۔ آپ سب اسے دیکھ کر پریشان ہوتے رہیں گے اور یہ آپ کو دیکھ دیکھ کر تذبذب میں مبتلا ہو جائے گا۔ آپ اس کے ساتھ باتیں کرتے رہیں گے اور یہ بولتا رہے گا۔ یہ اس کے لیے ٹھیک نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ چلے جائیں اور پرسوں صبح اسے آکر دیکھیں۔ اُس وقت تک یہ ذہنی طور پر نارمل حالت میں آچکا ہوگا۔"

"اتفاق کی بات ہے ڈاکٹر صاحب!" — چوہدری کرامت نے شمع کے متعلّق کہا — "یہ ہماری اپنی بچی ہے.... میری بیٹی ہے۔"

"یہ تو رضاکارانہ طور پر کام کر رہی ہے نا!" — ڈاکٹر نے کہا — "یہ تو اور اچھا ہے۔ ہم نے اسے اسی کمرے کی ڈیوٹی دے دی ہے.... اچھا، اللہ آپ کے بچے کی یہ قربانی قبول کرے۔ اس کے متعلق آپ بے فکر ہو جائیں اور چلے جائیں۔ اللہ نے اسے نئی زندگی دے دی ہے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ان سب نے پھر لیفٹیننٹ لطیف پر دھاوا بول دیا۔ اُس کی ماں، خالہ اور شمع کی ماں اُس کا منہ یوں چوم رہی تھیں جیسے اُسے چاٹ ہی لیں گی۔ لطیف نے اپنے باپ اور شمع کے باپ سے ہاتھ ملایا۔

"تم لوگ پیچھے چلے جاؤ" — لطیف نے انہیں کہا — "پیچھے ہماری آرٹلری ہے۔ اس سے بھی دور پیچھے چلے جانا۔ بہتر ہے تم لوگ سیالکوٹ چلے جاؤ۔"

وہ سب باہر نکل آئے۔



شمع اپنی ماں اور اپنے باپ کو پرے لے گئی۔

"ابا جان!" — شمع نے کہا — "آپ پہلی بار یہاں آئے تھے تو نرسوں کی ایک افسر کیپٹن عصمت سے ملے تھے.... اُس کے پاس اقبال بھائی جان کی فوٹو ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ بھائی جان کے ساتھ شادی کرے گی اور اُنہوں نے یہ شادی پکّی طے کر رکھی ہے.... امّی جان!

آپ بھی اس سے مل لیں اور دیکھ لیں۔ بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔"

"نہ شمع!" ___ ماں بولی ___ "یہ کیسے ہوسکتا ہے! میرا بھائی کب سے آس لگائے بیٹھا ہے۔ اُس نے تو یہ پکّی کر رکھی ہے کہ اپنی بیٹی اقبال کو دے گا۔"

"بلکہ دے چکا ہے" ___ شمع کے باپ نے کہا ___ "ہم خون کے رشتوں کو تو نہیں ٹھکرا سکتے۔"

اتنے میں کیپٹن عصمت آگئی۔

"عصمت!" ___ شمع نے کہا ___ "ابا جان سے تو تم پہلے ہی مل چکی ہو۔ ان سے ملو۔ یہ میری امّی ہیں۔"

کیپٹن عصمت انہیں اس طرح ملی جیسے ان لوگوں کے ساتھ اُسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اُس نے مختصر سی جو ایک دو باتیں اُن سے کیں اُن میں محض رسمی پن اور تصنّع تھا۔ وہ شمع کے باپ سے معذرت کر کے چلی گئی۔

"نہ جی نہ" ___ شمع کی ماں نے کہا ___ "میں گھر میں بہو لاؤں گی ہمیں افسر نہیں چاہیئے۔ اس نے تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔"

"میرے ساتھ تو اس کا سلوک بہت ہی اچھا ہے" ___ شمع نے کہا۔

"تم اس کے ساتھ اچھا سلوک رکھو" ___ چوہدری کرامت نے کہا ___ "صرف یہ خیال رکھنا کہ یہ اپنی شادی کی کوئی بات کرے تو تم ہاں میں ہاں ملاتی چلی جانا، کوئی اور بات نہ کرنا۔"

کچھ دیر بعد سب لوگ چلے گئے۔ لطیف کی ماں نے جانے سے پہلے شمع کو گلے لگا کر کہا کہ وہ لطیف کا بہت خیال رکھے۔

شمع آہستہ آہستہ لیفٹیننٹ لطیف کے کمرے میں گئی۔ لطیف گہری نیند سویا ہُوا تھا اور ایک نرس اُس کے بازو سے بلڈ پریشر کے آلے کی پٹّی کھول رہی تھی۔

"کیسا ہے؟"

"بلڈ پریشر بالکل نارمل ہے" ___ نرس نے جواب دیا ___ "سوچتی ہوں کتنے خوبصورت جوان اپنے وطن پر قربان ہو رہے ہیں۔"

"سسٹر!" ___ شمع نے اُس سے پوچھا ___ "اس میں کوئی مستقل جسمانی نقص تو نہیں رہ جائے گا؟"

"نہیں" ___ نرس نے جواب دیا ___ "زیادہ شدید زخم ٹانگ کا تھا۔ دو یا غالباً تین جگہوں سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ ہڈی ٹھیک جڑ گئی ہے.... معلوم ہوتا ہے یہ تمہارا کوئی عزیز ہے!"

"ہاں" ___ شمع نے کہا ___ "عزیز ہی سمجھو۔"

شمع لطیف کے بیڈ کے پاس پڑے ہُوئے بنچ پر بیٹھ گئی اور اُس کی نظریں لطیف کے چہرے پر جم گئیں۔ اُسے رشید کا چہرہ یاد آگیا۔ اُس نے لاشعوری طور پر سر کو زور زور سے دائیں بائیں ہلایا جیسے رشید کے تصوّر کو ذہن سے نکال پھینکنے کی کوشش کی ہو۔

"وہ بھی نوجوان ہے" ___ شمع کو خیال آیا ___ "اور یہ بھی نوجوان ہے۔ دونوں کی مائیں ایک جیسی ہیں اور دونوں کے باپ بھی ایک جیسے ہیں مگر ان دونوں لڑکوں میں کتنا فرق ہے۔"

شمع کو یہ پچھتاوا پریشان کرنے لگا کہ رشید جیسے گھٹیا لڑکے کے ساتھ فلموں جیسی محبّت کر کے وہ کتنی ذلیل ہُوئی ہے۔

"اگر قوم کے سارے نوجوان رشید جیسے ہوتے تو آج کھاریاں چھاؤنی میں ہندوستانی فوج گھوم پھر رہی ہوتی" ___ شمع نے سوچا اور اُس نے اپنے جسم میں لرزہ سا محسوس کیا۔

اس قسم کے خیالوں اور تصوّروں کا ایک ریلا اُس کے ذہن میں آیا اور وہ ایک تنکے کی طرح اڑنے اور بھٹکنے لگی۔ پھر اُس کا خون کھولنے لگا۔ وہ اُس وقت چونکی جب اُس نے دیکھا کہ اُس کا ایک ہاتھ سوئے ہُوئے لیفٹیننٹ لطیف کے ننگے بازو پر رینگ رہا ہے۔ اُس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"اگر یہ شخص محاذ سے اندھا ہو کر آتا" ___ شمع نے اپنے آپ سے کہا ___ "ٹانگوں اور بازوؤں سے بھی محروم ہو جاتا تو بھی میں اسے ساری عمر کی رفاقت کے لیے قبول کر لیتی۔"



دن گزر گیا۔ شمع نے لطیف کو دو مرتبہ دوائیاں دیں جو ڈاکٹر دے گیا تھا۔ شام کو لطیف نے خود شمع سے کہا کہ وہ بیٹھ کر کچھ کھانا چاہتا ہے۔ شمع نے اُس کے پاس بیٹھ کر بازو اُس کی گردن کے نیچے رکھا اور اُسے اس طرح بٹھا دیا کہ خود اُس کے پیچھے بیٹھ گئی اور اُس کی پیٹھ اپنے ساتھ لگا لی۔

"تم اس ہسپتال میں ملازم ہو؟" ___ لطیف نے شمع سے پوچھا۔

"نہیں" ___ شمع نے جواب دیا ___ "دوسری بہت سی لڑکیوں کی طرح میں بھی یہاں رضاکارانہ طور پر کام کرنے آئی ہُوں۔"

"کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"تم خود ہی کہتے تھے کہ میں چونڈہ سے آگے کے کسی گاؤں کی رہنے والی ہوں" ___ شمع نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"میں نے؟" ___ لطیف نے حیران سا ہو کے پوچھا اور شمع کی طرف دیکھا جو اُس کے پیچھے بیٹھی ہُوئی تھی۔ دونوں کے منہ اس قدر قریب ہو گئے کہ اُن کی سانسیں ٹکرانے لگیں۔ لطیف نے کہا ___ "میں نے کب کہا تھا؟ میں تو تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہُوں.... تم دیہاتی تو نہیں لگتیں۔"

"میں وزیر آباد کی رہنے والی ہوں۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟" ___ لطیف نے پوچھا۔

"ناہید" ___ شمع نے جھوٹ بولا۔

"لٹا دو مجھے" ___ لطیف نے کہا۔

"کیوں؟" ___ شمع نے پوچھا ___ "تکلیف ہوتی ہے؟"

"ہاں"۔۔۔ لطیف نے جواب دیا۔۔۔"تکلیف تو ہوتی ہی ہے لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا کہ ایک نوجوان لڑکی کے بازوؤں میں بیٹھوں۔"

"میں نے تو کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی"۔۔۔ شمع نے کہا۔۔۔"اگر تمھیں اس طرح بیٹھ کر آرام محسوس ہوتا ہے تو بیٹھے رہو۔"

"نہیں ناہید!"۔۔۔ لطیف نے کہا۔۔۔"مجھے ابھی آرام کی ضرورت نہیں اور مجھے کسی کے سہارے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تمھاری رضاکارانہ خدمت کو رد کر رہا ہوں میں تمھارے جذبے کی داد دیتا ہوں.... مجھے لٹا دو ناہید!"

شمع نے سہارا دے کر اُسے لٹا دیا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کیا کھانا چاہتا ہے۔ لطیف نے کہا کہ کوئی فروٹ ہو تو دے دو۔ ناہید نے اُٹھ کر انگور کی پلیٹ اُس کے قریب رکھ دی۔ لوگوں نے ہسپتالوں میں فروٹ کے تو انبار لگا دیئے تھے۔

"ناہید!"۔۔۔ لطیف نے انگور کھاتے ہُوئے شمع سے پوچھا۔۔۔"چوہدری کرامت علی کو جانتی ہو؟.... وزیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ اُن کا ایک بیٹا اقبال لیفٹیننٹ ہے۔"

"ہاں جانتی ہوں"۔۔۔ شمع نے جواب دیا۔۔۔"وہ ہمارے ساتھ والی گلی میں رہتے ہیں.... وہ تمھارے کچھ لگتے ہیں؟"

"ہاں"۔۔۔ لیفٹیننٹ نے جواب دیا اور پوچھا۔۔۔"پھر تو تم اُن کی بیٹی شمع کو جانتی ہو گی۔"

"ہاں"۔۔۔ شمع نے جواب دیا۔۔۔"اچھی طرح جانتی ہوں۔ سکول میں بھی اور کالج میں بھی میری کلاس فیلو رہی ہے.... کیوں، تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"کیسی لڑکی ہے؟"۔۔۔ لیفٹیننٹ لطیف نے پوچھا اور ذرا سوچ کر بولا۔۔۔"میرے ماں باپ اُس کے ساتھ میرا رشتہ پکّا کر چکے ہیں۔"

"اگر میری رائے لینے ہو تو تمھیں مایوسی ہو گی"۔۔۔ شمع نے کہا۔

"کیوں؟"۔۔۔ لطیف نے پوچھا۔۔۔"کوئی خرابی ہے؟.... میرا مطلب ہے چال چلن...."

"نہیں"۔۔۔ شمع نے جواب دیا۔۔۔"چال چلن کی تو اچھی ہے، شکل و صورت کی ویسی ہی ہے.... تمھارے قابل نہیں۔"

"میری امّی اور خالہ نے اُسے دیکھا ہے"۔۔۔ لطیف نے کہا۔۔۔"وہ کہتی ہیں شمع بہت خوبصورت ہے!"

"وہ پھر کوئی اور شمع ہو گی"۔۔۔ شمع نے کہا۔۔۔"اچھا یہ بتاؤ.... تمھیں معلوم نہیں کہ تمھاری امّی، خالہ اور تمھارے والد صاحب، شمع کے والد چوہدری کرامت اور شمع کی امّی آج صبح تمھیں دیکھنے آئی تھیں؟ تم اُن کے ساتھ باتیں کرتے رہے تھے۔"

"نہیں تو"۔۔۔ لیفٹیننٹ لطیف نے کہا۔۔۔"مجھے کچھ بھی یاد نہیں.... اچھا تو شمع کے ابّا اور امّی بھی مجھے دیکھنے آئے تھے!"

"کیا تم یہ سُن کر مایوس نہیں ہُوئے کہ شمع خوبصورت لڑکی نہیں؟"۔۔۔ شمع نے پوچھا۔

"نہیں ناہید!"۔۔۔ لطیف نے آہ لے کر کہا۔۔۔"چھ ستمبر سے پہلے کی بات کچھ اور تھی۔ اُس وقت تک تو میری اور میرے دوستوں کی حالت یہ تھی کہ فلمی رسالوں میں ایکٹریسوں کے فوٹو دیکھ کر ہم کہا کرتے تھے کہ فلاں ایکٹریس جیسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ شادی کریں گے، مگر اب خدا کی قسم ناہید! کوئی معذور اور بدصورت لڑکی مل گئی تو اُسے بھی قبول کر لوں گا۔"

"اب کیا ہو گیا ہے؟"

"ہُوا یہ ہے ناہید!"۔۔۔ لیفٹیننٹ لطیف نے آہ بھری اور کہا۔۔۔"اب یہ ہُوا ہے کہ میں نے عورت کو بہت بُری مظلومیّت میں دیکھا ہے۔ سرحدی دیہات کی جوان لڑکیوں کے ساتھ ہمارے دشمن نے جو سلوک کیا ہے، وہ میں سُنا نہیں سکتا۔ سناؤں گا تو تم سن نہیں سکو گی۔ پہلے حملے میں تو دشمن نے بہت سے دیہات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہم نے جوابی حملہ کر کے اپنے کئی گاؤں دشمن سے واپس لے لیے۔ ہم نے وہاں جوان پاکستانی لڑکیوں کی برہنہ لاشیں دیکھیں۔ بعض لڑکیوں کو دشمن اپنے ساتھ لے گیا تھا....

"ہندو جنگجو قوم نہیں اس لیے اُن کا کردار بھی کوئی نہیں۔ لڑکیوں اور بچّوں کا کیا قصور تھا؟.... ہم فوجی لوگ محاذوں پر اپنی قوم کی عصمت پر کٹ رہے ہیں"۔۔۔ لطیف نے آہ بھری اور سانسوں کو سنبھالتے ہُوئے بولا۔۔۔"جوان عورت کے متعلق، تم جیسی لڑکیوں کے متعلق میرے خیالات بدل گئے ہیں۔ دماغ میں جب ملک اور قوم کی عظمت سما جاتی ہے تو دماغ میں بالکل صحیح سوچیں آنے لگتی ہیں۔ تم جس شمع کو خوبصورت نہیں سمجھتیں اُسے میری نظروں سے دیکھو۔ اُسے اُس مرد کی نظروں سے دیکھو جس کی آنکھوں میں خون اُترا ہُوا ہو، جس نے اپنے مذہب اور اپنے ملک کے دشمن کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہو۔"

"لطیف!"۔۔۔ شمع نے لطیف کے ماتھے پر آتے ہُوئے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے کرتے ہُوئے کہا۔۔۔"زیادہ باتیں نہ کرو۔ ایسی جوشیلی اور جذباتی باتیں نہ کرو کہ تمھارا خُون جوش میں آ جائے۔ مجھے اسی لیے تمھارے کمرے میں رکھا گیا ہے کہ ڈاکٹروں کی ہدایات وغیرہ کے مطابق تمھاری دیکھ بھال کروں۔ آرام کر لو۔"

"مجھے بولنے دو ناہید!"۔۔۔ لیفٹیننٹ لطیف نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔۔۔"مجھے باتیں تو کر لینے دو.... زخمی ہونے کی بجائے میں مر جاتا تو اچھا تھا۔ یہ غم تو نہ ہوتا کہ میں زندہ یہاں لیٹا ہُوا ہوں اور میرے ساتھی آگے لڑ رہے ہیں۔"

"کیا تم اپنا فرض ادا نہیں کر چکے؟"۔۔۔ شمع نے کہا۔۔۔"تم اتنی بُری طرح زخمی ہُوئے ہو کہ دوسرے زخموں کے علاوہ تمھاری ایک ٹانگ تین جگہوں سے ٹوٹی ہوئی ہے۔"

"لیکن ناہید!"۔۔۔ لطیف نے کہا۔۔۔"میں تو پورے کا پورا قربان ہونے گیا تھا.... میں نے وہاں جو دیکھا ہے اسے میں کیسے بھول سکوں گا۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔"

"انتقام لینے کے لیے پوری فوج موجود ہے"۔۔۔ شمع نے کہا۔

"جو میں نے دیکھا ہے وہ پوری فوج نے نہیں دیکھا"۔۔۔ لطیف نے کہا۔۔۔"وہ میں تمھیں

سناتا ہوں۔ چونڈہ میں جو لڑائی ہو رہی ہے، وہ یوں سمجھو کہ اُدھر ٹینک ہیں اور ادھر انسان ہیں۔ پاکستان کے پاس اتنے ٹینک ہیں ہی نہیں کہ وہ دشمن کے اتنے زیادہ ٹینکوں کی یلغار کو روکتے۔ ٹینکوں کا کام مجھ جیسے انسان کر رہے ہیں.... ناہید! تم نہیں سمجھ سکتیں کہ ٹینک کیسا ہوتا ہے۔"

"میں نے ٹینک دیکھے ہیں" — شمع نے کہا — "ریل گاڑی پر لاہور کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ یہ تو بڑی ہیبت ناک چیز ہوتی ہے۔"

"ٹینک لوہے کا قلعہ ہوتا ہے ناہید!" — لیفٹیننٹ لطیف نے کہا — "یہ گولے اور گولیاں اگلتا ہے۔ ٹینک کو ٹینک ہی توڑ سکتا ہے، لیکن ہمارے جوانوں نے راکٹ لانچروں سے.... نہیں ناہید! تم نہیں سمجھ سکتیں۔ یہ فوجی باتیں ہیں اور یہ جذبے کی باتیں ہیں۔ تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اتنی سی بات سمجھ لو کہ ہم جذبۂ حریت اور شجاعت کی ایسی روایت قائم کر رہے ہیں جسے تاریخ اپنے دامن میں ڈالنے سے بھی گھبرائے گی۔ ہم اپنی آنے والی نسلوں کے لیے یہ روایت چھوڑ جائیں گے کہ تمہارے جذبۂ حب الوطنی اور شجاعت کا معیار یہ ہو گا تو دشمن سے اپنے مذہب اور اپنے ملک کے وقار کو بچا سکو گے۔"

"تم نے پھر جوشیلی اور جذباتی باتیں شروع کر دی ہیں" — شمع نے کہا۔ اُس کے انداز میں دوستانہ سی بے تکلفی تھی۔

"کیا یہ باتیں تمہیں اچھی نہیں لگتیں؟"

"مجھے تو اچھی لگتی ہیں" — شمع نے جواب دیا — "تمہارے لیے اچھی نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہیں غنودگی آ رہی ہے اور تم زبردستی بولے جا رہے ہو.... میں تو کہتی ہوں کہ مجھے یہی باتیں سناتے رہو اور اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے ساتھ محاذ پر لے چلو۔"

"ابھی ہم زندہ ہیں" — لطیف نے کہا — "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا دشمن جو ہمیشہ ہمارا دشمن رہے گا بہت اوچھا اور کمینہ ہے۔ اُس کا پہلا حملہ نہتے دیہاتیوں اور اُن کی عورتوں پہ ہوتا ہے۔ ہمارے دشمن نے چونڈہ سیکٹر میں ایک ایسی حرکت بھی کی ہے جسے دنیا کی کوئی قوم شاید سچ نہیں مانے گی۔"

"نوجوان لڑکیوں کو اُٹھا کر لے گئے ہوں گے" — شمع نے کہا۔

"یہ تو اُنہوں نے کیا ہی ہے" — لیفٹیننٹ لطیف نے کہا — "اُنہوں نے ہمارے سرحدی دیہات کی بہت سی عورتوں اور اُن کے بچوں کو اپنے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جنگ کا تیسرا چوتھا روز تھا۔ چونڈہ سیکٹر میں پھلورا اور گڈگور دو گاؤں ہیں۔ ہم نے دشمن پر جوابی حملہ کیا تو میری بٹالین اپنے ٹینکوں کے ساتھ آگے بڑھی۔ زمین اور آسمان گولوں اور گولیوں کے دھماکوں سے پھٹ رہے تھے۔ اچانک ہمیں فائر بند کرنے کا حکم ملا....

"تم نہیں سمجھ سکتیں کہ ٹینک اور پیادہ کمپنیاں کس طرح پیش قدمی کیا کرتی ہیں۔ میں تمہیں وہ بات سناتا ہوں جو تم سمجھ سکتی ہو۔ ہمیں جب فائر روکنے کا حکم ملا اور جب دیکھا کہ ہمارے ٹینک بھی رک گئے ہیں تو ہم صرف حیران ہی نہ ہوئے بلکہ ہمیں غصہ آ گیا کہ اتنا تیز حملہ کیوں روک

لیا گیا ہے۔ جوانوں نے پوزیشنیں لے لیں۔ دشمن کی طرف سے فائر آ رہا تھا۔ میں چونکہ آفیسر ہوں اس لیے میں اِدھر اُدھر ہو سکتا تھا اور میرے پاس دُوربین بھی تھی۔ میں نے دُوربین سے دیکھا۔ دشمن نے اپنے مورچوں کے سامنے ہمارے دیہات کی عورتوں اور بچوں کو کھڑا کر رکھا تھا اور اُن کے درمیان مشین گنیں رکھ کر وہ ہم پر فائر کر رہے تھے۔ ہمارے کمانڈر کو معلوم تھا کہ یہ ہماری عورتیں اور ہمارے ہی بچے ہیں جنہیں ان کافروں نے پہلے ہی ہلے میں پکڑ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔"

"اُنہوں نے ان بے چاریوں کو اسی مقصد کے لیے اپنے پاس رکھا ہو گا" — شمع نے کہا۔

"ہندو کا پہلا حملہ عورت اور بچے پر ہوتا ہے" — لطیف نے کہا — "انہیں قیدی بنا کر ان بدبختوں نے انہیں اپنی ڈھال بنا لیا۔ ان عورتوں اور بچوں میں چند ایک آدمی بھی تھے۔ اُنہوں نے چلا چلا کر ہمیں کہا کہ آگے آؤ۔ فائر مت روکو۔ ہماری پروا نہ کرو، لیکن ناہید! انسانی فطرت ایسی ہے کہ ضرورت ہو تو بھی اپنی مستورات اور بچوں کو کون اپنی گولیوں کا نشانہ بنا سکتا ہے" — لطیف کو ہچکی سی آئی اور وہ خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا لطیف؟" — شمع نے پوچھا۔

لیفٹیننٹ لطیف کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ بے ہوش نہیں ہو گیا تھا، وہ سو بھی نہیں گیا تھا لیکن اُس کی آنکھوں اور اُس کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ اُس کا جسم ہسپتال کے اس کمرے میں ہے لیکن اس کی رُوح وہیں جا پہنچی ہے جہاں دشمن نے ہماری عورتوں اور بچوں کو اپنی ڈھال بنایا تھا۔ شمع نے اُس کے ایک گال پہ ہلکی سی تھپکی دے کر اُسے بیدار کرنے کی کوشش کی۔

"بولو نا لطیف!" — شمع نے کہا — "پھر کیا ہوا تھا؟"

"وہی ہوا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا" — لطیف نے دبی دبی سی آواز میں کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے — "ہم حملہ روک نہیں سکتے تھے۔ ہمیں یہ قربانی دینی پڑی۔ ہمارے ٹینکوں نے اور ہماری مشین گنوں نے آگ اُگلنی شروع کر دی۔ دشمن پسپا ہو گیا۔ ہم جب وہاں پہنچے تو دشمن کی لاشوں کے ساتھ اُن تمام مستورات اور اُن کے بچوں کی لاشیں پڑی تھیں....

"ان عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر ہم سب پاگل سے ہو گئے۔ اس کے بعد ہم نے جو معرکہ لڑا وہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔ یہ چونڈہ سیکٹر کی بڑی ہی خونریز لڑائی تھی۔ تم اسے جذبہ کہو گی، لیکن میں اسے جذبے کا پاگل پن کہتا ہوں۔ پاگل ہوتے ہوتے ہم پوری طرح ہوش میں تھے۔ میدانِ جنگ کا ڈسپلن قائم تھا اور ہم آسمان سے گرنے والی بجلی بن گئے تھے۔ اس جذبے کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ہم نے دشمن سے گڈگور گاؤں چھین لیا۔ اگر رات نہ آ جاتی تو ہم اور آگے نکل جاتے۔ میں کچھ زیادہ ہی آگے چلا گیا تھا۔ میرے جوان ابھی اور آگے جانا چاہتے تھے۔ دشمن کے کسی ٹینک نے ہماری پوزیشن دیکھ لی۔ یکے بعد دیگرے اُس کی توپ کے تین گولے آئے۔ تیسرا گولہ میرے قریب پھٹا....

"میں گر پڑا۔ خدا کی قسم ناہید، مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میں اتنا زخمی ہو گیا ہوں جتنا تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں اٹھا لیکن میری یہ ٹانگ جو ٹوٹی ہوئی ہے میرے نیچے دوہری ہو گئی اور میں گر پڑا۔ تب میں

نے دیکھا کہ گولے کے ٹکڑے میری ٹانگ کی ہڈی کو دو تین جگہوں سے کاٹ گئے تھے۔ ایک ٹکڑے نے پیٹ بھی چیر دیا۔ ایک ٹکڑا بائیں پہلو میں لگا۔ میں پوری طرح ہوش میں رہا۔ جب مجھے سٹریچر پر ڈالنے لگے تو بھی میں ہوش میں تھا۔ میں بہت چیخا کہ مجھے پیچھے نہ لے جاؤ لیکن میرے کمپنی کمانڈر نے غصے میں کہا — "لطفی، پیچھے جاؤ" — اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔"

شمع بھی جیسے محاذ پر پہنچ گئی تھی۔ لیفٹیننٹ لطیف کی ایک سسکی نے اُسے بیدار کر دیا۔ اُس نے دیکھا کہ لطیف کی آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہے جا رہے تھے اور وہ سسک رہا تھا۔ شمع دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔

★

برِصغیر کی تاریخ ہمیشہ گواہی دیتی رہے گی کہ جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کے تیسرے ہی روز بھارت کا اُس وقت کا وزیرِاعظم لال بہادر شاستری بلبلا اٹھا تھا کہ بھارت ابھی، اسی وقت فائر بندی کرنے کو تیار ہے۔ یہ برہمن کی فریب کاری کا مظاہرہ تھا۔ رن کچھ کی جنگ میں بھی اُس نے اُسی وقت فائر بندی کی پیشکش کر دی تھی جب اُس کا پورا ڈویژن پاکستان کے ایک بریگیڈ کے گھیرے میں آگیا تھا اور پاکستان نے فائر بندی قبول کر لی تھی۔

برہمن نے اپنے ڈویژن کو بچا کر اعلان کیا تھا — "اب ہم پاکستان کو اپنی پسند کے میدان میں لڑائیں گے" — لال بہادر شاستری نے یہ اعلان کھیم کرن کے ڈاک بنگلے میں بیٹھ کر اخبار نویسوں کے سامنے کیا تھا۔ پھر چند ہی روز بعد بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ کھیم کرن کا وہی ڈاک بنگلہ تھا جس میں چند روز پہلے شاستری نے پاکستان کو للکارا تھا مگر اب اس ڈاک بنگلے میں پاک فوج کے افسر بیٹھے ہوتے تھے اور کھیم کرن پر پاک فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شاستری اب پھر فائر بندی کی بھیک مانگ رہا تھا لیکن پاکستان مان نہیں رہا تھا۔

آخر بھارت کی درخواست پر اقوامِ متحدہ نے فائر بندی کی بات چیت شروع کر دی اور پاکستان نیم رضامندی تک پہنچ گیا۔ جب بھارت کی سیاسی اور فوجی قیادت نے دیکھا کہ فائر بندی جلدی ہو جائے گی تو اُس نے قصور، کھیم کرن اور لاہور سیکٹروں کو کمک دے کر فوج کو یہ حکم دیا کہ فائر بندی سے پہلے پہلے زوردار حملہ کر کے بی آر بی پار کرو اور کچھ علاقہ قبضے میں لے لو تاکہ پاکستان پر اپنی شرائط مسلط کی جا سکیں، مثلاً لاہور کے متعلق بھارتی حکومت کے احکام یہ تھے کہ شالامار تک پہنچ جاؤ — یہ تھی برہمن کی صحیح ذہنیت کہ ایک طرف فائر بندی کے لیے واویلا اور دوسری طرف پاکستانی علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش۔

ان احکام پر انڈین آرمی نے جب عمل شروع کیا تو محاذوں پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ دشمن نے سب سے زیادہ دباؤ لاہور پر ڈالا تاکہ بی آر بی نہر پار کر سکے۔ پھر قصور، کھیم کرن سیکٹر پر بے تحاشا دباؤ ڈالا تاکہ پاک فوج سے کھیم کرن واپس لے سکے۔

بیدیاں سیکٹر بھی ان تازہ حملوں کی زد میں آگیا۔ بیدیاں سائیفن جو نہر عبور کرنے کے کام آسکتا تھا محفوظ تھا۔ پاک فوج کے جو ٹروپس اس سیکٹر میں تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ

دشمن مزید کمک لا رہا ہے اور وہ پوزیشنیں بھی مضبوط کر رہا ہے۔ دشمن کے اجتماع کو لیفٹیننٹ اقبال نے اپنے چند ایک جوانوں کے ساتھ کمانڈو آپریشن سے درہم برہم کر دیا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ دشمن کے حملے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ اب دشمن کو وہاں مزید کمک مل گئی تھی۔ آگے سے جو رپورٹیں "بنگال ٹائیگرز" کے کمانڈنگ آفیسر کے پاس آرہی تھیں، خاصی تشویشناک تھیں۔ تشویش یہ تھی کہ پاکستان کے پاس کمک نہیں تھی۔ بیدیاں سیکٹر میں توپخانے میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر نے بریگیڈ کمانڈر کے حکم سے سائیفن کے پار برج ہیڈ بنانے کی ڈیوٹی لیفٹیننٹ اقبال کی کمپنی کے سپرد کی۔ اس کمپنی کی دو پلاٹونوں کو سائیفن کے پار جا کر مورچے قائم کرنے تھے۔ ایک پلاٹون لیفٹیننٹ اقبال کی تھی۔

رات کے وقت دونوں پلاٹونیں خاموشی سے سائیفن سے گزر کر آگے چلی گئیں اور اُنہوں نے وہی پوزیشنیں سنبھال لیں جو ابتدائی دنوں میں خالی کر دی گئی تھیں۔ اقبال کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ رات کو کمپنی کمانڈر اور بٹالین کمانڈر پوزیشنیں دیکھنے آئے۔ اُنہوں نے جوانوں کے حوصلے بڑھائے اور واپس چلے گئے۔

★

اُس رات بھی مورچوں میں ایک آدھ سیکنڈ کے لیے بھی کسی کی آنکھ نہ لگی۔ افسروں اور جوانوں کے جسم چکنا چُور ہو چکے تھے۔ اب تو وہ اپنی روحانی طاقت سے مورچوں میں ڈٹے ہُوئے تھے۔ دشمن کا حملہ کسی بھی وقت متوقع تھا لیکن کسی کو یہ گمان تک نہ تھا کہ ایک دو گھنٹوں بعد ہی حملہ شروع ہو جائے گا۔ صبح کاذب سے ذرا ہی بعد دشمن کی کم و بیش اڑھائی سو چھوٹی بڑی توپوں کے دہانے کھل گئے۔ یہ بڑی تیز اور بڑی شدید گولا باری تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حملہ آرہا ہے۔ بنگالیوں کے نعرے توپوں کے دھماکوں کی طرح گرجنے لگے۔ ان نعروں میں قہر اور غضب تھا۔ توپوں کے گولے نہر کے اوپر سے گزر کر پچھلے مورچوں پر گر رہے تھے۔ دشمن کو معلوم نہیں تھا کہ سائیفن کے آگے برج ہیڈ کے مورچے ہیں۔

لیفٹیننٹ اقبال، نائب صُوبیدار بدر الحق، دوسری پلاٹون کا پلاٹون کمانڈر اور اُس کا صُوبیدار مورچوں سے باہر آگئے۔ اُنہوں نے جوانوں کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے جوشیلی باتیں شروع کر دیں۔ یہ چاروں ہر مورچے میں جاتے، کہیں نعرے لگاتے، کہیں کوئی جذباتی بات کہتے جاتے تھے۔ لیفٹیننٹ اقبال نے آر آر والی جیپ کو بڑی صحیح پوزیشن میں رکھا ہُوا تھا۔ بٹالین کی مارٹر پلاٹون کا ایم ایف او جس کی ڈیوٹی توپخانے کے او پی کی طرح ہوتی ہے اقبال کی پلاٹون سے کچھ آگے ایک ٹیکری پہ پوزیشن لیے ہوئے تھا۔ اقبال دوڑتا ہُوا ایم ایف او تک گیا۔ وہ ایک حوالدار تھا۔

"حوالدار متین!" — اقبال نے اُسے کہا — "یاد رکھو، گھبرا کر فائر آرڈر نہیں دینا۔ دشمن جب قریب آجائے تو اپنی پلاٹون کو فائر آرڈر دو اور پوری مارٹر پلاٹون کا فائر مانگو۔ گھبرانا نہیں۔ میں تمہارے پاس آتا رہُوں گا۔"

"شَرا!— اس بنگالی حوالدار نے پُرعزم لہجے میں کہا —" ہم گھبرائے گا نہیں۔ ہم سہید ہو جائے گا تو اِدھر فوراً آؤ۔"

"میں آؤں گا متین!— اقبال نے کہا —"میں پہنچوں گا۔"

اُس نے حوالدار متین کو اپنے وائرلیس کی فریکوئنسی بتا کر کہا —" اگر تم زخمی ہو جاتے ہو تو ہم کو پکارو۔"

اس قدر قیامت خیز گولا باری کے سائے میں انڈین آرمی کا ایک ڈویژن ٹینکوں کو ساتھ لیے ہوئے بڑے تیز طوفان کی طرح آگیا۔ پھر زمین و آسمان ایک مسلسل دھماکہ بن گئے دشمن کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ جنگی اصولوں کو دیکھتے ہوئے اس طاقت کا مقابلہ ایسٹ بنگال رجمنٹ نہیں کر سکتی تھی، لیکن برِج ہیڈ کے مورچوں کے قریب آکر دشمن کے حملے کی رفتار سست ہو گئی۔

لیفٹیننٹ اقبال پھیپھڑوں کا پُورا زور لگا کر چلّا رہا تھا "اور قریب آنے دو۔ اور قریب آنے دو۔ گرنیڈوں کی زد میں آنے دو..... پوری طاقت سے گرنیڈ پھینکو"— اس طرح چیختا چلّاتا اقبال اُڑتی گولیوں میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ وہ آر آر کی جیپ تک بھی گیا جو خندق میں تھی۔ سحر کی نیم تاریکی میں اُس نے گنروں کو دو ٹینک دکھائے جو گنروں نے یکے بعد دیگرے دو گولے فائر کر کے ہٹ کر لیے۔ حوالدار متین نے دماغ کو حاضر رکھ کر اپنی مارٹر پلاٹون کا ایسا کارگر فائر کرایا کہ دشمن کی یلغار مزید سست ہو گئی۔ برِج ہیڈ کی دونوں پلاٹونوں نے بھی مکمل حاضر دماغی سے دشمن کو مشین گنوں اور رائفلوں وغیرہ پر لے لیا۔

گرد و غبار اس قدر گہرا ہو گیا تھا کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ صبح طلوع ہو چکی ہے۔ اقبال پہلے کی طرح اپنی پلاٹون کے مورچوں میں بھاگتا دوڑتا، نعرے لگاتا اور اپنے جوانوں کے حوصلے بڑھاتا پھر رہا تھا۔

★

اچانک اقبال کو یوں لگا جیسے آسمان پھٹ گیا ہو اور تمام ستارے زمین پر آگرے ہوں۔ اُسے ہر سُو ستاروں کے چمکتے ذرّے دکھائی دیے اور اُس کے کانوں میں توپوں کی گرج اور پھٹتے گولوں کے دھماکے ہونے لگے پھر اُس کی نظروں کے سامنے گُھپ اندھیرا چھانے لگا اور پیشتر اس کے کہ وہ محسوس کرتا کہ کیا ہُوا ہے وہ دھڑام سے گِر پڑا۔

اُس کا نائب صوبیدار کنارے کے ساتھ پوزیشن لیے ہُوئے تھا۔ وہ بھاگ کر اقبال تک پہنچا۔ معاً دو اور بنگالی جوان کُودتے پھلانگتے پہنچے۔ دیکھا، لیفٹیننٹ اقبال کے سر سے خُون کا دھارا پھوٹ رہا تھا۔ ایک طرف کا گال بھی کٹ گیا تھا۔ ایک گولہ بی آر بی کے کنارے پھٹا تھا جس کے ٹکڑے سے اقبال کی کھوپڑی کی ہڈی اور گال کو کاٹ گئے تھے۔ لیفٹیننٹ اقبال بے سُدھ پڑا تھا۔

نائب صُوبیدار اور دو جوان اُسے اُٹھا کر پیچھے لائے۔ سب نے اپنی اپنی فیلڈ پٹی اُس کے سر اور منہ پر کس دی اور اُس کے نیم زندہ جسم کو فیلڈ ایمبولینس کے حوالے کر دیا۔

وہ دوسرے روز ہوش میں آیا۔ اُسے ہر سُو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا جسے وہ رات کا اندھیرا سمجھ رہا تھا۔ اُسے اپنے ارد گرد سرگوشیاں سنائی دیں۔

"میں ہسپتال میں تو نہیں؟"— اقبال نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔

"آرام سے لیٹے رہیے"— ایک نرس نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —" خُدا کا شکر ہے آپ بچ گئے ہیں۔"

اقبال کا سینہ بم کی طرح پھٹا اور وہ پھیپھڑوں کا تمام تر زور لگا کر چلّایا —"نائب صُوبیدار بدالحق! پلاٹون کی کمانڈ لے لو۔ لانچر اوپر لے جاؤ۔ سائیفن کو دیکھو"— اُس نے جسم کو جھٹکا دیا اور بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن زخموں سے درد کی ایسی بے رحم ٹیس اٹھی کہ اُس کے دانت کٹکٹانے لگے۔

"آپ نہیں اُٹھ سکیں گے۔ زخم کُھل جائیں گے"— نرس نے اُسے دونوں کندھوں سے تھام لیا اور رندھیائی ہُوئی آواز میں بولی —" اقبال صاحب! آپ ہسپتال میں ہیں، محاذ پر نہیں۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کر ہوش میں آئیے۔"

"آہ!— اقبال نے کربناک آہ لی اور بے بس ہو کر جسم کو بستر پر پھینک دیا۔ اُس کے جوڑ جوڑ سے درد اُٹھ رہا تھا۔ جسم روئی کی طرح دُھنا ہُوا تھا۔ کئی دنوں اور راتوں کی مسلسل معرکہ آرائی، شب بیداری اور ہیجان نے اعصاب کو چکنا چُور کر دیا تھا۔

اقبال نے درد کی ٹیس سے سنبھل کر پوچھا —"دشمن بی آر بی کے قریب تو نہیں آگیا؟"

"نہیں جی!— نرس نے جواب دیا۔

"بی آر بی بہ رہی ہے نا؟"

"جی ہاں!"

"سائیفن محفوظ ہے نا!"

"ہاں جی!"— نرس نے جواب تو دے دیا لیکن اُسے کچھ علم نہیں تھا کہ اقبال کون سے سائیفن کی پُوچھ رہا ہے اور وہ کس محاذ کا زخمی ہے۔ وہ تو اُسے تسلّیاں دے رہی تھی۔

"بی آر بی بہتی رہے گی"— اقبال نے سکون کی آہ لے کر کہا —"بہتی رہے گی" — وہ بلند آواز سے بولا —"میرے بنگالی غازیوں کی کیا خبر ہے؟"

"وہ لڑ رہے ہیں"— نرس نے کہا —"پاک فوج نے کھیم کرن لے لیا ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔"

"میں بنگال ٹائیگرز کے پاس کب جا سکوں گا؟"

کبھی نہیں، کبھی نہیں۔ اُسے کوئی بتانا نہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی آنکھیں بی آر بی کی آن پر قربان کر آیا ہے اور اُس کا فرض ادا ہو چکا ہے۔ دشمن کے گولے کا ٹکڑا اُسے سر میں ایسی جگہ لگا تھا کہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو گئی تھیں۔

"آپ کے گھر والوں کو اطلاع کر دی ہے"— اُسے ایک مردانہ آواز سنائی دی — "شاید کل تک آپ کا کوئی عزیز آپ کو دیکھنے آجائے گا۔"

"کہاں سے؟" — اقبال نے پوچھا۔

"وزیر آباد سے" — مردانہ آواز نے کہا — "آپ وزیر آباد کے رہنے والے ہیں نا!"

"نہیں" — اقبال نے اکھڑی اور دھیمی آواز میں کہا — "میرا گھر بی آر بی کے کنارے ہے میرے عزیز وہیں لڑ رہے ہیں۔ وزیر آباد میں میرا کوئی نہیں۔ میرے عزیز ایسٹ بنگال رجمنٹ کے جوان ہیں" — بولتے بولتے اس پر غشی طاری ہو گئی اور وہ غشی میں بڑبڑانے لگا — "صوبیدار بدر الحق! آر آر کی ری لوڈنگ میں دیر کیوں لگتی ہے؟"

★

کھاریاں چھاؤنی کے ہسپتال میں لیفٹیننٹ لطیف گہری نیند سو گیا تھا۔ صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ شمع اس کے کمرے سے نکل کر کیپٹن عصمت کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ ابھی وہ برآمدے میں جا ہی رہی تھی کہ اسے کیپٹن عصمت تیزی سے آتی نظر آئی۔

"شمع!" — اس نے کہا — "تم فوراً وزیر آباد پہنچو۔"

"کیوں؟" — شمع نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا — "خیریت تو ہے؟"

"اللہ خیریت ہی رکھے" — عصمت نے جواب دیا — "تمہارے ابا جان نے وزیر آباد تھانے سے کیپٹن طارق سے فون کروایا ہے کہ اقبال زخمی ہو گیا ہے اور وہ لاہور سی ایم ایچ میں ہے۔"

کیپٹن عصمت کے منہ سے الفاظ رک رک کر نکل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر شمع اور زیادہ گھبرا گئی۔

"تم فوراً روانہ ہو جاؤ شمع!" — عصمت نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "زخمی لیفٹیننٹ کے کمرے میں نہ جانا۔"

شمع کیپٹن عصمت کے رہائشی کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔ وہاں سے اس نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور دوڑتی ہوئی نکل گئی۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی اسے بس مل گئی۔

جب اپنے گھر پہنچی تو اس کی ماں اور بہن رو رہی تھیں۔ چوہدری کرامت کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا۔ ہاجرہ گھبرائی گھبرائی سی الگ کھڑی تھی۔ شمع کے گھر والے اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بہت جلدی لاہور پہنچنا چاہتے تھے۔ انہیں لاہور سے اطلاع ملی تھی کہ اقبال زخمی ہو گیا ہے اور لاہور سی۔ ایم۔ ایچ میں ہے۔ محلّے کی چند ایک عورتیں بھی ان کے گھر آ گئی تھیں۔

"اللہ خیر کرے۔"

"خدا اقبال کو لمبی زندگی دے۔"

"اللہ رحم کرے گا۔"

"مت گھبرا چوہدرانی!"

گھر میں یہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"میری بہنو!" — اقبال کی ماں نے ان عورتوں سے کہا — "ہم سب لاہور جا رہے ہیں پیچھے ہاجرہ اکیلی رہ جائے گی۔ رات کو کوئی اس کے پاس آ کر سو جانا۔"

"فکر نہ کر چوہدرانی!" — ایک عورت نے کہا اور اس کی تائید میں کئی آوازیں سنائی دیں — "نہ گھر کی فکر کر نہ ہاجرہ کی...... ہاں ہاں۔ پیچھے کی فکر کیوں کرتی ہے تو!"

وہ سب لاہور چلے گئے اور ہاجرہ اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہ گئی۔ اقبال کے زخمی ہو جانے کا اسے کوئی غم نہ تھا لیکن شام کے وقت اقبال کے متعلق اس نے چند ایسی باتیں سنیں جن سے اس کے تصوّر میں اقبال کا روپ بدلنے لگا۔ لوگ مصدّقہ خبریں سنا رہے تھے کہ اقبال نے جان پر کھیل کر دشمن کا حملہ روکا ہے اور وہ سپاہیوں سے آگے بڑھ کر آرام کے بغیر لڑتا رہا ہے۔

اگر یہ خبریں وزیر آباد کی گلیوں سے جنم لیتیں تو ہاجرہ کبھی یقین نہ کرتی لیکن ایک آدمی لاہور سی ایم۔ ایچ میں اپنے ایک زخمی عزیز کو دیکھنے گیا تھا۔ وہاں سے اقبال کی شجاعت کی تفصیلات سن آیا تھا۔ شجاعت تو بہت بڑی بات ہے۔ اقبال کے متعلق اتنی سی خبر بھی معرکے کی خبر تھی کہ وہ ملک و ملّت کی آن پر لڑ گیا ہے۔ سبھی جانتے تھے کہ وہ کس قماش کا آدمی تھا۔

ہاجرہ کے ذہن میں اقبال کا تصوّر نکھر آیا لیکن اس اقبال سے اسے نفرت تھی۔ اس کے ہونٹوں سے سرگوشی نکل گئی — "آہ، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا......" اس نے آہ بھر کر کہا — "میرے پروردگار۔ اقبال کافروں سے لڑتا ہوا زخمی ہوا ہے تو اسے میری زندگی دے دے۔"

ہاجرہ کے لاشعور سے یہ دعا نکلی تو اسے یوں قرار آ گیا جیسے روح سے کانٹا نکل گیا ہو اور دل پر جو ایک مدّت سے سل رکھی تھی، اتر گئی ہو۔

رات ایک پڑوسن اس کے پاس سونے کے لیے آ گئی۔

"خالہ جی!" — ہاجرہ نے کہا — "مجھے ڈر تو نہیں آتا جب سے جنگ لگی ہے چوری چکاری کا خطرہ بھی نہیں رہا۔ دروازہ بند کر کے سو جاؤں گی۔ تم گھر چلی جاؤ خالہ جی! بچے پریشان ہوں گے۔"

پڑوسن نے اصرار کیا لیکن ہاجرہ نہ مانی اور پڑوسن چلی گئی۔

رات چاندنی تھی۔ ہاجرہ نے صحن میں چارپائی بچھائی تو اسے پُرلطف اور پُروقار سا احساس ہوا کہ گھر والے سارا گھر اس کے حوالے کر گئے ہیں۔ اپنی اہمیت اور ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے وہ تمام کمروں میں گھومی، ٹرنکوں کے تالے دیکھے، کھڑکیوں اور دروازوں کی چٹخنیاں دیکھیں اور ریڈیو برآمدے میں رکھ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔

★

جنرل چوہدری اب دلّی ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا اپنے اٹیک پلان کا ماتم کر رہا تھا اور شکست کا الزام اپنے سیکٹر کمانڈروں کے سر تھوپ کر اپنی نوکری کا تحفّظ کر رہا تھا۔ چونڈہ کے میدان میں اس کی سولہویں کیولری کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ جلے ہوئے چند ایک ٹینکوں پر سیاہ ہاتھی

ے جھلسے ہوئے نشان نظر آ رہے تھے۔ اُس نے باٹا پور، برکی اور بیدیاں سے منہ کی کھا
اور کھیم کرن ہار کر اپنے نمبر ۲۶، انفنٹری، نمبر ۶ ماؤنٹین اور نمبر ۱۴، انفنٹری ڈویژنوں کے
ش بددش نمبر ۱، آرمرڈ ڈویژن جس میں نمبر ۶۲ کیولری اور نمبر ۲ لانسرز اضافی ٹینک یونٹیں تھیں
الکوٹ کی راہ سے پاکستان میں داخل ہونے کے لیے بڑھا دیئے تھے لیکن چونڈہ کا
نیس میل وسیع میدان بھی جنرل چوہدری کے پلان کی شمشان بھومی بن گیا تھا۔ اُسے انڈین
فورس پر بھروسہ تھا مگر پاک فضائیہ نے بھارتی طیاروں کو اُڑنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا
ر وہ فضا کی دہشت بن گئے تھے۔ اُدھر پاک بحریہ دوارکا کو تباہ کر کے کھلے سمندروں میں
ین نیوی کو للکار رہی تھی لیکن انڈین نیوی جانے کہاں دبک گئی تھی!

صرف جنرل چوہدری ہی بوکھلایا ہوا نہیں تھا ... مگر جنرل گپتا تھا ... جالندھر کے ہیڈکوارٹر میں پاگلوں کی طرح پاکستان میں بکھرے
ے جاسوسوں کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اُس نے جاسوسی اور سابوتاژ کرنے والوں کو طیاروں
سے بھی پاکستان میں اتار دیا تھا مگر وہ ابھی تک پاکستان پر کاری زمین دوز ضرب لگا کر
ڈین آرمی کا کام آسان کر دینے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔

جنرل چوہدری سر پکڑے دِلّی ہیڈکوارٹر میں بیٹھا تھا اور ہاجرہ سرا اونچا کیے صحن میں چارپائی
بچھائے ریڈیو پر رزمیہ ترانے سن رہی تھی۔ اُس کے دل و دماغ پر ہیجان سا طاری ہوتا چلا گیا۔
ں میں بے اختیار آئی کہ کسی کو پاس بٹھا کر کھل کر باتیں کرے۔ وہ اٹھی اور خراماں خراماں باہر والے
دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔

دو چار منٹ بعد اُسے ایک آدمی گلی میں آتا دکھائی دیا۔ وہ قریب آیا تو اُس نے اس آدمی
پہچان لیا۔ وہ صوبیدار اکبر علی تھا۔ ہاجرہ نے منہ پھیر لیا اور دروازے کی طرف مُڑی۔
"ہاجو!" — اکبر علی نے اُس کے پاس رُک کر کہا — "میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے
معلوم ہے تم گھر میں اکیلی ہو"
ہاجرہ اکبر علی سے کبھی ڈری نہیں تھی لیکن اُس رات ڈر گئی کیونکہ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اُس
کی زبان گنگ ہو گئی۔
"میرے قریب آؤ گے تو میں شور مچا دوں گی" — ہاجرہ اکبر علی کو چپ چاپ گھورتے
دیکھ کر یک لخت بولی۔
"باپ بیٹی کے گھر آئے اور بیٹی شور مچا دے؟" — اکبر علی نے ایسی سنجیدگی اور متانت
سے کہا جو ہاجرہ نے اُس کے لہجے میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اکبر علی نے آہ لے کر کہا — "ہاجو!
وطن کی عزت پر باؤلے کتے ٹوٹ پڑے ہیں اور تم اکبر علی کو اتنا بے غیرت سمجھتی ہو کہ وہ تمہاری
عزت پر ہاتھ ڈالے گا.... میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے"
بات اُس کے دل سے نکلی تھی، اثر کر گئی۔
"پھر میرے پاس کیوں آئے ہو؟" — ہاجرہ نے بُجھے بُجھے اور صُلح جُو لہجے میں کہا —
"جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ سن لو"

"جانتی ہو ہاجرہ سرحدوں پر کیا ہو رہا ہے؟" — اکبر علی نے کہا — "جانتی ہو ہاجو وہاں کیا ہُوا
ہے؟ خدا کے رسولؐ اور قرآن کے ازلی دشمن ہماری بہو بیٹیوں کو رات کے اندھیرے میں
اٹھا لے گئے ہیں، بچوں کو ماؤں کی گودیوں سے نوچ کر کاٹ گئے ہیں، جوانوں کو سوتے میں ذبح
کر گئے ہیں۔ پاک فوج کے جوان اپنی ماؤں، بہنوں اور بچّوں سے بخشش بخشوا کر محاذ پر خون بہا رہے
ہیں.... اپنا بھی دشمن کا بھی.... ماؤں کے لاڈلے بیٹے وطن کی عصمت پر شہید ہو رہے ہیں،
ٹانگیں اور بازو کٹوا کر عمر بھر کے لیے اپاہج ہو رہے ہیں.... کس لیے ہاجو؟.... جانتی ہو کس
کی خاطر؟.... تمہاری آبرو کی خاطر، تم جیسی کنواریوں کی عصمت کے نام پر ہاجو!.... وہ تمہارے
بھائی ہیں، تمہارے باپ ہیں...."
کچھ تو باتیں ایسی تھیں، کچھ اکبر علی کا لب و لہجہ ایسا کہ ہاجو کا سینہ لرزنے لگا۔ اُس کے ہونٹ
کپکپائے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ اُسے یُوں لگا جیسے وہ اکبر علی کوئی اور ہے جس سے اُسے نفرت
ہے اور یہ اکبر علی کوئی اور ہے جس سے وہ کبھی نفرت نہ کر سکے گی۔
"اندر آجاؤ نا" — ہاجرہ کے منہ سے بے اختیار نکلا — "بیٹھ کے بات کرو"
"ہاجرہ!" — اکبر علی نے صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھتے ہُوئے کہا — "مجھے بخش دینا۔ میں تمہیں
پریشان کرتا رہتا تھا لیکن ہاجرہ! وہ وقت کچھ اور تھا...."
ہاجرہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اکبر علی نے اُسے چارپائی پر بٹھانا چاہا لیکن مصلحتاً چپ رہا۔
"ہاجو بیٹی" — اکبر علی نے کہا — "قوم کا بچّہ بچّہ اپنے فوجی جوانوں پر قربان ہُوا جا رہا ہے۔
لوگ اپنے زیور بنکوں میں جمع کرا رہے ہیں۔ قوم ایک اور خون ایک ہو گیا ہے۔ خدا نے سب
کا راستہ اور سب کی منزل ایک کر دی ہے!.... ہاجو! بڑے بڑے خوبصورت جوان پاکستان
پر قربان ہو گئے ہیں.... اقبال جیسا لاڈلا اور نازوں پلا بیٹا ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا ہے"
"کیا کہا؟" — ہاجرہ نے تڑپ کر پوچھا۔
"اقبال اندھا ہو گیا ہے!" — اکبر علی نے کہا — "شاید پاگل بھی.... لیکن کسی سے بات
نہ کرنا۔ اُس کے ماں باپ اُسے دیکھنے لاہور چلے گئے ہیں.... ڈاکٹر شاید انہیں ابھی بتائیں
گے نہیں۔ مجھے اقبال کی اصلی حالت کا پتہ چل چکا ہے.... ہاجو! ان گلیوں میں شہزادوں کی طرح
گھومنے پھرنے والا عیاش اقبال تم جیسی کنواریوں کی آبرو پر قربان ہو گیا ہے"
اکبر علی نے اتنی باتیں اور اس قسم کی جذباتی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔ اٹھارہ برس گزرے
اُس کے خاندان کے اٹھارہ مرد، عورتیں اور بچے اُس کے سامنے ٹرک میں شہید ہو گئے تھے
تو بھی اُس نے کوئی جذباتی بات نہیں کی تھی۔ اُس نے یہ ہولناک حادثہ اپنے سینے پر اور پاکستان
کی تاریخ کے سینے پر بھی لکھ ڈالا تھا۔ وہ پاک فوج کا غازی تھا۔ غازی باتیں نہیں کیا کرتے۔ جن
سپاہیوں نے اُس کے ہاتھوں ٹریننگ لی تھی انہیں وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا — "حرکت زیادہ بات
کم" — لیکن ہاجرہ سپاہی نہیں تھی۔ وہ جو بات ہاجرہ کے دل پر نقش کر کے اُس کے دل کو
مٹھی میں لینا چاہتا تھا وہ ہاجرہ کے جذبات میں زلزلے بپا کیے بغیر نہیں سمجھائی

جاسکتی تھی۔

"محاذوں پر خونریز جنگ ہو رہی ہے" — اکبر علی نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا — ہاجرہ! خدا اور رسولؐ کے عاشق جان پر کھیل رہے ہیں۔ ہندوستانی کافر زخمی ہو کر گرتے ہیں اور تڑپ تڑپ کر مرتے ہیں لیکن پاک فوج کے مجاہد گرتے ہیں تو یا علیؓ اور اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اٹھتے ہیں اور بجلی بن بن کر کافروں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ زخمی ہوتے ہیں تو تڑپتے نہیں، نعرے لگاتے شہید ہو جاتے ہیں۔"

"تم بھی جنگ میں گئے تھے نا!" — ہاجرہ نے دبی دبی آواز میں کہا جس میں طنز نہیں تھی۔

"میں اب بھی جنگ میں ہوں" — اکبر علی نے کہا — "میں اُس دشمن کے خلاف جنگ لڑ رہا ہوں جو کسی کو نظر نہیں آتا مگر توپوں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے زیادہ خوف ناک ہے۔ راہوالی، گھونکل اور وزیر آباد کے علاقے میں اسی نے بم گرائے ہیں۔ ہو سکتا ہے چناب کا پُل کسی روز وہ ہوائی جہازوں کے بغیر ہی تباہ کر دے۔"

"کون ہے وہ؟" — ہاجرہ نے پوچھا۔

"افضال" — اکبر علی نے کہا۔

"افضال؟" — ہاجرہ نے چونک کر کہا — "وہ تو ...."

"وہ ہندوستان کا جاسوس ہے" — اکبر علی نے دو ٹوک کہا۔

"نہیں —" ہاجرہ جیسے چونک کر بیدار ہو گئی ہو۔ کہنے لگی — "وہ سات پانیوں میں دُھلا ہوا پرہیزگار آدمی ہے۔ جامع مسجد کے خطیب سے قرآن پڑھتا ہے ...." وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اکبر علی نے جنگ اور پاک فوج کی شجاعت کی باتیں سنا کر اُس پر جو طلسم طاری کیا تھا، وہ یک لخت ڈھل گیا۔ اُس نے مان لیا تھا کہ اقبال جیسا عیاش آدمی وطن پر قربان ہو گیا ہے۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ اکبر علی بھی اُسے وطن کی خاطر بیٹی سمجھ رہا ہے لیکن وہ کسی قیمت پر ماننے کو تیار نہ تھی کہ افضال ہندوستان کا جاسوس ہے۔

وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ہوائی حملے کے سائرن چاندنی رات کو جھنجھوڑنے لگے۔ اکبر علی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہوائی حملے کی صورت میں کس جگہ پناہ لی جائے لیکن اُس نے صحن ہی میں بیٹھے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اتنے میں دو ہوائی جہازوں کی بھیانک گونج سنائی دی جو سر کے اوپر سے گزرتے توپ کے گولوں کی طرح پلک جھپکتے گزر گئے۔ یہ انڈین ایئر فورس کے لڑاکا بمبار طیارے تھے جو نیچی پرواز سے وزیر آباد کے اوپر سے گزر گئے تھے۔

"یہ کس کے جہاز ہیں؟" — ہاجرہ نے پوچھا۔

اکبر علی یوں خلا میں گھور رہا تھا جیسے اُسے یاد ہی نہ رہا ہو کہ ہاجرہ اُس کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔

"پپ - پی پی - پپ - تارگیٹ - تارگیٹ - وَن، اوکلاک" — کہیں سے دھیمی دھیمی سی آواز آئی جس طرح خراب ٹیلی فون یا ہیڈ فون سے سنائی دیا کرتی ہے۔

"یہ آواز کہاں سے آتی ہے؟" — ہاجرہ نے پوچھا۔

"میری جیب سے" — اکبر علی نے کہا — "ذرا ٹھہرو" — اُس نے پھر کان کھڑے کر لیے جیسے کسی غیبی آواز کو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ طیاروں کی آوازیں دور نکل گئی تھیں۔

"چیک .... تارگیٹ .... ہنڈرڈ ایٹی (۱۸۰) ڈگری ....' اکبر علی کی جیب سے آواز پھر سنائی دی۔

"دشمن کے ہوائی جہاز واپس آئیں گے" — اکبر علی نے ہاجرہ کو بتایا — "مجھے یقین ہے یہ چناب کے پُل کو تباہ کرنے آتے ہیں۔ وہ آگے نکل گئے تھے لیکن یہاں کوئی جاسوس ان کی رہنمائی کر رہا ہے اور انہیں بتا رہا ہے کہ تم آگے نکل گئے ہو۔ واپس آؤ۔"

"ٹین، اوکلاک ...." آواز سنائی دی۔

یک لخت چناب کے پُل کے اردگرد لگی ہوئی، پاک فوج کی طیارہ شکن توپوں اور مشین گنوں نے قیامت بپا کر دی۔ آسمان پر گولے پھٹنے لگے اور مشین گنوں کے ٹریسر ایمونیشن نے فضا میں آگ کی چمکتی لکیروں کا جال تن دیا۔ ہاجرہ سہم کر اکبر علی کے قریب سرک گئی۔ اُس کے لیے یہ سب بڑا ہی پُراسرار تھا۔

اکبر علی نے طنز آلود قہقہہ لگایا۔ اتنے میں دُور، خاصی دُور چار دھماکے سنائی دیئے اور طیاروں کے زناٹے ایک دوسرے کے پیچھے وزیر آباد سے پرے ہی پرے گزر گئے۔

"بگلے بھارتی!" — اکبر علی نے طنزیہ کہا — "پاکستان کے پُلوں کو تباہ کرنا اتنا آسان نہیں .... ہاجرہ! بم پُل سے بہت دُور گرے ہیں۔ دھماکوں کی آواز بتاتی ہے کہ بم دریا میں بھی نہیں گرے۔ بہت دُور پھٹے ہیں .... بہت دُور" — اور وہ فاتحانہ ہنسی ہنس پڑا۔

"یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی؟" — ہاجرہ نے پوچھا — "یہ آواز کس کی تھی؟"

"یہ میری جیب میں ایک آلہ ہے جو دشمنوں کی آوازوں کو سن رہا ہے۔ میں ان ہی جاسوسوں کو پکڑنے کے لیے وزیر آباد میں واپس آگیا ہوں" — آل کلیئر کا سائرن بجنے لگا۔ اکبر علی کہہ رہا تھا — "میں جھک نہیں مار رہا ہاجرہ! ذرا تصور کرو کہ چناب کے دونوں پُل، سڑک کا بھی اور ریل کا بھی، تباہ ہو جائیں تو ہماری فوجوں کو نہ گولہ بارود پہنچ سکے گا نہ راشن نہ پٹرول۔ پھر فوجوں کا کیا حشر ہو گا! پھر پاکستان کا کیا حشر ہو گا!"

اُس نے ہاجرہ کو تفصیلاً سمجھایا کہ فوجوں کو راشن، گولہ بارود اور ضروری سامان نہ پہنچا تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔

ہاجرہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی — "تم جاسوسوں کو پکڑتے کیوں نہیں؟" — ذرا رک کے انوکھے سے لہجے میں کہنے لگی — "مجھے کوئی جاسوس دکھاؤ، میں چھری سے اُس کا کلیجہ نکال دوں گی۔"

"تمہیں ایک جاسوس بتا تو دیا ہے!" — اکبر علی نے مسکرا کر کہا — "افضال۔"

"نہیں" — ہاجرہ نے ملتجی لہجے میں کہا — "وہ جاسوس نہیں ہو سکتا۔ وہ ہندو تو نہیں۔ وہ نماز پڑھتا ہے۔"

”وہ پاکستانی بھی نہیں“ ــــ اکبر علی نے کہا ــــ ”پھر بھی ہاجرہ! ہوسکتا ہے وہ جاسوس نہ ہو لیکن تم اُس کے پاس جاتی رہو اور اُس پر نظر رکھو .... اور یاد رکھو۔ ابھی ابھی تم نے میری جیب سے جس طرح کی آوازیں سنی ہیں اگر اس طرح کی آواز افضال کے کمرے میں سنو تو اُسی وقت مجھے خبر کر دو۔“

ہاجرہ خلا میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں وہ تمہیں بہت اچھا لگتا ہے“ ــــ اکبر علی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ ”میں تمہیں اُس سے ملنے سے کبھی نہ روکوں گا مگر ہاجرہ! چاند تارے والے سبز جھنڈے کے مقابلے میں کچھ بھی اچھا نہیں۔ اگر تم نے اُس کا ساتھ دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم بے غیرت لڑکی ہو جسے پاکستان کی کسی لڑکی کی آبرو کا ذرہ بھر خیال نہیں۔“

ہاجرہ کا سینہ لرز اٹھا۔ وہ بے غیرت نہیں کہلانا چاہتی تھی۔

”میں سمجھوں گا کہ تم پاکستانی نہیں“ ــــ اکبر علی نے اُسے کہہ دیا ــــ ”تم ہندوستانی ہو .... تم ہندو ہو۔“

ہاجرہ نے تڑپ کر دونوں ہاتھ اکبر علی کے گھٹنے پر رکھ دیئے اور رندھیائی ہوئی آواز میں بولی ــــ ”یوں نہ کہو اکبر جی! میں پاکستانی ہوں۔ مجھے ہندوستانی نہ کہو“ ــــ اُس کے آنسو بہہ نکلے ــــ ”مجھے ہندو نہ کہو۔ ہندو بہت بُرے ہوتے ہیں۔ ہندوؤں نے کشمیر میں بچوں کو مار ڈالا تھا ہم سب کو انہوں نے وہاں سے نکال دیا تھا .... نہیں اکبر جی! مجھے ہندو نہ کہو۔“

اکبر علی نے ہاجرہ کا یہ ردِّ عمل دیکھا تو اُسے خوشی محسوس ہوئی۔ ہاجرہ اُسے بڑی ہی پیاری لگی۔ اس پیار میں اب آوارگی نہیں احترام کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ اٹھا اور ہاجرہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اکیلے ڈرو گی تو نہیں؟“ ــــ اُس نے ہاجرہ سے پوچھا۔

”نہیں“ ــــ ہاجرہ نے دکھیاری سی مسکراہٹ سے جواب دیا ــــ ”میں اکیلی دنیا میں آئی تھی، اکیلی جی رہی ہوں۔“

اکبر علی خراماں خراماں باہر نکل گیا۔



ہاجرہ وہیں زمین پر بیٹھی خیالوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔ اُس کے سامنے تین آدمی آ گئے ــــ اکبر علی، اقبال اور افضال ــــ مگر یہ تین آدمی چھ ہو گئے ــــ ایک وہ اکبر علی جو اُس کے حسن و جوانی سے دل بہلانا چاہتا تھا اور اُسے زیور کا جھانسہ دے کر شادی کے لیے اکساتا رہتا تھا اور ایک یہ اکبر علی جو ابھی ابھی باپ کے رُوپ میں اُس کے پاس آیا تھا اور جس کی ولولہ انگیز باتوں نے اُس کی ذات میں مقدس اور بڑا ہی پیارا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔

ایک وہ اقبال جو خود بھی بے حیا تھا اور اُسے بھی بے حیا ہو جانے کے لیے پانچ پانچ اور دس دس کے نوٹ دکھاتا رہتا تھا، اور ایک یہ اقبال جو اپنی جوانی اور اپنی اتنی خوبصورت آنکھیں پاکستان کی آبرو پر قربان کر آیا تھا۔

ایک وہ افضال جس نے اُسے کھویا ہُوا پیار دے کر اُس کے دُکھے ہوتے دل کو سہلایا تھا۔

وہ افضال اُس کی پناہ تھا مگر ایک یہ افضال جو پاکستان کے دشمنوں کا جاسوس تھا۔

وہ تینوں کی شکلیں پہچانتی تھی مگر روپ بہروپ کے چھلاووں نے تینوں کی صورتیں مسخ کر ڈالیں، چہروں کے خطوط گڈمڈ ہو گئے۔ اُسے اِن تینوں کے ایک رُخ سے محبت اور دوسرے رُخ سے نفرت تھی۔ اُس کے ذہن میں محبت اور نفرت، پاک فوج اور انڈین آرمی کی طرح آمنے سامنے آکر معرکہ آرا ہو گئیں۔

ہاجرہ نے اپنے متعلق سوچا تو اُسے اپنے بھی دو رُوپ نظر آئے۔ ایک وہ ہاجرہ جس کے پیار اور ارمانوں کو راولپنڈی کی سردی نے برف کا تودہ بنا کر مٹی میں دبا دیا تھا اور جسے مردوں ہی سے نہیں اس زندگی ہی سے نفرت ہو گئی تھی ــــ اور ایک یہ ہاجرہ جسے جنگ اور اکبر علی کی باتوں نے اس قدر بیدار کر دیا تھا کہ اسے گلیوں کے آوارہ لونڈوں سے صرف اس لیے پیار ہو گیا تھا کہ وہ پاکستانی لڑکے تھے۔ اس ہاجرہ سے اس کے وطن کا جھنڈا افضال کی محبت کی قربانی مانگ رہا تھا۔

چھ ستمبر کی صبح سے وزیر آباد میں جو انقلاب آ گیا تھا اس کی ایک ایک تفصیل ہاجرہ کے سامنے آ گئی۔ ہوائی حملے کے بعد رات پھر خاموش ہو گئی تھی۔ رات کے اس ہُو حق سناٹے میں ہاجرہ کو دُور، سیالکوٹ کے محاذ سے پاک آرٹلری کی دو سَو پونڈر توپوں کے دھماکے دھیمے دھیمے سنائی دے رہے تھے۔ یہ آوازیں اُس نے پہلے بھی سنی تھیں لیکن کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ آج کی رات یہ دبی دبی سی دُور کی دھم دھم اُس کے ذہن میں بلند ہوتی چلی گئی اور وہ اِن آوازوں کو کان لگا کر سننے لگی۔ اُس نے سنا تھا کہ سیالکوٹ کے محاذ پر دشمن نے جنگوں کی تاریخ کا سب سے بڑا حملہ کیا ہے۔

اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے دل کی دھڑکن توپوں کی دھم، دھم کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی ہو۔ اُسے یہ آوازیں اچھی لگنے لگیں۔ کرتے کرتے اُس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے وہ خود توپیں داغ رہی ہو یا جیسے یہ توپیں اُس کے سینے میں فائر ہو رہی ہوں۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ سیالکوٹ کے محاذ کی ہیوی آرٹلری کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں اور ہاجرہ کا ذہن بیدار ہوتا جا رہا تھا۔

”افضال جاسوس ہے؟“ ــــ ہاجرہ کے بیدار ہوتے ہوتے ذہن میں بڑا ہی زوردار دھماکہ ہُوا۔

”نہیں“ ــــ اُس نے اپنے آپ کو جواب دیا۔

صوبیدار اکبر علی کی باتیں اُس کے ارد گرد بھنبھنانے لگیں۔ وہ اپنے سر پر اکبر علی کا ہاتھ محسوس کرنے لگی۔ کبھی وہ بے چین ہو جاتی کبھی اُسے سکون سا محسوس ہوتا۔ جب اُسے خیال آتا کہ اکبر علی نے اُسے کہا ہے کہ افضال کو پکڑنا ہے تو وہ اندر ہی اندر تڑپ اُٹھتی۔

”نہیں ہاجرہ!“ ــــ اُسے اپنی آواز سنائی دیتی ــــ ”تم افضال کو پکڑوا نہیں سکو گی۔ اُس کے سامنے جاؤ گی تو تم پر اُس کا طلسم طاری ہو جائے گا۔“

وہ ان پڑھ اور بہت ہی سادہ فطرت کی لڑکی تھی۔ وہ صرف پیار اور پھٹکار کو، محبت اور نفرت کو پہچانتی تھی۔ جاسوس کا لفظ تو اُس نے اب سُنا تھا۔ اُسے کیا خبر تھی کسی جاسوس کی جاسوسی کس طرح کی جاتی ہے۔ صوبیدار اکبر علی نے اُس کے جذبات میں تو ہلچل پیدا کر دی تھی لیکن عمل کے

لئے جس فہم و فراست کی ضرورت تھی وہ ہاجرہ میں نہیں تھی۔

صوبیدار اکبر علی نے ہاجرہ جیسی لڑکی کو اعتماد میں لے کر غلطی کی تھی۔ وہ انٹیلی جنس کا یا سیکرٹ سروس کا صوبیدار تھا۔ افضال کو پکڑنے کے لئے اور اُس کے رِنگ کو زمین کے نیچے سے باہر لانے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیئے تھا، کسی اور ذریعے کا سہارا لینا چاہیئے تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ ہاجرہ نے افضال کو ایک بڑے خوبصورت آسیب کی طرح اپنے اُوپر غالب کر رکھا ہے۔

"حوالدار منین!" — لیفٹیننٹ اقبال نے سی۔ ایم۔ ایچ لاہور کے ایک کمرے میں بَیڈ پر لیٹے لیٹے کہا — "گھبرانا مت۔ ہوش ٹھکانے رکھ کر فائر آرڈر دینا.... زخمی ہو تو ہم کو پکارو۔ ہم آئیں گے۔ شہید ہو جاتے ہو تو پرواہ نہیں.... ہم آئیں گے" — وہ دھیمی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ اچانک اُس کی آواز بلند ہوگئی — "ہم آئیں گے.... گھبرانا نہیں.... میں آؤں گا.... دشمن" — اُس کی آواز اور زیادہ بلند ہوگئی — "پاکستان کا دشمن.... انڈیا.... باؤلا ہندوستان" — اقبال کے دانت پِس رہے تھے۔ اُس کا سَر اور آدھا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہُوا تھا۔ وہ چپ ہوگیا۔

نرس خاموشی سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اقبال کی ماں، اُس کا باپ، شمع اور اُس کی چھوٹی بہن اقبال کے اِرد گرد کھڑی تھیں۔ سب کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ سب جب اقبال کے کمرے میں داخل ہوتے تھے تو وہاں وہی منظر بن گیا تھا جو لیفٹیننٹ لطیف کے کمرے میں اُس وقت بنا تھا جب اُس کے ماں باپ اور عزیز پہلی بار اُس کے کمرے میں داخل ہوتے اور اُسے زخمی حالت میں دیکھا تھا۔

شہیدوں کی اور محاذ سے زخمی ہو کر آنے والوں کی مائیں کروڑوں، قد کاٹھ، شکل و صورت اور عمر کے لحاظ سے ایک دوسری سے مختلف ہوتی ہیں لیکن آہیں ایک جیسی، آنسو ایک جیسے، خاموش فریادیں ایک جیسی اور اُن کے جذبات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اقبال کی ماں اُس پر اُسی طرح گری تھی جس طرح لطیف کی ماں لطیف پر گری تھی۔ اقبال کی ماں کے آنسو لطیف کی ماں جیسے تھے۔ اُن کی سسکیاں اور دلوں کی دھڑکنیں ایک جیسی تھیں۔

لطیف نے اپنی ماں کو نہیں پہچانا تھا۔ اقبال نے بھی اپنی ماں کو نہیں پہچانا۔ فرق صرف یہ تھا کہ لطیف کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ دیکھ سکتا تھا اور آنکھیں اقبال کی بھی کھلی تھیں مگر وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے گال پر جس پر پٹیاں نہیں بندھی ہُوئی تھیں، اپنی ماں کے ہونٹوں کا لمس محسوس ہی نہیں کر رہا تھا۔ ماں کے آنسو اُس کے سر اور آدھے چہرے پر لپٹی ہُوئی پٹیوں میں جذب ہو رہے تھے۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" — اقبال کی ماں نے نرس سے پوچھا جو اقبال کے بیڈ کارڈ پر کچھ لکھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہو جائیں گے" — نرس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"لیکن یہ جو باتیں کر رہا ہے" — ماں نے کہا — "یہ تو ایسے ہے جیسے تیز بخار سر کو چڑھ جاتا ہے"

"یہ بخار نہیں خالہ جان!" — نرس نے کہا — "محاذ سے جو زخمی آتا ہے اُس کی ذہنی حالت

ایسی ہی ہوتی ہے۔ وارڈوں میں جا کر دیکھیں۔ آپ سمجھیں گے جیسے آپ محاذ پر آگئی ہوں.... آپ گھبرائیں نہیں۔ اِن کی ذہنی کیفیت ٹھیک ہو جائے تو زخم جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ابھی ان کا ذہن محاذ پر لڑ رہا ہے۔"

"کیا ہم رات کو اس کمرے میں رہ سکیں گے؟"۔۔۔ اقبال کے باپ نے نرس سے پوچھا اور اُسے بتایا۔۔۔ "ہم وزیر آباد سے آئے ہیں۔"

"سب نہیں"۔۔۔ نرس نے جواب دیا۔۔۔ "آپ میں سے کوئی ایک رہ سکتا ہے.... آپ ان کی فکر نہ کریں۔ ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری ایسے ہی ہوتی ہے جیسے ماں اپنے بچے کی کرتی ہے۔ دن کو آپ سب آسکتے ہیں۔"

اقبال کے باپ کے قریبی رشتہ دار لاہور میں رہتے تھے۔ رات کو وہ اُن کے ہاں چلے گئے۔

★

صبح ابھی نیم تاریک تھی جب وہ سی۔ ایم۔ ایچ میں پہنچ گئے۔ پورا ہسپتال جاگ رہا تھا۔ وارڈوں میں نعرے گرج رہے تھے۔ ڈاکٹروں، نرسوں اور ہسپتال کے دیگر سٹاف کی بھاگ دوڑ ایسی ہی تھی جیسی اقبال کے عزیز گذشتہ روز دیکھ گئے تھے۔ وہ لیفٹیننٹ اقبال کے کمرے میں گئے تو وہاں ایک نرسنگ اردلی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور اقبال کی آنکھیں بند تھیں۔ ان سب کو دیکھ کر نرسنگ اردلی اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اٹھا اور سب کو باہر لے گیا۔

"صاحب سوئے ہوئے ہیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "انہیں جگانا نہیں۔"

"اب کیا حال ہے؟"۔۔۔ اقبال کے باپ نے پوچھا۔۔۔ "میرا مطلب ہے، ذہنی حالت....؟"

"نارمل ہو گئی ہے"۔۔۔ نرسنگ اردلی نے کہا۔۔۔ "رات تقریباً دو بجے انہوں نے پوچھا تھا کہ میرے گھر سے کوئی نہیں آیا؟.... آپ برآمدے میں بیٹھیں۔ ان کے جاگنے پر میں آپ کو بلا لوں گا۔"

برآمدے میں ان کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہاں کوئی بنچ خالی نہیں تھا۔ برآمدے کے فرش پر زخمیوں کے لواحقین نے بستر ڈال رکھے تھے۔ اقبال کے ماں باپ اور بہنیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔ ان کی رات بے چینی میں گزری تھی۔

رات ہاجرہ نے بھی بے چینی میں گزاری تھی۔ یہ رات اُس کی تمام راتوں سے زیادہ لمبی تھی۔ رات کو وہ صوبیدار اکبر علی کی باتوں سے متاثر ہو گئی تھی لیکن صبح طلوع ہوتے ہی اُسے ایسے لگا جیسے اکبر علی اُسے اندھیرے میں پھینک گیا تھا اور اب اُس کا پھیلایا ہوا اندھیرا چھٹ گیا ہو۔

"افضال جاسوس نہیں ہو سکتا"۔۔۔ تیر کی طرح یہ خیال آیا اور اُس کے ذہن میں اُتر گیا۔

"مگر اکبر علی نے مجھے بیٹی کہا تھا"۔۔۔ اُسے دوسرا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے ذہن میں اکبر علی کی باتیں یوں گونجنے لگیں جیسے وہ ابھی تک اُس کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔

ہاجرہ ایک اذیت میں مبتلا تھی۔ اکبر علی اگر اُس کے پاس جنگ سے پہلے والے روپ میں آتا تو ہاجرہ کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ وہ اُس کی باتوں کو یوں نظرانداز کر دیتی جیسے منہ پر بیٹھی مکھی کو اُڑا دیا جاتا ہے لیکن صوبیدار اکبر علی کے بولنے کے انداز میں ایک تپش تھی جو اُس کی روح کے الاؤ کا پتہ دیتی تھی۔ ہاجرہ اس تپش کو محسوس کر رہی تھی۔

ہاجرہ باورچی خانے میں گئی۔ اُسے اب ایسی کوئی جلدی نہیں تھی کہ گھر والوں کو ناشتہ دینا ہے۔ آج اُسے آوازیں دینے والا، حکم دینے والا اور یہ کہنے والا کوئی نہ تھا کہ اسے چھوڑو پہلے وہ کرو۔ اُس نے اپنے لیے چائے بنائی۔ رات کی ایک روٹی پڑی تھی۔ وہ گرم کیے بغیر چائے کے ساتھ کھائی اور باہر نکل گئی۔

★

وہ افضال سے ملنے جا رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ جھینپ گئی جیسے وہ کسی اجنبی مرد سے ملنے جا رہی ہو۔ دوسرے ہی لمحے افضال کا سراپا اور چہرہ اُس کے سامنے آگیا۔ یہ چہرہ کھلا ہوا تھا اور اس چہرے پر پیار کی رونق تھی۔ وہ تیز چل پڑی جیسے کسی نے اُسے دھکا دیا ہو۔ اس دھکے سے اُس کے دل پر جو بوجھ تھا وہ گر پڑا۔ اعصاب جو کھچے تنے ہوئے تھے ٹھکانے پر آگئے اور اکبر علی کی باتوں کی گونج خاموش ہو گئی۔

ہاجرہ کے آگے آگے پانچ چھ سال عمر کا ایک بچہ ہاتھ میں برتن اٹھائے دودھ یا دہی لینے جا رہا تھا۔ اوپر سے پاک فضائیہ کے تین سیبر طیارے ہیبت ناک زناٹے سے بڑی کم بلندی پر اُڑتے گزر گئے۔ لاہور سیکٹر میں دشمن نے مزید کمک بھیج دی اور توپ خانے میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ان سینکڑوں چھوٹی بڑی توپوں کو خاموش کرنے یا ان کی گولا باری کی شدت کو قابو میں رکھنے کے لیے پاک فضائیہ کے شہبازوں کو بلایا جاتا تھا۔ ان کی پروازیں صبح کی پہلی روشنی کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی تھیں۔

ان لڑاکا بمبار طیاروں میں بیٹھے ہوئے اور جان کی بازی لگا کر برستی آگ میں اور زمین سے اُٹھتے ہوئے گرد و غبار میں غوطے میں چلے جانے والے گوشت پوست کے انسان تھے۔ انہیں فائٹر پائلٹ اور اُردو میں ہواباز کہا جاتا تھا لیکن جنگ کے پہلے چند دنوں میں ہی اُنہوں نے دشمن سے منوا لیا تھا کہ وہ ہواباز نہیں شہباز ہیں۔ اُنہوں نے پاکستان اور بھارت کی فضاؤں میں اپنی حکمرانی قائم کر لی تھی، حالانکہ دشمن کے جدید اور آواز کی رفتار پر اُڑنے والے لڑاکا بمبار طیاروں کے مقابلے میں پاک فضائیہ کے شاہبازوں کے پاس پرانی طرز کے سُست رفتار طیارے تھے جن کی فائر پاور بھی کم تھی۔ ان کی شہبازی اور ان کے سامنے دشمن کی بے بسی دیکھ کر کسی مبصر نے کہا تھا کہ طیارہ نہیں طیارے میں بیٹھا ہوا ہواباز لڑا کرتا ہے۔

وہ انہی شہبازوں کے طیارے تھے جو وزیر آباد کے اوپر سے زناٹے سے گزر گئے۔ ہاجرہ کے آگے پانچ چھ سال عمر کا جو بچہ ہاتھ میں برتن اٹھائے جا رہا تھا، بم کی طرح پھٹا۔۔۔ "علی حیدرؓ.... پاکستان زندہ باد!"

اس ننھے مُنّے نعرے سے ہاجرہ کا دل دہل گیا جیسے ساری قوم اور پاک فوج نے مل کر "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا ہو۔ یہ نعرہ ہاجرہ کی روح تک اُتر گیا اور اُسے آوازیں سنائی دینے لگیں:

"پاک فوج کے مجاہد گرتے ہیں تو یا علیؓ اور اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اُٹھتے ہیں"۔

"وہ زخمی ہوتے ہیں تو تڑپتے نہیں۔ نعرے لگاتے شہید ہوجاتے ہیں"۔

یہ گذشتہ رات کی آوازیں تھیں۔

"افضال ہندوستان کا جاسوس ہے"۔

ہاجرہ کے ذہن میں جب یہ آواز گونجی تو اُس کے سینے سے ہُوک اٹھی۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ گئی۔ اُس کے جی میں آئی کہ روئے اور اتنا روئے کہ دل کی لگی آنسوؤں کی راہ بہ جائے۔ اُس نے اپنے آپ کو یہ فریب دینے کی بھی کوشش کی کہ رات اُس نے صوبیدار اکبر علی کو خواب میں دیکھا تھا اور اُس نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ خواب میں کہا تھا، مگر حقیقت کے سامنے یہ ذہنی فریب ٹھہر نہ سکی۔

وہ رُک گئی تھی، پھر چل پڑی۔ اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور اُس کے پاؤں تلے زمین پانی کی لہروں کی طرح اوپر نیچے ہونے لگی۔ اس قسم کی ذہنی کیفیّت کو سمجھنے اور اس پر قابو پانے کے لیے جس عقل اور فہم و فراست کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہاجرہ میں نہیں تھی۔ ذہنی طور پر وہ اکھڑتی چلی گئی۔ اُسے کسی گھر کے ریڈیو سے جنگی ترانہ سنائی دیا:

جو موت آئے سامنے تو مسکراؤ ساتھیو

ترانے کی پُرجوش موسیقی اور طرز نے ہاجرہ کو تھام لیا۔ تیز اور جوشیلی موسیقی اُس کے وجود میں سرایت کرنے لگی اور اُس کے خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ اُس کے لڑکھڑاتے قدم سنبھل گئے۔ وہ چلتی گئی۔ اُسے اپنے سر پر صوبیدار اکبر علی کا ہاتھ محسوس ہُوا۔ اُسے سکون سا آنے لگا۔ لیکن معاً بعد اس کے دل پر پھر خوف طاری ہونے لگا۔

وہ رک گئی۔ سر کو جھٹکا دیا اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ افضال کے بند دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

★

بند دروازے کے پیچھے خاموشی تھی۔ بند کواڑوں نے ہاجرہ کے دل کے دریچے کھول دیئے اور اُسے قرار سا آنے لگا۔ دروازہ باہر سے بند نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ افضال اندر موجود ہے۔ ہاجرہ نے بڑی آہستہ سے دستک دی اور دروازہ فوراً کھل گیا۔

اُس کے سامنے افضال کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں قرآن تھا۔ قرآن اور افضال کی صورت دیکھ کر ہاجرہ کے ذہن کی الجھنیں اپنے آپ سلجھ گئیں۔ خوف نہ رہا۔ اضطراب نہ رہا۔ ذہن میں کوئی معمہ اور کوئی سوال نہ رہا۔ افضال کی مسکراہٹ نے ہاجرہ پر نشہ سا طاری کر دیا اور اُسے اکبر علی کی باتیں بے بنیاد معلوم ہونے لگیں، محض الزام! افضال تو وہ چشمہ

تھا جس سے ہاجرہ کی پیاس بجھتی تھی۔ وہ کیسے مان لیتی کہ اس چشمے میں زہر ملا ہُوا ہے جس نے اُسے نئی زندگی دی ہے اور جس نے اُس کے وجود میں روح پھونکی ہے۔

افضال کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو پہلے ہُوا کرتی تھی۔ مسکراہٹ وہی تھی۔ اس میں پہلے بھی ہاجرہ کو کوئی دھوکہ اور تصنّع نظر نہ آیا تھا، آج بھی نظر نہ آیا۔ فریب کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ ہاجرہ کو یہ خیال بھی تو آ گیا کہ ہاتھ میں قرآن مجید لے کر تو کوئی کسی کو فریب نہیں دے سکتا۔

پھر ایسے ہُوا کہ دروازہ جو افضال نے کھولا تھا وہ ہاجرہ اور افضال کے پیچھے بند ہوگیا۔ قرآن وہیں چلا گیا جہاں افضال رکھا کرتا تھا۔ اُس نے ہاجرہ کو اپنے بازوؤں میں لیا تو ہاجرہ نے افضال کے انداز میں پہلے والی وارفتگی اور بیتابی دیکھی۔ افضال کے لمس اور اُس کی سانسوں کی بُو نے ہاجرہ پر بے خودی طاری کر دی۔

"افضال جی!"— ہاجرہ نے اُس کے بازوؤں سے تڑپ کر نکلتے ہُوئے پوچھا —"تمہیں قسم ہے اس قرآن مجید کی جو تم ابھی ابھی پڑھ کر اُٹھے ہو۔ جھوٹ بولو گے تو دوزخ میں جاؤ گے.... سچ بتاؤ، تم ہندوستان کے جاسوس ہو؟"

افضال یوں اچک کر پرے ہٹ گیا جیسے ہاجرہ ناگن ہو اور اس نے اُسے ڈس لیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ہاجرہ کو دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہاجرہ نہیں جانتی تھی کہ چہرے کے اس تاثر سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکی کہ افضال کو غصّہ آ گیا ہے۔

"میں تو نہیں کہتی"— ہاجرہ نے خفّت آمیز لہجے میں کہا —"وہ کافر اکبر علی کہتا ہے.... اکبر علی کو جانتے ہو نا! وہ جو کل میرے پیچھے پیچھے یہاں آیا تھا"۔

"اکبر علی؟"— افضال نے غصّے سے کانپتی ہُوئی آواز میں کہا —"وہ اکبر علی جو جنگ سے بھاگ آیا ہے؟ پاکستان کے خوبصورت جوان سرحدوں پر شہید ہو رہے ہیں۔ اُن کے بازو کٹ رہے ہیں، ٹانگیں کٹ رہی ہیں، اُن کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے اندھی ہو رہی ہیں اور یہ اکبر علی جو اپنے آپ کو صوبیدار کہتا ہے، یہاں گلیوں میں بدمعاشیاں کرتا پھرتا ہے"۔

"افضال جی! افضال جی!"— ہاجرہ نے بچّوں کی طرح بے تابی سے کہا —"تمہیں ایک اور بات بتاؤں.... وہ اقبال ہے نا! وہ جس کے گھر میں نوکر ہوں۔ وہ فوج میں لفٹین ہے وہ زخمی ہوگیا ہے اور لاہور ہسپتال میں ہے۔ میرے گھر والے سب لاہور چلے گئے ہیں میں گھر میں اکیلی ہوں۔ کہتے ہیں اقبال دونوں آنکھوں سے اندھا ہوگیا ہے"۔

"وہ تمہیں چھیڑا کرتا تھا نا!"— افضال نے کہا —"تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہیں بہت تنگ کیا کرتا تھا.... دیکھ لینا ہاجرہ! جس جس نے تم پر بُری نظر رکھی ہے اُس کا انجام یہی ہوگا۔ اُسے خدا تمہارے سامنے سزا دے گا.... اور یہ اکبر علی؟.... میں نے اُسی وقت اس کی نظریں دیکھ لی تھیں جس وقت وہ یہاں تمہارے پیچھے آیا تھا۔ وہ میری اور تمہاری محبّت کو کاٹنا چاہتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے نا! میرے خلاف تمہیں گمراہ کر رہا ہے۔

اُسے بڑا اچھا موقع مل گیا ہے۔ آج کل کسی کی طرف اشارہ کر کے کہہ دو کہ وہ جاسوس ہے تو تصدیق کیے بغیر اُسے پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے پھر اُس کی رہائی کی کوئی صورت ہی نہیں بنتی خواہ وہ بیگناہ ہی ہو..... اکبر علی مجھے جاسوس کہہ کر گرفتار کرانا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے وہ تمہارے دل میں میرے خلاف نفرت پیدا کر رہا ہے تاکہ تم مجھے بیگناہ نہ سمجھو۔"

"خدا تمہارے دشمنوں کو گرفتار کرائے افضال جی!" — ہاجرہ نے بیباختگی سے افضال کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا — "میں اب اُس مردود کی باتیں نہیں سنا کروں گی۔"

ہاجرہ کو روحانی سکون محسوس ہونے لگا۔ صوبیدار اکبر علی نے افضال پر جو بھونڈا اور مکروہ سا بہروپ چڑھا دیا تھا، وہ اُتر گیا تھا۔ اب افضال اُسے اپنے اصلی اور قدرتی روپ میں نظر آنے لگا تھا۔ افضال کا یہ کمرہ تو ہاجرہ کے مجبور اور مغموم وجود کی پناہ تھا اور افضال اُس کے لیے ہوا سے بھرے ہوئے مشکیزے کی مانند تھا جس پر وہ رنج والم کے سیلاب میں بے خوف وخطر تیر رہی تھی۔

"میرے پاس بیٹھو ہاجو!" — افضال نے اُسے چارپائی پر اپنے ساتھ لگا کر بٹھا لیا اور اُس سے پوچھا — "اکبر علی نے تمہیں اور کیا کہا تھا؟"

"کہتا تھا میں لڑائی سے بھاگ کر نہیں آیا" — ہاجرہ نے افضال کو بتایا — "کہتا تھا کہ میں اُس دشمن کے خلاف لڑ رہا ہوں جو کسی کو نظر نہیں آتا اور وہ وزیر آباد میں موجود ہے۔ اُس نے مجھے سمجھایا تھا کہ ہندوستان کے جاسوس کیا کرتے ہیں.... اور افضال جی! میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں۔ رات کو جہاز آئے تھے نا! اُنہوں نے بم گرائے تھے۔ اُس وقت اکبر علی کی جیب سے آوازیں آتی تھیں۔ اکبر علی نے مجھے بتایا تھا کہ ہندوستان کے جاسوس جہاز چلانے والوں کو بتا رہے ہیں کہ بم یہاں پھینکو۔ پھر اکبر علی نے ہی مجھے بتایا تھا کہ بم وہاں نہیں گرے جہاں دشمن کے جہاز گرانے آئے تھے، دُور گرے ہیں۔"

"کیا وہ رات کو تمہارے پاس آیا تھا؟" — افضال نے پوچھا — "تم گھر میں اکیلی نہیں تھیں؟"

"اکیلی تھی" — ہاجرہ نے کہا — "پہلے تو میں اُسے دیکھ کر ڈر گئی تھی لیکن اُس نے مجھے بیٹی کہا اور ایسی باتیں کیں کہ مجھ میں جوش پیدا ہو گیا" — ہاجرہ نے افضال کو وہ ساری باتیں سنائیں جو صوبیدار اکبر علی نے اُس کے ساتھ کی تھیں، پھر اُس نے کہا تھا کہ تم افضال کے پاس جاتی رہنا اور اُس پر نظر رکھنا اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں میری جیب سے جس طرح کی آوازیں سنائی دی ہیں، اگر ایسی آوازیں افضال کے کمرے میں سنائی دیں تو مجھے فوراً بتانا۔

"اُس نے تمہارے ساتھ چھیڑ چھاڑ تو ضرور کی ہو گی!" — افضال نے کہا۔

"نہیں افضال جی!" — ہاجرہ نے کہا — "اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جیسی وہ پہلے کیا کرتا تھا، بلکہ مجھے تو شک ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اور ہے، یہ اکبر علی نہیں ہو سکتا.... وہ جانے لگا تو اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور چلا گیا۔ وہ تو بالکل بدل گیا ہے۔"

افضال گہری سوچ میں کھو گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو افضال جی؟"

"کچھ نہیں ہاجو!" — افضال نے مسکراتے ہوئے کہا — "خیال رکھنا، وہ بالکل نہیں بدلا۔ وہ تمہیں دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ پھر تمہارے پاس آئے تو مجھے بتانا کہ اُس نے کیا باتیں کی ہیں۔"

"ضرور بتاؤں گی" — ہاجرہ نے کہا — "اور افضال جی! میری ایک بات مان لو۔ گھر والے لاہور چلے گئے ہیں۔ میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ رات کو میرے پاس آجایا کرو نا! مجھے اکبر علی سے ڈر آنے لگا ہے۔"

"نہیں ہاجو!" — افضال نے کہا — "میرا تمہارے پاس رات کو آنا ٹھیک نہیں... تم بہت سیدھی ہو ہاجو! لوگ اعتراض کریں گے۔ باتیں بنائیں گے۔ صرف اسی شخص کو دیکھ لو۔ اس کی نیت دیکھ لو۔ اگر میں تمہارے پاس آیا تو یہ بدمعاش اکبر علی مجھے گرفتار کرا دے گا.... تم جاؤ۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے ضرور بتانا۔"

★

اُس روز گیارہ بجے کے لگ بھگ اقبال کی ذہنی اور جذباتی حالت نارمل ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔

"کون ہے یہاں؟" — اقبال نے پُوچھا۔

"میں ہوں سر! نرسنگ اردلی!"

"لائٹ آن کرو" — اقبال نے کہا — "نہیں، رہنے دو۔ بلیک آؤٹ ہو گا" — اُس نے مسکرا کر کہا — "مجھے یاد نہیں رہا تھا میں شہر میں ہوں.... وقت کیا ہے؟"

"گیارہ بجنے والے ہیں سر!" — نرسنگ اردلی نے کہا — "آپ کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ آئی ہوئی ہیں۔"

"کہاں ہیں؟"

"باہر بیٹھے ہوئے ہیں سر!"

"اوہ!" — اقبال نے پریشان سا ہو کے کہا — "بے چارے رات گیارہ بجے تک بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"رات نہیں سر!" — نرسنگ اردلی نے کہا — "دن ہے۔ دن کے گیارہ بجے ہیں۔"

"پھر مجھے نظر کیوں نہیں آ رہا؟" — اقبال نے پوچھا — "میری آنکھوں پر پٹی تو نہیں بندھی ہوئی!"

"سر!" — نرسنگ اردلی نے کہا — "میں ایم او صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ صاحب جاگیں تو فوراً اطلاع دینا۔"

لیفٹیننٹ اقبال مسلسل بے ہوشی میں رہا تھا۔ پھر اُسے بے ہوشی کے انجکشن دیئے جاتے رہے۔ اس دوران ڈاکٹروں نے دیکھ لیا تھا کہ اقبال کی بینائی ختم ہو چکی ہے۔ اب

اقبال ہوش میں آچکا تھا۔ اطلاع ملتے ہی میڈیکل آفیسر آگیا۔ اقبال کا باپ، اُس کی ماں اور بہنیں اُس کے پاس بیٹھی تھیں۔ یہ سب پریشان تھے کہ اقبال کی آنکھیں کھلی تھیں اور اُسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

ڈاکٹر نے جو میجر تھا، اقبال کو دیکھا۔ اقبال نے اُسے کہا کہ اُسے کچھ نظر نہیں آتا۔ میجر ڈاکٹر نے تمہید باندھی۔

"سر!"۔۔۔ لیفٹیننٹ اقبال نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔۔۔ "اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ اگر میری نظر ختم ہو گئی ہے تو صاف بتا دیں۔ میں کہیں ڈاکہ ڈالنے تو نہیں گیا تھا کہ وہاں سے زخمی ہو کر آیا ہوں۔ میں نے جوانوں کو شہید ہوتے دیکھا ہے۔ یہاں افسر اور جوان شہید ہو رہے ہیں۔"

"ہاں اقبال!"۔۔۔ میجر ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "میں تمہیں ذہنی طور پر تیار کر کے کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری بینائی سر کی شدید چوٹ کی وجہ سے ختم ہو گئی ہے۔"

"کیا میرے بچے کی آنکھیں ضائع ہو گئی ہیں؟"۔۔۔ اقبال کی ماں نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"امّی!"۔۔۔ اقبال نے گرج کر کہا۔۔۔ "میری آنکھیں ضائع نہیں ہوئیں قربان ہوئی ہیں۔ میری قربانی کو آنسوؤں سے ناپاک نہ کرو۔۔۔ سر!"۔۔۔ اُس نے ڈاکٹر سے کہا۔۔۔ "انہیں وارڈوں میں لے جائیں۔ انہیں وہ زخمی دکھائیں جن کی دونوں ٹانگیں، دونوں بازو کٹ گئے ہیں۔ انہیں آپریشن تھیٹر میں لے جائیں اور دکھائیں انہیں۔"

بڑی تلخ حقیقت تھی جسے ماں کا دل قبول نہیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسنگ اردلی چلے گئے۔ اقبال کو اپنی ماں اور دونوں بہنوں کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

"ابّا جان!"۔۔۔ اقبال نے اپنے باپ سے کہا۔۔۔ "امّی اور ان دونوں لڑکیوں کو سمجھائیں۔ اندھی میری آنکھیں ہوئی ہیں۔ میری روح روشن ہو گئی ہے۔ میں محاذ پر جانے سے پہلے اندھا تھا۔ میری آنکھیں اچھے اور بُرے میں، نیک اور بد میں فرق نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ حقیقت تو مجھ پر اب بے نقاب ہوئی ہے جو مجھے اُس وقت نظر نہیں آتی تھی جب میری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔ میں نے آنکھیں دے کر گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ دعا کرو اللہ میری یہ قربانی قبول کر لے۔"

باپ نے سسکی روک کر اور آنسوؤں کو آنکھوں میں جذب کر کے اقبال کا ہاتھ دبایا اور اُس نے مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی۔ باپ کے دو روپ تھے۔ وہ باپ بھی تھا اور وطن کی محبّت سے سرشار پاکستانی بھی تھا۔ باپ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا اور اُس کی ذات کا پاکستانی مجاہد خوش اور مطمئن تھا۔

★

ہاجرہ اُس رات بھی اکیلی تھی۔ صوبیدار اکبر علی اُس رات بھی اُس کے پاس گیا۔

"اکبر جی!"۔۔۔ ہاجرہ نے اُسے دیکھتے ہی کشمیری لہجے میں کہا۔۔۔ "افضال جاسوس نہیں ہے۔ اُس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم ہندوؤں کے جاسوس ہو۔ اُسے غصّہ آگیا۔"

"اوہ بیوقوف لڑکی!"۔۔۔ اکبر علی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔۔۔ "اُسے یہ نہیں کہنا تھا میں نے تمہیں کچھ اور کہا تھا۔۔۔ تم نے اُسے یہ بھی کہہ دیا ہو گا کہ اکبر علی نے کہا ہے کہ افضال جاسوس ہے۔"

"ہاں جی!"۔۔۔ ہاجرہ نے بڑی سادگی سے کہا۔۔۔ "اُس کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا جی! میں قرآن مجید کے سامنے جھوٹ تو نہیں بول سکتی نا جی!"

صوبیدار اکبر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ ہاجرہ کس قدر سادہ لڑکی ہے اور اُس کی فطرت میں چالاکی اور ہیرا پھیری کا شائبہ تک نہیں۔ اُس نے ہاجرہ کی باتیں سنیں تو چپ رہا اور سوچ میں کھو گیا۔

"تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو نا اکبر جی!"

"نہیں ہاجرہ!"۔۔۔ اکبر علی نے اپنی سوچ سے بیدار ہو کر کہا۔۔۔ "باپ اپنی بیٹی کے ساتھ کیسے شادی کر سکتا ہے!"

وہ باہر نکل گیا۔

رات ڈیڑھ بجے کا وقت ہو گا۔ صوبیدار اکبر علی کی آنکھ چند منٹ پہلے ہی لگی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔ اُس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ ایک پولیس کانسٹیبل کھڑا تھا۔ اُس نے اکبر علی کو بتایا کہ اُسے کیپٹن طارق نے بلایا ہے۔ اکبر علی نے جو کپڑے پہن رکھے تھے، انہی میں گھر سے نکل گیا اور تھانے میں کیپٹن طارق سے جا ملا۔

"صوبیدار صاحب!"۔۔۔ کیپٹن طارق نے اُسے کہا۔۔۔ "آج آپ قتل ہونے سے بچ گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن کے ایجنٹوں کو آپ کی اصلیّت کا علم ہو گیا ہے۔"

کیا ہوا ہے سر؟"۔۔۔ اکبر علی نے پوچھا۔

"میں ابھی ابھی سول ہسپتال سے آیا ہوں"۔۔۔ کیپٹن طارق نے کہا۔۔۔ "ایک آدمی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ یہ چار گھنٹے پہلے کا واقعہ ہے۔ تھانے میں چار پانچ آدمی ایک شدید زخمی کو چارپائی پر ڈال کر لائے۔ اُس کی پیٹھ میں دو گہرے زخم ہیں اور ایک زخم دائیں پہلو میں ہے۔ یہ چھُری، بڑے چاقو یا خنجر کے زخم ہیں۔ وہ گلی میں پڑا تھا۔ آج کل رات کو بلیک آؤٹ کی وجہ سے گلیاں سنسان ہوتی ہیں۔ اکیلے دکیلے آدمی پر قاتلانہ حملہ کر کے بھاگ جانا مشکل نہیں ہوتا۔ بہرحال کسی نے اس شخص کو گلی میں پڑا دیکھ لیا۔ اُس نے قریب کے گھروں کے چند آدمیوں کو بلا لیا۔ وہ سب اسے اٹھا لائے۔ ان لوگوں نے اس کا خون روکنے کے لیے زخموں پر کپڑے باندھ رکھے تھے۔"

"گلی کون سی تھی ؟" — اکبر علی نے پوچھا۔

"کسی مسجد والی گلی کا نام بتاتے تھے" — کیپٹن طارق نے جواب دیا۔

"مسجد والی گلی!" — اکبر علی نے کہا — "مجھے وہاں سے گزرنا تھا لیکن میں دوسری گلی میں چلا گیا تھا.... ہاں سر! پھر کیا ہوا؟ وہ آدمی زندہ ہے ؟"

"زندہ ہے" — کیپٹن طارق نے کہا — "ڈاکٹر مایوس تھا۔ کہتا ہے زخم مہلک حد تک گہرے ہیں۔ مجھے اس واردات میں دلچسپی نہیں لینی چاہیئے تھی۔ یہ پولیس کا کیس ہے۔ میں ویسے ہی سب انسپکٹر کے ساتھ زخمی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ ہوش میں تھا۔ اُس سے پوچھا کہ اُس پر کس نے حملہ کیا ہے ؟ اُس نے کہا۔ 'میرا کوئی دشمن نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی کے دھوکے میں مجھ پر حملہ کیا گیا ہے۔ وہ کسی اکبر علی کا نام لے رہے تھے۔ شاید صوبیدار....'

"اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اُس پر غشی طاری ہو گئی۔ اُسے فوراً ہسپتال لے گئے۔ میں نے آپ کا نام سنا تو میں بھی ساتھ چلا گیا اور ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اس کا نزعی بیان لینے کی کوشش کرے۔ اگر جنگ نہ ہوتی تو اس شخص کو فوراً مر جانا تھا کیونکہ اُسے خون کی ضرورت تھی جو اُسے اتنی جلدی نہیں مل سکتا تھا۔ جنگ کی یہ برکت ہے کہ لوگوں نے بالٹیوں اور کنستروں کے حساب سے خون دے رکھا ہے اور دے رہے ہیں۔ بعض لوگ دو دو اور بعض تین تین بار خون دے گئے ہیں....

"ڈاکٹر نے فوراً زخمی کے خون کا گروپ دیکھا اور اسے خون لگا دیا۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی بھی شروع کر دی۔ اب کوئی آدھ گھنٹہ پہلے وہ ہوش میں آیا اور اُس نے بیان دیا ہے

.... اُس نے بتایا کہ وہ گلی میں جا رہا تھا۔ مسجد والی گلی میں داخل ہوا تو پیچھے سے کوئی آدمی آئے اور اُسے چاقو یا چھریاں مار گئے۔ اُس نے پیچھے دیکھا۔ بلیک آؤٹ کی تاریکی میں اُسے دو آدمی نظر آئے لیکن انہیں پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ وہ گرنا نہیں چاہتا تھا، اپنے گھر تک جا سکتا تھا لیکن یہ سوچ کر گر پڑا کہ حملہ کرنے والے اُسے مرا ہوا سمجھ کر چلے جائیں اور اس پر مزید وار نہ کریں....

"اِن میں سے ایک نے کہا — 'پڑا رہنے دو۔ چلو یہاں سے' — دوسرے نے کہا 'ٹھہرو۔ دیکھ لینے دو، مر گیا ہے یا مر رہا ہے' — اس آدمی نے یا دوسرے نے زخمی کے منہ پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور بولا — 'یہ تو کوئی اور ہے۔ اکبر علی تو نہیں۔ وہ بدبخت صوبیدار ادھر ہی آیا تھا' — اس کے ساتھی نے کہا — 'جانے دو۔ بس مت رکو یہاں۔ مرنے دو جو کوئی بھی ہے۔ ہمارا باپ تو نہیں' — وہ دونوں چلے گئے۔ زخمی نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اُسے زخموں میں اتنا شدید درد ہوا کہ اُٹھ نہ سکا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک آدمی ادھر آیا اور اسے دیکھ کر رُک گیا۔ اُس کے شور مچانے سے یا لوگوں کو گھروں سے بلانے سے زخمی تھانے اور پھر ہسپتال پہنچا.... صوبیدار صاحب! آپ نے غلطی سے اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ حملہ آپ پر ہوا تھا"

"جی سر!" — صوبیدار اکبر علی نے کہا — "یہ حملہ مجھ پر ہوا تھا۔ فوراً اُٹھیں۔ دو چار کانسٹیبل ساتھ لیں۔ مجھے ایک شک ہے.... چلیں سر!" — اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

کیپٹن طارق بھی اٹھا۔ چند لمحوں میں وہ اے۔ ایس۔ آئی اور چار کانسٹیبلوں کے ساتھ اُس گلی کی طرف جا رہے تھے جس میں افضال ایک کمرے میں رہتا تھا۔

★

وہ جب اس کمرے تک پہنچے تو کمرے کا دروازہ بند دیکھا۔ ہاتھ لگایا تو کواڑ کھل گئے۔ کیپٹن طارق اور صوبیدار اکبر علی بڑی تیزی سے اندر گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی ٹارچیں تھیں۔ انہوں نے ٹارچوں کی روشنی میں کمرہ دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ ایک دیوار میں بغیر کواڑوں کے دو الماریاں تھیں۔ ایک خانے میں ایک قرآن مجید اور چند ایک پارے رکھے ہوئے تھے۔ ایک چارپائی تھی جس پر بستر نہیں تھا۔

کمرے کے پیچھے بھی ایک کمرہ تھا۔ اُس میں گئے۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کمرہ غسل خانے کے طور پر استعمال ہوتا رہا تھا۔ اس میں ایک لوٹے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ کیپٹن طارق اور صوبیدار اکبر علی نے دیواروں کو بڑی غور سے دیکھا۔ یہ پرانے زمانے کا کمرہ تھا۔ اس کی اینٹوں کو بھی دیکھا لیکن دیوار کہیں سے بھی اُکھاڑی ہوئی نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کہیں جاسوسوں والا وائرلیس ٹرانسمٹر چھپا ہوا مل جائے یا اس کے آثار مل جائیں لیکن ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی۔

وہ تھانے میں آ گئے۔ تھانے کے انچارج انسپکٹر شاہ کو کیپٹن طارق نے یہ ڈیوٹی دی کہ وہ اس گلی میں ایک دو مخبر مقرر کر دے۔ انسپکٹر شاہ کو افضال کا حلیہ بتا کر کہا گیا کہ اس آدمی کو جس کا نام افضال ہے گرفتار کرنا ہے۔

"اس گلی کے بچے اُس کے پاس قرآن پڑھنے جاتے تھے" — صوبیدار اکبر علی نے کہا — "یہ شخص محلے میں باعزت سمجھا جاتا تھا۔ گلی کے ہر گھر میں اطلاع کر دیں کہ یہ شخص جہاں کہیں نظر آئے یا کمرے میں آئے، تھانے خبر دیں۔ لوگوں سے کہیں کہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے"

انسپکٹر شاہ کو احکام اور ہدایات دے کر کیپٹن طارق نے صوبیدار اکبر علی کو الگ بٹھا لیا اور اُس سے پوچھا کہ اُسے کس طرح پتہ چلا تھا کہ افضال جاسوس ہے اور اُس نے اُسے فوری طور پر پکڑنے کی کوشش کیوں نہ کی۔

صوبیدار اکبر علی نے بتایا کہ اُسے کس طرح شک ہوا تھا اور وہ کس طرح اُس کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا رہا ہے۔ اکبر علی نے ہاجرہ کے متعلق بتایا کہ وہ کون ہے اور کیا ہے اور وہ افضال کے کمرے میں جاتی رہتی ہے۔ لیفٹیننٹ اقبال کے گھر کی نوکرانی ہے۔

"لیفٹیننٹ اقبال؟" — کیپٹن طارق نے چونک کر پوچھا "جس کی بہن، کیا نام تھا اُس کا.... ہاں شمع، ایک لڑکے کے ساتھ پکڑی گئی تھی ؟"

"جی سر!— اکبر علی نے کہا —"اس نوکرانی کو آپ نے تھانے میں دیکھا ہو گا لیفٹیننٹ اقبال کی ماں کے ساتھ پولیس سٹیشن میں آئی تھی۔"

"اچھا... وہ لڑکی!"— کیپٹن طارق نے کہا —"وہ تو بہت خوبصورت لڑکی ہے.... صوبیدار صاحب! مجھے اس خاندان پر شک ہے۔"

"نہیں سر!— اکبر علی نے کہا —"میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ خاندان بالکل صاف ہے۔ ان لوگوں پر جاسوسی کا شک نہ کریں۔ لیفٹیننٹ اقبال صاحب بیدیاں سیکٹر سے زخمی ہو کر لاہور سی۔ ایم۔ ایچ میں پڑے ہیں۔ مجھے پکی اطلاع مل چکی ہے کہ ان کی بینائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے۔"

"آپ نوکرانی کی بات کر رہے تھے"— کیپٹن طارق نے کہا —"پہلے یہ بتائیں کہ یہ لڑکی کیسی ہے۔ کیا وہ جاسوسی کر سکتی ہے؟"

"اللہ کی گائے ہے"— اکبر علی نے کہا —"مقبوضہ کشمیر سے آئی تھی۔ ماں باپ مر گئے اور یہاں تک پہنچ گئی۔ میں نے اُسے جنگ سے پہلے دیکھا ہے۔ بہت سیدھی بلکہ بُدھو ہے۔"

اکبر علی نے کیپٹن طارق کو یہ تو نہ بتایا کہ وہ اس لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کرتا رہا ہے اُس نے ۸ ستمبر کے بعد کی بات سنائی کہ ہاجرہ کو اُس نے بڑی اچھی طرح دیکھا تھا کہ کیسی لڑکی ہے۔ دیکھنے کی۔ جب یہ بتائی کہ وہ افضال کے پاس جاتی تھی۔ افضال کے متعلق تو اُسے شک ہو ہی گیا تھا۔ اُس نے کیپٹن طارق کو یہ بھی بتایا کہ وہ ایک روز افضال کے کمرے میں اُس وقت چلا گیا تھا جب ہاجرہ اُس کے پاس موجود تھی۔

"میں نے اس کمرے کو دیکھا تھا"— اکبر علی نے کہا —"مجھے کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی تھی۔ میں اُسی رات لیفٹیننٹ اقبال صاحب کے گھر چلا گیا۔ گھر کے تمام افراد اقبال کو دیکھنے لاہور چلے گئے تھے، ہاجرہ اکیلی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ افضال کے کمرے میں جاتی رہا کرے اور اگر اُس کی کوئی مشکوک حرکت دیکھے تو مجھے فوراً بتاتے۔"

"آپ نے اس لڑکی کو بتایا تھا کہ افضال انڈیا کا جاسوس ہے؟"— کیپٹن طارق نے صوبیدار اکبر علی سے پوچھا۔

"جی سر!— اکبر علی نے جواب دیا —"میں نے اُسے...."

"صوبیدار صاحب!— کیپٹن طارق نے اُس کی بات کاٹ کر کہا —"کیا آپ انٹیلی جنس کے صوبیدار ہیں؟ ایک بدھو اور اَن پڑھ لڑکی کو آپ نے اعتماد میں لے لیا اور توقع یہ رکھی کہ وہ آپ کے کہنے پر عمل کرے گی اور اس آدمی کو گرفتار کرا دے گی جسے وہ چاہتی ہے۔"

"اس غلطی کا احساس مجھے پہلے ہی ہو چکا ہے سر!— صوبیدار اکبر علی نے خفت کے لہجے میں کہا —"کل لڑکی نے اُسے جا بتایا کہ میں کہتا ہوں کہ افضال جاسوس ہے۔"

"آپ کی حماقت سے شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے"— کیپٹن طارق نے کہا —"آپ نے

دشمن کے پُورے رنگ کو چوکنّا کر دیا ہے۔ افضال نے اپنا ٹھکانہ تبدیل کر لیا ہے..... اور صوبیدار صاحب! ان لوگوں نے آپ کو راستے سے ہٹانے کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔ خدا نے آپ کو بچا لیا ہے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں سر!— اکبر علی نے کہا —"جس وقت اس آدمی پر قاتلانہ حملہ ہُوا ہے اُس وقت میں اقبال صاحب کے گھر سے نکلا تھا۔ میں نے مسجد والی گلی سے گزرنا تھا۔ مجھے یاد آ گیا ہے کہ میں جب اقبال صاحب کے گھر سے نکلا اور مسجد والی گلی کی طرف گیا تھا، اُس وقت دو یا تین آدمی پیچھے سے آ رہے تھے یا کھڑے تھے۔ آگے جا کر میں مسجد والی گلی میں جانے کی بجائے بائیں والی گلی میں چلا گیا۔ میں جب اس گلی میں مڑا تو آگے سے کوئی آدمی آ رہا تھا۔ وہ مسجد والی گلی میں مڑ گیا۔ حملہ آوروں نے مجھے دوسری گلی میں جاتے نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ اُس آدمی کے پیچھے چلے گئے ہوں گے جو میرے قریب سے گزر گیا تھا۔ وہ اُسے اکبر علی سمجھ کر اُسے مار گئے۔"

"وہ لڑکی رات کو بھی گھر میں اکیلی تھی؟"

"جی سر!"

"اب وہ گھر میں نہیں ہو گی"— کیپٹن طارق نے کہا —"وہ افضال کے ساتھ بھاگ گئی ہو گی۔"

"میرا خیال ہے نہیں گئی ہو گی سر!"

"مجھے آپ کے کسی بھی خیال سے اتفاق نہیں"— کیپٹن طارق نے کہا —"صبح ہو رہی ہے۔ جا کر دیکھیں اور مجھے رپورٹ دیں۔"

صوبیدار اکبر علی اٹھا اور تھانے سے نکل گیا۔ صبح کا اجالا صاف ہو رہا تھا۔ اکبر علی اُس گلی سے آیا جس میں افضال رہتا تھا۔ ہاجرہ افضال کے کمرے کے سامنے کھڑی تھی

"افضال کے پاس آئی ہو ہاجرہ؟"— اکبر علی نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں جی!— ہاجرہ نے کہا —"لیکن اُس کا کمرہ خالی ہے۔ اپنا سامان بھی لے گیا ہے۔"

"وہ بھاگ گیا ہے ہاجرہ!— اکبر علی نے اُسے کہا —"اُس کا پردہ اُٹھ گیا ہے اس لیے بھاگ گیا ہے.... وہ تمہیں بتا کر نہیں گیا؟"

"نہ جی!— ہاجرہ نے جواب دیا۔

"اُس کے دل میں تمہاری محبت ہوتی تو تمہیں بتا کر جاتا"— اکبر علی نے کہا —"جاؤ ہاجرہ اپنے گھر چلی جاؤ۔ یہ خیال بھی رکھنا کہ رات کو کوئی تمہارا دروازہ کھٹکھٹائے تو دروازہ نہ کھولنا۔"



وہ کیا جذبہ تھا، وہ کیا شان تھی! بھارت محاذوں پر نفری اور ہتھیاروں میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا ادھر پاک فوج کی نفری شہیدوں اور زخمیوں کی وجہ سے گھٹتی چلی جا رہی تھی۔ اُدھر تازہ دم کمک آ رہی تھی ادھر وہی لڑ رہے تھے جو ۶ ستمبر کی صبح مورچوں میں موجود تھے۔ اُن کے جسم ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ جنگی پیمانوں کے مطابق وہ لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

یہ اُن کا جذبہ تھا جو انہیں لڑا رہا تھا۔ یہ ایمان کی قوت تھی جس نے روح کی قوتوں کو بیدار کر دیا تھا، ورنہ جنگوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں کہ اکیس ڈویژنوں کا حملہ ساڑھے چار ڈویژنوں نے روک لیا ہو۔ جہاں پیادوں نے ٹینکوں کو روک لیا ہو۔ جہاں پچاس توپوں نے پانچ سو توپوں کو خاموش کر دیا ہو۔ جہاں ایک سو پینتیس پرانے اور سست رفتار طیّاروں نے چھ سو برتر اور جدید طیّاروں کو فضا سے بے دخل کر دیا ہو اور جہاں دشمن کی ایئر فورس کے کمانڈر انچیف نے اعلانیہ کہہ دیا ہو کہ میں اپنے آسمانوں کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

بھارت کی نیوی کے مقابلے میں پاکستان کی نیوی ماہی گیروں کا بیڑہ لگتی تھی۔ بھارتی نیوی میں سب سے زیادہ خوفناک بحری جنگی طیّارہ بردار جہاز ''وکرانت'' تھا۔ یہ سمندر پر تیرتا ہوا ہوائی اڈہ تھا۔ ہر لمحہ توقع تھی کہ بھارتی نیوی کا یہ جہاز کراچی کے قریب آجائے گا اور اس کے لڑاکا بمبار طیّارے کراچی بندرگاہ، ہوائی اڈے اور دیگر فوجی تنصیبات وغیرہ کو تباہ کر دیں گے اور یہ طیّارے پاکستان نیوی کے جنگی جہازوں کو کھلے سمندر میں جانے ہی نہیں دیں گے۔

اس کے علاوہ بھارت کے پاس کئی اور بہت بڑے بڑے بحری جنگی جہاز تھے جو پاکستان نیوی کو ایک دن میں بیکار کر سکتے تھے لیکن پاکستان نیوی جس دلیری سے اور سرفروشی کے جس جذبے سے باہر نکلی اور جس عزم سے بحری غازیوں نے دشمن کی نیوی کو للکارا اس نے دشمن پر دہشت طاری کر دی۔ دہشت بھی ایسی کہ دشمن کا طیّارہ بردار جہاز سامنے ہی نہ آیا۔ دوسرے جنگی جہاز بھی جہاں تھے وہیں دبکے رہے۔

سیالکوٹ سیکٹر میں چونڈہ میدانِ حشر بنا ہوا تھا۔ بھارت نئے ٹینک جھونکتا چلا جا رہا تھا۔ پاک فوج کے پاس ایک بھی فالتو ٹینک نہیں تھا جو چونڈہ کی ٹینکوں کی جنگ میں بھیجتا۔ وہی ڈیڑھ سو ٹینک تھے جو پہلے روز میدان میں اُترے تھے۔ اب ان کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، بھارت باؤلا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی چالیں اور داؤ بدلتے جا رہے تھے۔ اُس نے راتوں کو مونٹین اور انفنٹری ڈویژنوں کے بریگیڈوں سے، صحیح الفاظ میں، ہجوم کی صورت میں پاکستانی پوزیشنوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔

غیر ملکی جنگی مبصروں نے کہا تھا کہ بھارت چونڈہ سے آگے نکلنے اور وزیر آباد تک پہنچنے کے لیے بہت بڑی قربانی دے رہا ہے لیکن پاکستانی جن کی تعداد بہت کم ہے اور جن کے پاس ٹینک بھی بہت تھوڑے ہیں، حیران کر دینے والی شجاعت سے لڑ رہے ہیں۔ زیادہ تر نقصان بھارت کا ہو رہا ہے اور بھارت اپنی پیادہ فوج کو پاکستانیوں کے ہاتھوں بے دردی سے مروا رہا ہے۔

پاک فوج جنگی ٹریننگ اور کتابی قاعدوں سے آزاد ہو کر لڑ رہی تھی۔ جنگ کے بعد ایک پاکستانی بریگیڈیئر نے کہا تھا ''ہم نے دشمن کی جنگی طاقت دیکھی تو یہی ایک صورت سامنے

آتی تھی کہ ہم پیچھے ہٹ آئیں لیکن ہم نے کتاب بند کر دی اور توپوں اور مشین گنوں کے منہ کھول دیئے''۔

کتاب سے ہٹ کر لڑنے والوں میں توپ خانے کا ذکر خاص طور پر آتا ہے۔ میڈیم اور ہیوی توپیں اگلے مورچوں سے بہت پیچھے، میلوں کے حساب سے پیچھے رکھی جاتی ہیں۔ ان کے لیے گڑھے کھود کر انہیں ان میں رکھا جاتا ہے، اوپر زمین کے رنگ کا جال ہوتا ہے تاکہ اوپر سے انہیں طیّارے نہ دیکھ سکیں۔ یہ دور مار توپیں ہوتی ہیں۔ ان کی بیرلیں دائیں بائیں، اوپر نیچے ہوتی ہیں۔ ان کی پوزیشنیں نہیں بدلی جاتیں کیونکہ یہ بہت بڑی توپیں ہوتی ہیں لیکن دشمن نے چونڈہ میں ٹینکوں کی افراط کی بدولت ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ ان بڑی توپوں کی پوزیشنیں بار بار بدلنی پڑتی تھیں۔

پاک آرٹلری کے کمانڈروں نے یہ کارنامہ کر دکھایا کہ میڈیم اور ہیوی توپوں کو گڑھوں میں رکھنے کی بجائے انہیں کھلے میدان میں لے آئے اور ٹینکوں کے ساتھ آمنے سامنے کا معرکہ لڑا جسے توپ خانے کی زبان میں ''اوپن سائٹ'' کہتے ہیں۔ اس قسم کے معرکے میں نقصان توپ کا ہی ہوتا ہے کیونکہ ٹینک بھاگ دوڑ سکتا ہے، پینترے بدل سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں توپ اپنی پوزیشن نہیں بدل سکتی۔ اس کی بیرل کو گھمایا پھرایا جا سکتا ہے لیکن اس کی رفتار ٹینک کی حرکت سے سست ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹینک ایک سے زیادہ ہوں تو وہ ایک توپ کو بڑی جلدی ختم کر سکتے ہیں۔

ان تمام خطروں کو جانتے ہوئے چونڈہ کے چونتیس میل وسیع و عریض میدان میں پاک آرٹلری کو ٹینکوں کے خلاف ''اوپن سائٹ'' معرکے کئی جگہوں پر لڑنے پڑے۔

جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء ایک جذبے کی اور ایثار کی کہانی ہے۔ یہ قوم اور فوج کی اُس دیوار کی کہانی ہے جسے قرآن نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کہا ہے۔ زندہ قومیں دیوار کھڑی نہیں کیا کرتیں دیوار بن جایا کرتی ہیں۔ وطن کے سرفروش اس عہد کے ساتھ محاذ پر جاتے ہیں کہ جسم اور زندگی کوئی چیز نہیں۔ ان کی اہمیت کچھ نہیں۔ مسلمان نام ہے روح اور ایمان کا۔

جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے مردانِ حُر نے بدر کی روایت کو زندہ کر دیا تھا۔

چونڈہ میں پاکستان کے مجاہدین نے جنگ قادسیہ کی تاریخ کو دہرایا تھا۔ جنگ قادسیہ میں ایرانی ہاتھی لائے تھے جن کی پیشانیوں اور سونڈوں پر لوہے کے خول چڑھے ہوئے تھے، اور ان کے پہلوؤں میں اور پیچھے زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ اس طرح ہاتھیوں کو بکتر بند کیا گیا تھا۔

چونڈہ میں دشمن کے جو ٹینک آئے تھے، ان میں ایک سولہویں کیولری رجمنٹ تھی۔ اس کے ٹینکوں کا امتیازی نشان سیاہ ہاتھی تھا۔ ہر ٹینک کے آگے سیاہ ہاتھی کا سکیچ بنا ہوا تھا۔ قادسیہ میں مسلمانوں نے ایرانیوں کے بکتر بند ہاتھیوں کو بُری طرح زخمی کر کے بھگایا تھا۔ اس روایت کو مسلمانوں نے صدیوں بعد چونڈہ میں تازہ کیا اور ہندوؤں کا آہنی غرور توڑ ڈالا۔

★

یہی کیفیت دوسرے محاذوں کی تھی۔ جنگ کا عروج تھا۔ شہیدوں اور زخمیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا۔ فوجی ہسپتالوں میں جگہ نہیں رہی تھی۔ لاہور کے سی۔ ایم۔ ایچ میں تو زخمی کو کھڑا کرنے کی بھی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ جن زخمیوں کو دوسری چھاؤنیوں کے ہسپتالوں میں بھیجا جا سکتا تھا انہیں بھیج دیا گیا۔

لیفٹیننٹ اقبال کو کھاریاں سی۔ ایم۔ ایچ میں بھیج دیا گیا۔ اُس کے زخم زیادہ خطرناک نہیں تھے۔ مزید آپریشن یا خون دینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ یہ صرف مرہم پٹی کا کیس تھا۔ اُس کی بینائی کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ اُسے اب کسی بھی ہسپتال میں رکھا جا سکتا تھا۔

یہ اُس سے اگلے روز کا واقعہ ہے جب اکبر علی نے ہاجرہ کو افضال کے خالی کمرے کے باہر کھڑے دیکھا اور اُسے گھر بھیج دیا تھا۔ دن کے بارہ بجے کے لگ بھگ اقبال کا باپ، اُس کی ماں اور بہنیں لاہور سے واپس آ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گھر عورتوں اور مردوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

صوبیدار اکبر علی کیپٹن طارق کو رپورٹ دے چکا تھا کہ ہاجرہ یہیں ہے اور اُسے افضال کے غائب ہو جانے کا علم نہیں۔

"کیا اس لڑکی کو یہاں بُلا کر نہ پوچھا جائے؟" — کیپٹن طارق نے کہا — "ڈر کر بول پڑے گی"۔

"نہیں سر!" — اکبر علی نے کہا — "اِس معصوم لڑکی کو ہم ڈرانے نہیں بلائیں گے۔ مجھے افضال کے غائب ہو جانے کی اس لحاظ سے خوشی ہے کہ یہ لڑکی اُس سے بچ گئی ہے"۔

"صوبیدار صاحب!" — کیپٹن طارق نے کہا — "مجھے آپ کی باتوں سے کچھ شک ہو رہا ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ آپ کی خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ آپ کو شاید احساس نہیں کہ کتنے بڑے طاقتور دشمن کے ساتھ ہم لڑ رہے ہیں جس کا ففتھ کالم اور جاسوس ہمارے درمیان سرگرم ہیں .... آپ کو میں انٹیلی جنس کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں آپ کو آپ کی بٹالین میں واپس بھیج دوں گا اور آپ کو سیدھا فرنٹ پر بھیج دیا جائے گا"۔

"میرے ساتھ اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مجھے کوئی فرنٹ پر بھیج دے" — صوبیدار اکبر علی نے کہا — "میں تھوڑی سی گستاخی کروں گا سر! آپ کی مرضی ہے معاف کر دیں چاہے نہ کریں .... آپ مجھے انٹیلی جنس کے قابل نہیں سمجھتے۔ کیپٹن طارق صاحب آپ کی اتنی عمر نہیں جتنی میری سروس ہو چکی ہے۔ میں جس وقت انٹیلی جنس میں آیا تھا اُس وقت آپ کے والد صاحب کی شاید شادی نہیں ہوئی تھی۔ آپ ابھی کتابوں کی باتیں کر رہے ہیں اور میں تجربے کی بات کر رہا ہوں"۔

"صوبیدار صاحب!" — کیپٹن طارق نے کہا — "میری بات سمجھنے کی ...."

"سر!" — اکبر علی نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "اگر میرا کوئی بچہ زندہ ہوتا تو وہ آپ جیسا جوان ہوتا۔ کوئی بھی زندہ نہیں۔ میری بیوی، میرے ننھے، میرے ماں باپ،

میرا تایا، میرے بھتیجے اور میرے خاندان کے اٹھارہ فرد اس ملک پر قربان ہو چکے ہیں۔ آپ اِدھر کے رہنے والے ہیں۔ پاکستان نے قربانی تو ہم سے لی ہے جو اُدھر سے آئے ہیں۔ میں نے تو بریگیڈ کمانڈر صاحب سے عرض کی تھی کہ مجھے 'ری کال' کیا ہے تو انفنٹری بٹالین میں بھیج دیں، میں اُس ہندو کے ساتھ حساب برابر کرنا چاہتا ہوں جس نے دھوکے میں میرے پورے خاندان کو شہید کر دیا تھا مگر کمانڈر صاحب نہیں مانے"۔

"نہیں نہیں صوبیدار صاحب!" — کیپٹن طارق نے کہا — "میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ نے پاکستان کے لیے کوئی قربانی نہیں دی، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ غلطی کر رہے ہیں"۔

یہ سُن کر کہ ۱۹۴۷ء میں صوبیدار اکبر علی کا پورا خاندان شہید ہو گیا تھا، کیپٹن طارق کا لب و لہجہ بدل گیا تھا اور اکبر علی کے متعلق اُس کی رائے بدل گئی تھی۔

"یہ نوکرانی کشمیر کی مہاجر ہے سر!" — اکبر علی نے کہا — "یتیم ہے۔ اکیلی ہے۔ کردار کی اتنی پکی ہے کہ میں آپ کو بتاؤں تو آپ یقین نہیں کریں گے"۔

"ٹھیک ہے صوبیدار صاحب!" — کیپٹن طارق نے کہا — "اگر آپ یہی بہتر سمجھتے ہیں تو میں آپ سے اتفاق کروں گا"۔

"میں آپ کا مشکور ہوں سر!" — صوبیدار اکبر علی نے کہا — "اللہ آپ کا اقبال بلند کرے۔ میں آپ کو آج ہی بتا دیتا ہوں کہ یہاں کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور۔ کوئی واقعہ ہو گا .... سر! میں تو رات کو کم ہی سوتا ہوں"۔

"اللہ مدد گار ہے صوبیدار صاحب!" — کیپٹن طارق نے کہا۔



لیفٹیننٹ اقبال کے ماں باپ پچھلے پہر کھاریاں چلے گئے۔ شمع نہ جا سکی کیونکہ اُسے لاہور میں ہی بخار ہو گیا تھا۔ دوائیاں لینے کے باوجود بخار ذرا سا بھی کم نہیں ہوا تھا۔ شمع کی چھوٹی بہن اور ہاجرہ شمع کے لیے گھر رہ گئی تھیں۔

اقبال کھاریاں سی۔ ایم۔ ایچ میں پہنچ چکا تھا اور وہ افسروں کے الگ کمرے میں تھا۔ اُس کے ماں باپ جب اُس کے کمرے میں گئے اُس وقت کیپٹن عصمت اُس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اقبال کی ذہنی حالت بالکل نارمل تھی۔ وہ کیپٹن عصمت کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

اُس کے ماں باپ کمرے میں داخل ہوئے تو کیپٹن عصمت نے اُسے بتایا۔

"عصمت بیٹی!" — اقبال کی ماں نے کہا — "اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ تم یہاں ہو۔ میرے بیٹے کی دیکھ بھال ہوتی رہے گی"۔

"لیکن خالہ جان!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "میں ہر وقت ان کے ساتھ تو نہیں رہ سکتی۔ مجھے تو ایک منٹ کی فرصت نہیں ملتی۔ کبھی کبھی دیکھ جایا کروں گی۔ ان کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ تو جلدی ٹھیک ہو جائیں گے .... یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے گھر کا کوئی ایک آدمی یا ایک عورت اِن کے ساتھ رہ سکتی ہے"۔

"کون رہے گا بیٹی!" — اقبال کی ماں نے کہا۔

"شمع رہ جائے گی" — کیپٹن عصمت نے کہا — "وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئی؟"

"ایک سو دو سے اوپر بخار ہے اُسے" — اقبال کی ماں نے کہا — "لے دے کے ایک نوکرانی ہے۔"

"اُس کو بھیج دیں" — کیپٹن عصمت نے کہا — "اُس کے کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔ فرش پر بچھانے کے لیے اُسے گدا مل جائے گا۔ اقبال کے ساتھ کسی کا رہنا ضروری ہے۔ یہ چلنا پھرنا چاہے گا جو اس کے لیے ضروری ہے۔ کوئی ساتھ ہونا چاہیے۔"

اقبال کی ماں کے آنسو نکل آئے۔ کیپٹن عصمت اُسے اور اقبال کے باپ کو باہر لے گئی۔

"اس کے سامنے رونا نہیں" — کیپٹن عصمت نے کہا — "اس کے ساتھ کوئی جذباتی بات نہ کرنا۔ اسے اس معذوری کا احساس نہ دلانا۔ خالہ جان بڑی بڑی تلخ حقیقتیں قبول کرنی پڑتی ہیں۔ اس وقت مطمئن ہے، بلکہ خوش ہے کہ اس نے ملک کی خاطر قربانی دی ہے۔ اس کی اس خوشی کو قائم رہنے دیں .... میں آپ کو یہ مشورہ بھی دوں گی کہ آپ ہر روز نہ آئیں ورنہ اس کے اندر محرومی اور معذوری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ آپ اس کے ماں باپ ہیں۔ آپ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ کریں، منہ سے کوئی نہ کوئی ایسی بات نکل ہی جاتی ہے جو اس کے جذبات کو مجروح کر سکتی ہے۔ آپ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھیں اور واپس چلے جائیں۔ وزیر آباد دور نہیں، یہ قریب ہی تو ہے۔ رات کو نوکرانی کو ان کے پاس چھوڑ جائیں۔"

★

اقبال کے باپ نے کیپٹن عصمت کے کہنے پر عمل کیا۔ اقبال کی ماں کو جلدی واپس لے گیا اور رات آٹھ بجے تک ہاجرہ کو ساتھ لے آیا۔

"میری روح بھی تم پر فخر کیا کرے گی اقبال بیٹا!" — باپ نے اقبال سے کہا — "میں نے پاکستان بنایا تھا، تم نے پاکستان کو بچایا ہے۔"

"مجھے آنکھوں کا افسوس نہیں ابّا جان!" — اقبال نے کہا — "افسوس یہ ہے کہ میں بڑی جلدی زخمی ہو گیا ہوں۔ میں تو آخر دم تک لڑنے گیا تھا۔ مجھے خدا نے اس مقدس فرض سے بڑی جلدی سبکدوش کر دیا ہے۔ میں نے ابھی پاکستان کو نہیں بچایا ابّا جان! ابھی جنگ جاری ہے۔ آج کی خبریں کیا ہیں؟ بیدیاں سیکٹر کی کوئی خبر؟"

باپ نے جو خبریں سنی تھیں وہ اُسے سنا دیں اور اُسے بتایا کہ وہ اس کے لیے ٹرانسسٹر لے آیا ہے اور یہ بھی کہ اب ہاجرہ اُس کے ساتھ رہے گی۔

"یہ آپ نے اچھا کیا ہے" — اقبال نے کہا اور ہنس پڑا۔ کہنے لگا — "اب تو کسی کا ہاتھ پکڑ کر ہی چل سکوں گا .... ہاں ابا جان! عصمت نے مجھے بتایا ہے کہ شمع کا رشتہ جس لیفٹیننٹ لطیف کے ساتھ طے ہوا ہے وہ بھی زخمی ہو کر یہاں آیا ہوا ہے۔ عصمت مجھے اُس کے کمرے تک لے جائے گی۔ عصمت نے یہ بھی بتایا ہے کہ شمع اس ہسپتال میں زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے آئی تھی اور اتفاق سے وہ اُسی کمرے میں رہی جس میں لیفٹیننٹ لطیف ہے۔"

"ہاں بیٹا!" — باپ نے کہا — "ایسے ہی ہوا ہے۔"

"ابّا جان!" — اقبال نے پوچھا — "ہاجرہ کی بجائے شمع آجاتی تو اچھا نہ ہوتا؟"

"ہم نے تمہیں بتایا نہیں اقبال!" — باپ نے جواب دیا — "شمع کو لاہور میں ہی بخار ہو گیا تھا۔ آج ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ یہ ٹائیفائیڈ ہے۔ تمہاری چھوٹی بہن کو بھیجنا نہیں چاہتا تھا اور تمہاری ماں یہاں رہ نہیں سکتی۔ رہ بھی جائے تو تمہیں دیکھ دیکھ کر روتی رہے گی اور تمہیں بھی پریشان کرے گی۔"

باپ جانے کے لیے اٹھا اور اقبال کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چوما اور چلا گیا۔

★

ہاجرہ کمرے میں رکھے ہوئے بنچ پر بیٹھی اقبال کو دیکھے جا رہی تھی۔ اُس کا دھیان اِدھر آیا ہی نہیں تھا کہ باپ بیٹا کیا باتیں کر رہے ہیں۔ وہ اپنی سوچوں اور خیالوں میں گم تھی۔ اُسے وہ اقبال یاد آ رہا تھا جس نے باورچی خانے میں اُس کی عزت صرف دو روپوں میں خریدنی چاہی تھی، پھر اُس نے قیمت بڑھا کر بیس روپے کر دی تھی۔

یہ خیال آیا اور گذر گیا۔

وہ سوچنے لگی کہ یہ اقبال تو بے بس ہے، محتاج ہے جو کسی کا ہاتھ پکڑے بغیر چل ہی نہیں سکے گا۔ ہاجرہ کو یاد آیا کہ اُس نے ایک بار اقبال کی ایک بیہودہ حرکت پر جل بھن کر بددعا دی تھی — "خدا کرے تو اندھا ہو جائے اور ٹھوکریں کھاتا پھرے۔"

ایک تیر ہاجرہ کے دل میں اُتر گیا۔ اُسے خدا پر غصہ آنے لگا جس نے اُس کی ایک ہی دعا قبول کی اور کون سی قبول کی۔ ہاجرہ کو یہ خیال بھی آگیا کہ اقبال اپنی آنکھوں کی روشنی کہاں دے آیا ہے۔

"آہ، ماں کا شہزادہ بیٹا!" — ہاجرہ کے دل سے ہوک سی اٹھی — "زخمی ہو کر نہ جانے کتنی دیر محاذ کی مٹی میں تڑپتا رہا ہوگا۔"

ایک وہ خوبصورت اقبال تھا جس کا چہرہ بھرا بھرا اور آنکھوں میں جوانی کا خمار تھا۔ ہاجرہ کو اُس چہرے سے نفرت تھی۔ ایک یہ چہرہ تھا جس پر پٹیاں بندھی تھیں اور جس کا رنگ محاذ کی مٹی جیسا ہو گیا تھا۔ اور وہ آنکھیں جن میں شباب کی نشیلی چمک تھی، بے نور تھیں۔ ہاجرہ کو یہ چہرہ اتنا اچھا لگا کہ وہ بے تاب اور بے قابو ہو گئی۔ اُس وقت اقبال کا باپ جا چکا تھا۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا کیونکہ بلیک آؤٹ تھا۔ روشندانوں، کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ چڑھا دیئے گئے۔ روشنی باہر نہیں جاتی تھی پھر بھی زیرو کے بلب جلائے جاتے تھے۔

اقبال کے باپ کے جاتے ہی ہاجرہ تیزی سے اٹھی اور اقبال کے بیڈ کی پائنتی

کے قریب جا پہنچی۔

"اقبال جی!" ــــ اُس نے یوں کہا جیسے ہچکی لی ہو اور سَر اقبال کے پاؤں پر رکھ کر سسک سسک کر رونے لگی۔

"کون؟" ــــ اقبال نے جو بیڈ پر ٹانگیں لمبی کرکے بیٹھا ہُوا تھا، ہاتھوں سے ٹٹول کر ہاتھ ہاجرہ کے سَر پر رکھے اور بولا ــــ "ہاجو! یہ تم ہو؟ .... کیا ہوگیا ہے تمہیں ہاجو؟"

"اقبال جی!" ــــ ہاجرہ نے اُس کے پاؤں سے سَر اٹھا کر بے تابی سے اقبال کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس ہاتھ کو کئی بار چوم کر بولی ــــ "مجھے بخش دینا اقبال جی! مجھے بخش دینا۔ میری زبان کالی ہے۔ اللہ نے میری دُعا کبھی نہیں سنی بد دعا سن لی ہے۔ میں نے کہا تھا، خدا کرے تُو اندھا ہو جائے۔"

"او پگلی ہاجو!" ــــ اقبال نے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا ــــ "تجھے کس نے بتایا ہے میں اندھا ہوگیا ہوں۔ میری آنکھیں شہید ہوئی ہیں ہاجو! میں نے اپنی آنکھیں اللہ کی راہ میں قربان کی ہیں۔ شہیدوں پر رونا گناہ ہے" ــــ اقبال ہنس پڑا۔

ہاجرہ بیڈ پر بیٹھ گئی اور اُس نے نظریں اقبال کے چہرے پر جما دیں۔ وہ تصوّر میں اُس اقبال کو دیکھ رہی تھی جو باورچی خانے میں اُسے چھیڑ کر ہنسا کرتا تھا۔ وہ ہنسی مکروہ تھی۔ ہاجرہ کو اقبال کے اتنے اچھے دانت بہت بُرے لگتے تھے .... اقبال آج ہسپتال کے بیڈ پر بھی ہنسا تھا۔ ہاجرہ کو یہ ہنسی بڑی پیاری لگی۔ اقبال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہاجرہ نے بے اختیار چاہا کہ وہ اقبال کی اِس ہنسی اور اِس مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لے۔ وہ سیدھی سادی لڑکی جو محبت اور نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتی تھی، جان نہ سکی کہ اقبال کی اِس ہنسی اور مسکراہٹ میں کیا جادو ہے۔ اس ہنسی میں شگفتگی، مردانگی اور روح کا نُور شامل تھا۔

"ہاجو!" ــــ اقبال نے کہا ــــ "تم مجھے بخش دینا۔ میں تمہیں بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ تم نے مجھے معاف نہ کیا تو خدا میری یہ قربانی قبول نہیں کرے گا۔"

"ایسی باتیں نہ کرونا، اقبال جی!" ــــ ہاجو نے اپنی فطری سادگی سے کہا ــــ "میں کون ہوتی ہوں بخشنے والی۔ تمہیں اِس حال میں دیکھ کر میں خوش تو نہیں ہوں اقبال جی! .... اِن باتوں کو چھوڑو نا۔ مجھے کچھ اور بتاؤ" ــــ وہ چُپ ہوگئی۔

ہاجرہ اُس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی تھی، بہت سی باتیں کہنا چاہتی تھی مگر ذہن میں پوچھنے اور کہنے والی باتوں کا ہجوم ایسا گڈمڈ ہُوا کہ وہ چُپ چاپ اقبال کے چہرے کو دیکھنے لگی جس کے ایک گال پر روئی اور اس پر پٹی کا پیڈ رکھا تھا اور اس پر ٹیپ لگی ہوئی تھی اور جو چہرہ ننگا تھا اُس پر دھوپ، پھٹتے گولوں کی تپش، گرد و غبار اور شب بیداری نے سانولی سی تہہ جما دی تھی۔ ہاجرہ کو بُجھا بُجھا، پھیکا پھیکا سا رنگ بڑا پیارا لگا۔ اُس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اقبال کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اقبال جی!" ــــ ہاجرہ نے کہا ــــ "تمہاری طرح بہت سے خوبصورت جوان زخمی

ہوتے ہوں گے!"

"شہید بھی ہوگئے ہیں ہاجو!" ــــ اقبال نے کہا ــــ "اور شہید ہو رہے ہیں .... مَیں شہید ہونا چاہتے تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں کی قربانی دینی چاہیے تھی۔"

"پر اقبال جی!" ــــ ہاجرہ نے معصوم آواز میں کہا ــــ "اندھا ہونا اچھی بات تو نہیں ہے ناجی! تم اتنے خوبصورت اور جوان ہو۔"

"اندھا میں نہیں ہُوا ہاجو!" ــــ اقبال نے کہا ــــ "اندھا ہمارا دشمن ہوگیا ہے۔ وہ پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرنا چاہتا ہے، پھر وہ ہندوستان سے اسلام کا نام ونشان مٹانا چاہتا ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں سے محمد بن قاسم اور غزنوی کا انتقام لینا چاہتا ہے۔"

"یہ دونوں کون ہیں؟" ــــ ہاجرہ نے پوچھا۔

اقبال ہنس پڑا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ کس کے ساتھ بات کر رہا ہے۔

"ایک اور بات بتاؤ نا، اقبال جی!" ــــ ہاجرہ نے اپنا پہلا سوال نظر انداز کرکے پوچھا ــــ "تم نے کتنے ہندوؤں کو قتل کیا ہے؟"

"میں اکیلا نہیں تھا ہاجو!" ــــ اقبال نے کہا ــــ "ہم سب نے مل کر بہت سارے ہندوؤں کو مارا ہے۔"

"بہت سارے کتنے ہوتے ہیں اقبال جی؟" ــــ ہاجرہ نے پوچھا ــــ "بیس سے کم ہوتے یا زیادہ؟"

"بیس بہت تھوڑے ہوتے ہیں ہاجو!" ــــ اقبال نے کہا ــــ "کئی سَو بلکہ کئی ہزار سمجھ لو۔"

"سچ اقبال جی؟" ــــ ہاجرہ نے بچوں کے اشتیاق سے کہا۔

"تمہیں خوشی ہوتی ہے ہاجو؟"

"ہاں ناجی!" ــــ ہاجرہ نے کہا ــــ "کشمیر میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو گھروں میں آکر قتل کیا تھا۔ بچوں کو بھی اقبال جی! عورتوں کو بھی۔ اور جو بچ گئے تھے وہ اِدھر بھاگ آئے تھے .... کشمیر میرا وطن ہے نا، اقبال جی!"

"ہاں ہاجو!" ــــ اقبال آہ لے کر بولا ــــ "کشمیر تمہارا وطن ہے۔ کشمیر کشمیریوں کا ہے، اور کشمیر...." وہ چُپ ہوگیا۔ اُسے خیال آگیا کہ وہ جو کہنے لگا ہے وہ ہاجرہ کی سمجھ سے بالا ہے۔

★

اتنے میں اقبال کا کھانا آگیا۔ اُس نے کھانا لانے والے سے پوچھا کہ وہ ہاجرہ کے لیے بھی کھانا لا سکتا ہے؟

"کیوں نہیں سَر!" ــــ کھانا لانے والے نے کہا ــــ "محاذ کے زخمیوں کی ہر بات کو ہم حکم سمجھتے ہیں سَر! ابھی اور لے آتا ہوں۔"

ہاجرہ نے ٹرے اقبال کے سامنے رکھی اور اُسے کھانا کھلانے لگی اور اس کے ساتھ

ہی ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں اپنے ہاتھ سے کھانا سیکھ جاؤں گا" — اقبال نے کہا — "ابھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

اقبال نے کھانا کھالیا۔ ایسا ہی کھانا ہاجرہ کے لیے آیا تھا۔ اُس نے بھی کھا لیا، پھر وہ اقبال کو اٹھا کر غسل خانے تک لے گئی اور بیڈ پر لے بھی آئی۔

"میں نے تم سے بہت باتیں کرائی ہیں اقبال جی!" — ہاجرہ نے کہا — "اب سو جاؤ۔"

"نہیں ہاجو!" — اقبال نے کہا — "تمہیں نیند آتی ہے تو سو جاؤ۔ میں ابھی نہیں سوؤں گا.... آنکھ لگ جاتی ہے تو آوازیں سی آنے لگتی ہیں جیسے کوئی مجھے بلا رہا ہو .... اقبال، اقبال.... پھر آنکھ کھُل جاتی ہے پھر گولے پھٹنے لگتے ہیں یا خواب میں ایک شہید عورت اور اُس کے بچے کی لاش نہر میں بہتی نظر آتی ہے۔ میں ان کی طرف دوڑتا ہوں تو آنکھ کھُل جاتی ہے اور باقی رات جاگتے گذر جاتی ہے۔"

"پھر میں تمہارے ساتھ جاگوں گی اقبال جی!" — وہ اقبال کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور اُس سے پوچھا — "لوگ ایک نہر کا نام لیتے ہیں .... بی بی یا جانے کیا .... تم بھی اُس نہر پر لڑے تھے اقبال جی؟"

"بی بی نہیں ہاجو!" — اقبال نے کہا — "بی۔آر۔بی .... یہ ایک نہر ہے ہاجو! یہ سرحد کے ساتھ ساتھ بڑی دُور تک چلی جاتی ہے" — اقبال کا لب و لہجہ پھر جذباتی ہو گیا۔ کہنے لگا "بی۔آر۔بی کو ہم پاکستان کی آبرو سمجھ بیٹھے تھے ہاجو! یہ نہر ہماری ماؤں اور بہنوں کی مانگ بن گئی ہے۔ میں نے اِس نہر کی روانی میں جلال دیکھا ہے، تمکنت دیکھی ہے۔ ایسا جلال کسی باوقار ماں کے چہرے پر اُس وقت نظر آتا ہے جب وہ اپنے جوان اور غیور بیٹوں کو دیکھتی ہے .... جب اِس نہر میں دشمن کے گولے پھٹتے تھے تو پانی دُور اُوپر تک اچھلتا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمارے جسموں میں بجلی کی طاقت آ جاتی تھی۔ کبھی تو خیال آتا ہے ہاجو! یہ نہر نہ ہوتی تو شاید ہم اتنی جانبازی سے لڑ بھی نہ سکتے۔ ہمیں بی۔آر۔بی لڑا گئی ہے، اس لیے نہیں کہ یہ نہر دشمن کے راستے میں آ گئی تھی اور دشمن اسے عبور نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اس لیے کہ اس نہر کو وطن کی عصمت سمجھ کر پاک فوج کے غازی اس نہر اور دشمن کے درمیان آ گئے تھے۔"

لیفٹیننٹ اقبال بولتا جا رہا تھا۔ وہ بولنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ چپ ہو جاتا ہے تو ذہن کے سینے میں سیاہ دھواں سا بھر جاتا ہے جو اٹھتا ہے تو اُس کی آنکھوں کو لگتا ہے، آنکھیں جلتی ہیں اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہاجرہ اُس کے بہت سے الفاظ اور کئی باتیں سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی، وہ بولے جا رہا تھا۔

"تم نے مرتے ہوئے دشمن کو دیکھا تھا اقبال جی؟"

"دشمن کی لاشوں کے ڈھیر دیکھے تھے ہاجو!" — اُس نے بات شروع کی تو ہاجرہ کو بھارتی حملے کی اور پاک فوج کے حملہ روکنے کی بڑی لمبی روئیداد سُنا ڈالی — بھارتی توپوں کی گولہ باری، بنگالی مجاہدوں کے نعرے، جم کر لڑنا، ان کا کمانڈو ایکشن، دشمن کے طیاروں

کے زناٹے، بم راکٹ اور مشین گنوں کی بوچھاڑیں، بی۔آر۔بی میں بہتی پاکستان کے سرحدی دیہاتیوں کی لاشیں — اقبال اس طرح سنا رہا تھا جیسے محاذ پر لڑ رہا ہو۔

ہاجرہ یوں محو ہو گئی تھی جیسے بی۔آر۔بی کے کنارے بیٹھی اپنی آنکھوں سے پاک فوج کی معرکہ آرائی دیکھ رہی ہو۔ اقبال نے اُن عورتوں اور بچّوں کا ذکر کرتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لیں جنہیں بھارتی فوجی سرحدی دیہات سے اپنے ساتھ لے گئے یا قتل کر دیا تھا۔ غضب سے اقبال کا چہرہ سُرخ ہوا جا رہا تھا۔ ہاجرہ اپنے آپ میں شدتِ جذبات کا لرزہ محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے پہلی بار محاذ کی تفصیلات سنی تھیں۔

اگر ڈاکٹر رات کے راؤنڈ پر نہ آ جاتا تو اقبال ساری رات جاگتا اور بولتا رہتا۔

"نیند نہیں آ رہی؟" — ڈاکٹر نے جو میجر تھا، اقبال سے پوچھا۔

"شاید آ جاتے" — اقبال نے کہا — "لیکن ذہن بیدار رہتا ہے۔"

"یہ ٹھیک نہیں" — میجر ڈاکٹر نے کہا — "نیند آنی چاہیے۔ میں ایک گولی لکھ دیتا ہوں۔ ابھی نرس دے جائے گی۔"

ڈاکٹر لیفٹیننٹ اقبال کو دیکھ کر کمرے سے نکلا تو ہاجرہ اُس کے پیچھے گئی۔

"ڈاکٹر صاحب جی!" — اُس نے ڈاکٹر کو پکارا اور اُس کے قریب جا رُکی۔

"کیا بات ہے؟" — ڈاکٹر نے رُک کر پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب جی!" — ہاجرہ نے پوچھا — "اس کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی؟"

"قسمت کی بات ہے" — ڈاکٹر نے جواب دیا — "شاید نہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب جی!" — ہاجرہ نے پوچھا — "کیا یہ ٹھیک ہے کہ ایک انسان کی آنکھیں دوسرے انسان میں لگائی جا سکتی ہیں؟"

"ہاں ہاں!" — میجر ڈاکٹر نے کہا — "لگائی جا سکتی ہیں۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔"

"پھر میری آنکھیں نکال لیں ڈاکٹر صاحب جی!" — ہاجرہ نے التجا کے لہجے میں کہا — "میری آنکھیں اقبال جی کو دے دیں۔"

ڈاکٹر نے چونک کر ہاجرہ کی آنکھیں دیکھیں پھر اُسے سَر سے پاؤں تک دیکھا۔

"تم اِن کی کیا لگتی ہو؟" — ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اُن کی نوکرانی ہوں" — ہاجرہ نے کہا — "آپ میری آنکھیں نکال لیں ڈاکٹر صاحب جی!"

"نہ لڑکی!" — میجر ڈاکٹر نے کہا — "زندہ انسان کی آنکھیں نہیں نکالا کرتے" — اور ڈاکٹر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نرس آ گئی۔ اُس نے ڈاکٹر کی لکھی ہُوئی ذہنی سکون اور نیند کی گولی دیکھی تو اُس نے دوائیوں کی جو ٹرے اٹھا رکھی تھی اس [illegible] سے ایک گولی [illegible] کو کھلا کر پانی [illegible] دیا [illegible] باہر نکلی تو ہاجرہ اُس کے پیچھے چلی گئی اور آ[illegible] روک لیا۔

"میم صاحب جی!" — اُس [illegible] التجا کی — "ڈاکٹر [illegible]ب جی سے کہ[illegible] [illegible] نکال کر اقبال جی کو لگا دیں۔"

نرس نے بھی ڈاکٹر کی طرح اُسے چونک کر دیکھا۔ ایک نظر اُس کی آنکھوں کو دیکھا۔

"اتنی خوبصورت آنکھیں؟" — نرس نے کہا — "نہیں... نہیں... یہ نہیں ہو سکتا" — اور نرس تیز تیز قدم اُٹھاتی چل پڑی۔

"میم صاحب جی!" — ہاجرہ نے اُسے پکارا پھر بلند آواز سے آواز دی — "میم صاحب جی..."

نرس کسی اور کمرے میں چلی گئی تھی۔ ہاجرہ جب اقبال کے کمرے میں آئی تو وہ مایوسی اور اداسی کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

"تم باہر چلی گئی تھیں ہاجو؟" — اقبال نے پوچھا۔

"ہاں جی!" — ہاجرہ نے جواب دیا۔

"اِس کمرے میں جی گھبراتا ہوگا تمھارا" — اقبال نے کہا — "جاؤ ذرا باہر گھوم پھر آؤ۔"

"نہیں اقبال جی!" — ہاجرہ نے کہا — "اتنے اچھے کمرے میں جی کیوں گھبرائے گا" — وہ چپ ہوگئی پھر التجا کے لہجے میں کہنے لگی — "اقبال جی! کیا یہ ٹھیک ہے کہ ایک انسان کی آنکھیں نکال کر دوسرے انسان میں لگائی جاسکتی ہیں؟"

"ہاں ہاجو!" — اقبال نے کہا — "یہ بالکل ٹھیک ہے... کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"تمھارے لیے پوچھ رہی ہوں نا!" — ہاجرہ نے کہا — "پر ڈاکٹر نہیں مانتا۔ میں نے اِس میم صاحب کو بھی کہا تھا جو تمہیں ابھی گولی دے کر گئی ہے... وہ بھی نہیں مانتی۔"

"کیا کہہ رہی ہو ہاجو!" — اقبال نے کہا — "ایسا کون ہوگا جو اپنی آنکھیں نکال کر مجھے دے گا۔ تم نے ڈاکٹر اور نرس کو یہی کہا ہوگا کہ کسی کی آنکھیں نکال کر مجھے لگا دیں" — اقبال کی ہنسی نکل گئی۔ کہنے لگا — "تم بہت سیدھی لڑکی ہو۔ ڈاکٹر میرے لیے کسی زندہ آدمی کی آنکھیں نہیں نکالیں گے۔"

"میں نے کسی اور کا تو نہیں کہا اقبال جی!" — ہاجرہ نے کہا — "میں نے انہیں کہا تھا کہ میری آنکھیں نکال کر آپ کو لگا دیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی کہا اور میں نے میم صاحب کو بھی کہا۔"

"اوہ پگلی ہاجو!" — اقبال نے پیار سے لہجے میں کہا — "نہ وہ تمھاری آنکھیں نکالیں گے نہ میں تمھاری آنکھیں لوں گا۔"

"اقبال جی!" — ہاجرہ اقبال کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اُس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بھکاریوں کے لہجے میں بولی — "لے لو نا اقبال جی میری آنکھیں۔"

اقبال نے اپنا دوسرا ہاتھ اٹھا کر ہوا میں ٹٹولا اور جب ہاتھ ہاجرہ کے سر پر پہنچ گیا تو اقبال ہاتھ اُس کے گالوں پر لے آیا۔

"تم رو رہی ہو ہاجو؟"

"روؤں نہ تو اور کیا کروں؟" — ہاجرہ نے کہا — "میں ان آنکھوں کا کیا کروں گی؟ اگر آنکھوں کی مجھے قیمت دینا چاہو تو اتنی سی قیمت دے دینا کہ اپنے گھر میں پڑی رہنے دینا۔ غریب کو کیا چاہیے؟ بس دو وقت کی روٹی۔"

اقبال کو دھچکا سا لگا اور اُس پر رقّت طاری ہوگئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ حلق میں اٹک کے رہ گئے۔ اُس کے سینے سے ایک احساس لہروں کی طرح اُٹھا اور اُسے یوں لگا جیسے وہ شکستہ کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگا ہو۔ کبھی اُسے محسوس ہوتا جیسے ہاجرہ نے اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپیڑ مارا ہو اور کبھی ایسے لگتا جیسے ہاجرہ نے اُس پر طنز کی ہو۔

"بولو نا اقبال جی!"— ہاجرہ نے کہا —"ڈاکٹر آئے گا تو اُسے کہہ دینا....."

"نہیں ہاجو!"— اقبال نے رقّت سے دبی ہوئی آواز میں کہا —"میں نے آنکھیں اپنے ملک پر..... خدا کی راہ میں..... سن رہی ہو ہاجو! میں نے آنکھیں قربان کر دی ہیں۔ دی ہوئی قربانی واپس نہیں لی جاتی ہاجو!"

"تم مانگ نہیں رہے اقبال جی!"— ہاجرہ نے کہا —"میں اپنی خوشی سے اپنی آنکھیں دے رہی ہوں۔ پر تم سوچتے ہو گے کہ غریبوں کی آنکھیں امیروں کے چہروں پر اچھی نہیں لگیں گی..... غریب کے پاس دینے کے لیے ہوتا ہی کیا ہے اقبال جی! اپنی جان دے دے گا..

..... تم قبول کر لو نا اقبال جی!"

ہاجرہ کے بولنے کا انداز اور لہجہ ایسا تھا جیسے وہ کچھ مانگ رہی ہو۔

"ہاجو!"— اقبال نے کہا —"انسان کچھ کھو کر پاتا ہے۔ میں نے وہ حاصل کر لیا ہے جس سے میں نا آشنا تھا"— اقبال ذرا چُپ ہوگیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہاجرہ اُس کی بات نہیں سمجھ سکے گی، وہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا، کہہ ڈالا —"میں خوش ہوں کہ اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ میں اب اُس اقبال کو نہیں دیکھ سکوں گا جو گناہگار تھا۔ وہ آنکھوں والا اقبال تھا جسے بدی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اُس سے نابینا اقبال اچھا ہے۔ آنکھوں کے اندھیرے میں اُسے اللہ کا نور نظر آتا ہے۔ یہ اقبال مجھے بند آنکھوں سے نظر آ رہا ہے..... مجھے نابینا رہنے دو ہاجو!"

ہاجرہ چُپ چاپ بیٹھی اقبال کے منہ کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"کہاں ہو ہاجو!"— اقبال نے ایک ہاتھ آگے کر کے ٹٹولا اور بولا —"تم یہیں ہو ہاجو!"

"ہاں جی!"

"چپ کیوں بیٹھی ہو؟"— اقبال نے کہا —"کچھ کہو ہاجو!..... میری باتیں سمجھ رہی ہو؟"

"کیا کہوں اقبال جی!"— ہاجرہ نے کہا —"میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ تمھاری آنکھیں نہیں ہیں اور میں تمھیں اپنی آنکھیں دینا چاہتی ہوں جو تم قبول نہیں کرتے۔ پھر بتاؤ نا، میں کیا کروں؟"

"دعا کرو ہاجو!"— اقبال نے کہا —"میرے لیے دعا کرو کہ میں اپنے آپ کو اندھا نہ سمجھنے لگ جاؤں..... ایک کام کرو ہاجو! باہر جاؤ۔ کوئی بھی نرس ملے تو اُس سے پوچھنا کیپٹن عصمت کا کمرہ کہاں ہے۔ وہ تمھیں مل جاتے تو کہنا آپ کو اقبال نے بلایا ہے"— ہاجرہ ابھی اقبال کی بات سن ہی رہی تھی کہ نرسنگ اردلی آ گیا۔ اقبال نے اُسے کہا کہ وہ کیپٹن عصمت کو بلا لائے۔

▼

اقبال اور عصمت کالج میں کلاس فیلو تھے۔ وہیں سے ان کی محبت شروع ہوئی تھی جو اس

حد تک پہنچی کہ انہوں نے شادی کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ عصمت نے اقبال کا فوٹو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ عصمت آرمی نرسنگ سروس کی افسر بنی اور اقبال لیفٹیننٹ بن گیا۔ اب اقبال زخمی ہو کر آیا تو اُسے توقع تھی کہ عصمت اُس کے کمرے سے نکلے گی نہیں بلکہ اُس کے بیڈ پر ہی بیٹھی رہے گی لیکن عصمت آئی اور اقبال کے ساتھ دو چار باتیں کر کے چلی گئی۔ اقبال کو عصمت کی مصروفیّت کا اندازہ تھا۔ وہ اُسے اپنے پاس بٹھانا نہیں چاہتا تھا لیکن رات کو وہ بیتاب ہو گیا اور اُس نے عصمت کو بلا بھیجا۔

اُس وقت عصمت لیفٹیننٹ لطیف کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے کچھ فراغت مل گئی تھی۔ اقبال کے کمرے میں جانے کی بجائے وہ لطیف کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"شمع پسند آئی آپ کو؟"— عصمت نے لیفٹیننٹ لطیف سے پوچھا —"آپ اسی کے ساتھ شادی کر رہے ہیں نا!"

"شمع؟"— لطیف نے حیران سا ہو کے پوچھا —"کہاں ہے شمع؟"

"وزیر آباد کی وہ لڑکی جو آپ کے کمرے میں رہ گئی ہے"— عصمت نے کہا —"لیفٹیننٹ اقبال کی بہن!"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"— لطیف نے کہا —"وہ کوئی اور تھی۔ اُس نے اپنا نام کچھ اور بتایا تھا"

کیپٹن عصمت نے قہقہہ لگایا اور لطیف کو بتایا کہ وہ شمع تھی اور اُس نے اپنا نام اس لیے کچھ اور بتایا تھا کہ وہ شرماتی تھی۔

"زندہ دل معلوم ہوتی ہے"— لطیف نے کہا —"میرے ساتھ اچھا خاصا مذاق کر گئی ہے۔ کہتی تھی کہ جس شمع کے ساتھ میری شادی ہو رہی ہے وہ بدصورت لڑکی ہے..... اقبال کا کیا حال ہے؟"— لیفٹیننٹ لطیف نے پوچھا —"شمع اُسے دیکھنے آئی ہو گی!"

"وہ تو گھر میں پڑی ہے"— عصمت نے کہا —"اُسے ٹائیفائڈ ہو گیا ہے..... اقبال کا حال آپ نے پوچھا ہے۔ اُس کی تو بینائی ختم ہو گئی ہے۔ چہرے پر ایک زخم ہے جو گہرا تو نہیں لیکن ٹھیک ہو جانے کے بعد زخم کا نشان بڑا بھدّا رہ جائے گا"

"کیا کوئی لڑکی اقبال کو قبول کر لے گی؟"— لیفٹیننٹ لطیف نے کہا —"شاید کوئی جذباتی لڑکی اسے قبول کر لے"

"کوئی جذباتی لڑکی اُسے قبول تو کر لے گی"— کیپٹن عصمت نے کہا —"لیکن جذباتی پن زیادہ دیر قائم نہیں رہا کرتا۔ ایک تلخ حقیقت کے سامنے جذبات شبنم کی طرح اُڑ جایا کرتے ہیں"

عصمت نے لطیف کو نہ بتایا کہ اقبال کے ساتھ اُس نے شادی کا عہد کر رکھا ہے۔ لطیف کے ساتھ ایک دو اور باتیں کر کے کمرے سے نکلی تو نرسنگ اردلی نے اُسے کہا کہ لیفٹیننٹ اقبال صاحب بلا رہے ہیں۔

"کیا کہتے ہیں؟"—— عصمت نے پوچھا —"کوئی تکلیف ہے؟"

"صاحب نے یہ نہیں بتایا"— نرسنگ اَردلی نے کہا۔

"صاحب سے کہنا میں بہت مصروف ہوں"— کیپٹن عصمت نے کہا —"صبح وقت ملا تو آؤں گی .... تم خیال رکھنا، اگر اقبال صاحب کو کوئی تکلیف ہوجائے تو نرس کو بتا دینا میرے پاس نہ آنا۔"

نرسنگ اَردلی نے لیفٹیننٹ اقبال کو یہی جواب دیا جو اُسے کیپٹن عصمت نے کہا تھا۔ اقبال کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں طنز تھی اور بے بسی بھی۔ اُس نے آہ بھری اور لیٹ گیا۔ اُس نے ہاجرہ کو بھی سو جانے کو کہا۔ ہاجرہ نے فرش پر گدّا بچھایا اور لیٹ گئی۔



ستمبر ۱۹۶۵ء میں فوجی ہسپتالوں میں دن رات کا تصوّر ختم ہوگیا تھا۔ سورج طلوع ہوتا تھا اور ڈوب جاتا تھا۔ رات کو زخمیوں کے وارڈوں اور کمروں میں دن جیسی سرگرمیاں رہتی تھیں۔ نعرے جو دن کو سنائی دیتے تھے وہ راتوں کو بھی گرجتے رہتے تھے۔ آپریشن ٹیبل کسی بھی وقت خالی نہیں رہتے تھے۔ ایمبولینس اور دوسری فوجی گاڑیاں زخمیوں کو دن رات لاتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر ایک لمحہ آرام کیے بغیر زخمیوں کے آپریشن اور مرہم پٹی میں لگے رہتے تھے۔

دن رات کا تصوّر محاذوں پر بھی ختم ہوگیا تھا۔ دشمن امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس سے اکٹھا کیا ہُوا گولہ بارُود بے دردی سے پھونک رہا تھا۔ اُس کی فوج اتنی زیادہ تھی کہ تازہ دم پلٹنیں جنگ میں جھونکتا جا رہا تھا۔ اِدھر پاکستان کے پاس جو کچھ تھا وہ سب داؤ پر لگا دیا گیا تھا۔ فالتو اسلحہ نہ تھا، ایمونیشن نہ تھا، نفری نہ تھی۔ ملک کے دفاع میں وہی نفری لڑ رہی تھی جو ۶ ستمبر کے روز محاذوں پر تھی۔ شہیدوں اور شدید زخمیوں نے اس نفری میں خاصی کمی کر دی تھی۔ وطن کے جاں نثار اس کمی کو جذبے کی شدت سے پورا کر رہے تھے۔ جنگی قوت گھٹتی جا رہی تھی، جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

دشمن کا اتنا شدید اور اتنا زوردار حملہ نہ صرف روک لیا گیا تھا بلکہ دشمن کا دم خم توڑ کر کئی محاذوں پر اُسے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ بعض محاذوں پر جنگ دشمن کے علاقوں میں لڑی جا رہی تھی۔ دشمن کے عزائم، اُس کی توقعات اور پاکستان کو تہ تیغ کر کے بھارت میں شامل کر لینے کے خواب اُس کی اپنی فوج کے خون میں ڈوب گئے تھے۔ دشمن اب خفّت مٹانے کے لیے لڑ رہا تھا اور فائر بندی کے لیے واویلا بپا کیے ہُوئے تھا۔

پاکستان کی فضاؤں میں اب دشمن کے طیّارے کم ہی نظر آتے تھے۔ پاک فضائیہ کے شہبازوں نے انڈین ایئر فورس کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ پاکستان کی فضا جنگی ترانوں سے مرتعش ہوتی رہتی تھی۔

ہاجرہ کی آنکھ بہت سویرے کُھل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور لیفٹیننٹ اقبال پر جھک گئی جو گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ رات کو ڈاکٹر اُسے نیند کی گولی دے گیا تھا۔ ہاجرہ اُسے دیکھتی رہی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"فکر نہیں ناں صاحب فکر نہیں"—— اقبال نیند میں بڑبڑایا——"اِدھر سے دشمن ایک قدم آگے نہیں آسکتا۔"

ہاجرہ کھڑی سنتی رہی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اقبال خواب میں محاذ پر پہنچا ہُوا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد اقبال کی آنکھ کُھل گئی اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے ہاجرہ کو آواز دی۔

"تمھارے پاس کھڑی ہوں اقبال جی!"—— ہاجرہ نے کہا۔

"غسل خانے تک لے چلو"— اقبال نے کہا۔

ہاجرہ نے ایک بازو اُس کی کمر کے گرد لپیٹ کر دوسرا ہاتھ اُس کی بغل میں رکھا۔

"نہ ہاجو!"— اقبال نے کہا —"میں اٹھنے اور چلنے سے تو معذور نہیں ہُوا خود اٹھوں گا۔ رات کی طرح مجھے غسل خانے تک پہنچا دو۔ میرا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لو۔"

اقبال اٹھا۔ ہاجرہ نے اُس کا بایاں ہاتھ اپنے دائیں کندھے پر رکھ لیا اور اُسے غسلخانے میں چھوڑ آئی۔

اُسے جب ہاجرہ واپس لائی اور بیڈ پر بٹھایا تو کیپٹن عصمت آگئی۔

"ہاجو!"—— اقبال نے ہاجرہ سے کہا——"تم برآمدے میں جا کر بیٹھو، میں تمھیں بلا لوں گا۔"

ہاجرہ نوکرانی تھی۔ اُسے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے کے فرش پر بیٹھ گئی۔

"رات مجھے کیوں بلایا تھا؟"—— عصمت نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں بیگانگی سی تھی۔

"تم آئی کیوں نہیں تھیں؟"—— اقبال نے پوچھا ——"اُس وقت مصروف تھیں تو بعد میں آجاتیں۔"

اقبال نے عصمت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ عصمت کو اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا لیکن عصمت ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

"میری اگر ضرورت نہ ہو تو میں جاؤں؟"—— عصمت نے پوچھا۔

اقبال پر رومانی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ رات کو اقبال نے عصمت کو اسی لیے تو بلایا تھا۔ اقبال کا ہاتھ آگے بڑھا ہُوا ہوا میں ٹٹول رہا تھا اور عصمت اس ہاتھ سے پرے ہٹ گئی تھی۔ ایک وقت تھا کہ عصمت اس ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ مسلا کرتی تھی۔ کبھی اس ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر دبایا کرتی تھی مگر آج یہ ہاتھ اُسے ڈھونڈ رہا تھا اور وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"کہاں ہو عصمت!"—— اقبال نے کہا۔

"یہیں ہوں"—— عصمت نے خشک سے لہجے میں کہا۔

"میرے پاس بیٹھو نا!" — اقبال نے رومانی سے لہجے میں کہا — "نوکرانی کو میں نے باہر بھیج دیا ہے۔ دروازہ کھلا ہے تو بند کر دو۔"

"بیٹھنے کی فرصت ہی کہاں ہے میرے پاس!" — کیپٹن عصمت نے کہا۔

"عصمت!"

"ہوں۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" — اقبال نے پوچھا — "مجھے تو امید تھی کہ تمہیں پتہ چلے گا کہ اقبال زخمی ہو کر آیا ہے تو تم اُڑ کر پہنچو گی اور میرے کمرے سے نکلا ہی نہیں کرو گی لیکن تم تو..."

"میں بہت مصروف ہوں لیفٹیننٹ اقبال!" — کیپٹن عصمت نے کہا — "تمہیں کوئی تکلیف ہے تو وہ مجھے بتاؤ۔ میں انتظام کر دوں گی۔"

"اوہ!" — اقبال نے دبی دبی آواز میں کہا — "کیپٹن عصمت بول رہی ہے۔ میں تو عصمت سے بات کرنا چاہتا تھا... صرف ایک بات بتا دو۔ ڈاکٹر میری بینائی کے متعلق کیا کہتے ہیں؟"

"ڈاکٹروں کی رپورٹ مایوس کُن ہے" — عصمت نے کہا — "دونوں آنکھیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہیں۔"

"عصمت!" — اقبال نے پوچھا — "تمہارے اس خشک رویے سے میں کیا سمجھوں؟"

"تم جو کچھ بھی سمجھتے ہو سمجھتے رہو" — عصمت نے کہا — "میں نے تو یہ کہا ہے کہ تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہیں۔"

"تم مجھے یہ احساس دلا رہی ہو کہ میں اندھا ہو گیا ہوں" — اقبال نے کہا — "مجھ سے پلو چھڑانے کا یہ طریقہ اچھا ہے عصمت! میں تمہیں اس امتحان میں کبھی نہیں ڈالوں گا کہ ایک اندھے کے ساتھ شادی کر لو، اندھا بھی وہ جس کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔ میری آنکھیں ہی نہیں میری سروس بھی ختم ہو گئی ہے۔ میرا گزارہ اب اُسی پہ ہو گا جو مجھے حکومت دے گی۔ فوج مجھے ویسے ہی اٹھا کر باہر نہیں پھینک دے گی۔"

"ہاں ہاں اقبال!" — عصمت نے کھسیانے سے لہجے میں کہا — "فوج تمہیں بہت کچھ دے گی۔ معذوری کی پنشن دے گی۔ اور بھی کچھ دے گی...."

"مجھے ستارۂ جرأت بھی مل رہا ہے عصمت!" — اقبال نے کہا — "لیکن میں کسی تمغے کے لیے اور کسی انعام کی خاطر نہیں لڑا، اور عصمت! مجھے اپنی بینائی ختم ہونے کا کوئی غم نہیں۔ اگر میں کہوں کہ آنکھیں بے نور ہو جانے سے میری روح روشن ہو گئی ہے تو تم ہنس پڑو گی اور کہو گی کہ اقبال! تم ایسے تو نہیں ہوا کرتے تھے.... خدا نے میری آنکھیں قبول کر کے مجھے اپنے قریب کر لیا ہے۔ تم مجھے پہلے والا، کالج والا اقبال سمجھ رہی ہو.... نہیں عصمت! اُس اقبال کو میں سرحد کی مٹی میں دفن کر آیا ہوں۔ یہ اقبال جسے تم دیکھ رہی ہو اس نے توپوں اور ٹینکوں کی گولہ باری اور ہوائی جہازوں کی بمباری کے دھماکوں سے جنم لیا ہے۔ یہ اقبال بغیر آنکھوں کے دیکھ سکتا ہے، بغیر زبان کے بول سکتا ہے، بغیر کانوں کے سن سکتا ہے۔

"نہیں اقبال!" — عصمت نے کہا — "میں نے تمہارے جذبے کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ میں یہ ضرور کہوں گی کہ تمہاری یہ باتیں ابنارمل سی لگتی ہیں۔ تم واقعی بدل گئے ہو۔ میں نہیں سمجھ سکتی تم کس طرح بدل گئے ہو۔"

"ہاں عصمت!" — اقبال نے کہا — "میں خود اپنے آپ کو ابنارمل لگتا ہوں.... میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ میں کس طرح بدل گیا ہوں۔ دشمن کے گولے جو پاکستان کی زمین پر گرتے تھے وہ مجھے یوں لگتے تھے جیسے میرے سینے میں پھٹ رہے ہوں۔ ایک احساس تھا جو بیدار ہو گیا، ایک جذبہ تھا جو اُمڈ پڑا اور ان دونوں نے اُس اقبال کو جان سے مار ڈالا جس کے ساتھ تم نے کالج میں محبت کی تھی۔ تم اس اقبال کے ساتھ محبت نہیں کر سکو گی جو تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ کھل کر بات کرو عصمت! صاف کہہ دو کہ تم ایک اندھے کے ساتھ شادی نہیں کرو گی۔ ایسی بے رخی کی حرکتیں کر کے نہ مجھے دھوکہ دو نہ اپنے آپ کو۔"

عصمت چُپ چاپ سن رہی تھی۔ اُس کی زبان اکڑ سی گئی تھی۔

"تمہیں اُس اقبال کے ساتھ شادی نہیں کرنی چاہیے تھی جو تمہارے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا" — اقبال کہہ رہا تھا — "وہ بدکار، عیاش، بے اعتبار اور کلی کلی کا رس چوسنے والا کالا بھنورا تھا۔ ایسے خاوند بے وفا ہوتے ہیں.... میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا عصمت! میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ تم آنکھوں والی ہو لیکن تمہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ مجھے دیکھنے کے لیے روح کی آنکھوں کی ضرورت ہے۔ یہ آنکھیں میری اس نوکرانی کے پاس ہیں....

"ایک اور بات سناؤں.... اُکتا تو نہیں جاؤ گی؟ یہ میری نوکرانی ہے۔ اس کی خوبصورتی تم نے دیکھی ہے؟ میں نے اس پر بھی جال پھینکا تھا لیکن ہاتھ نہ آئی۔ میں نے اسے دس دس کے نوٹ دیئے تھے جو اس نے میرے منہ پر دے مارے تھے۔ میں اسے ہمیشہ انہی نظروں سے دیکھتا رہا اور میں نے اسے اِس کمرے میں بھی دیکھا ہے۔ میں نے اِسے بغیر آنکھوں کے دیکھا ہے۔ اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں کو پکڑتے ہیں، اس کا جسم میرے جسم کے ساتھ لگتا ہے۔ اس کے گال میرے گالوں کے ساتھ لگتے ہیں لیکن اس کے لمس میں تقدّس ہے۔ اس کے جسم کو میں قابلِ احترام سمجھتا ہوں۔ میں نے اس جیسی، تم جیسی، پاکستان کی ہر عورت جیسی ایک عورت کی لاش بی آر بی میں بہتی دیکھی تھی۔ اُس لاش نے ایک بچے کی لاش کو اپنے مُردہ سینے کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ اُس لاش کی کھلی ہوئی آنکھیں مجھے دیکھتی آگے چلی گئی تھیں۔ پھر عصمت! میں نے ایک بچّی کی لاش دیکھی تھی جو توپ کے گولے سے شہید ہوئی تھی۔ اُس کی بھی آنکھیں کھلی تھیں اور مجھے دیکھ رہی تھیں.... ان مُردہ آنکھوں نے میری روح کی آنکھیں کھول دیں۔"

"تم نے ایسی باتیں کیوں شروع کر دی ہیں؟" — کیپٹن عصمت نے پوچھا۔

"تمہارے رویّے سے مجبور ہو کر!" — اقبال نے کہا — "جاؤ عصمت! میں تم سے ایسی

قربانی نہیں مانگوں گا کہ تم ایک اندھے سے شادی کر لو۔ میرے لیے محبت کا تصوّر بدل گیا ہے۔"

کیپٹن عصمت آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے نکل گئی۔ اقبال اُس کے قدموں کی چاپ سنتا رہا اور ہنس پڑا۔

"ہاجو!" — اُس نے آواز دی۔

ہاجرہ دوڑی آئی اور اُس کے پیچھے پیچھے ناشتہ آ گیا۔ ہاجرہ نے ناشتہ لانے والے کے ہاتھ سے ٹرے لے کر اقبال کے بیڈ پر رکھ دی اور ٹوسٹ پر مکھن اور جام لگانے لگی۔

"ہاجو!"

"جی!"

"اپنے لیے بھی چائے بنا لو" — اقبال نے کہا — "اور ناشتہ میرے ساتھ کرو۔"

"ایسے اچھا تو نہیں لگتا نا اقبال جی!" — ہاجرہ نے معصوم سے لہجے میں کہا۔

"مجھے ایسے ہی اچھا لگتا ہے ہاجو!" — اقبال نے کہا۔

▼

ناشتے کے کچھ دیر بعد اقبال کا باپ، ماں اور کچھ قریبی رشتہ دار آ گئے۔ اقبال کی چھوٹی بہن اس لیے نہ آ سکی کہ شمع کو تیز بخار تھا۔ اقبال کے چہرے پر سورج کی تپش کے اثرات بڑے صاف تھے۔ رنگ گہرا سانولا ہو گیا تھا پھر بھی چہرے پر رونق تھی۔ اداسی اور یاسیت کا نام و نشان نہ تھا۔ اُس نے ہنستے ہوئے سب کا استقبال کیا۔

عورتوں نے اقبال کے بیڈ کو نرغے میں لے لیا۔ ہاجرہ اقبال کے باپ کو باہر لے گئی۔

"اقبال جی نہیں مانتے" — ہاجرہ نے اقبال کے باپ سے کہا۔

"کیا نہیں مانتے؟"

"میں نے انہیں کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو کہیں کہ میری آنکھیں نکال کر اقبال جی کو لگا دیں" — ہاجرہ نے کہا — "پر یہ نہیں مانتے۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے ہاجو بیٹی!" — اقبال کے باپ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "یہ کوئی ماننے والی بات تو نہیں۔"

اقبال کا باپ اسے رسمی یا جذباتی پیش کش سمجھ رہا تھا۔

"میں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا تھا" — ہاجرہ نے کہا — "وہ بھی نہیں مانتا۔ اقبال جی کو ایک نسیم صاحب دوائی دینے آتی ہے، میں نے اُسے بھی کہا تھا۔ اُس نے بھی میری بات نہیں سُنی.... آپ ڈاکٹر صاحب کو کہیں۔"

"نہ بیٹی!" — اقبال کے باپ کی آواز اکھڑ گئی۔ ہکلاتے ہوئے بولا — "نہ بیٹی.... نہیں ہاجراں بی بی!"

"میں ان آنکھوں کو کیا کروں گی!" — ہاجرہ نے پُرعزم اور بڑے ہی معصوم لہجے میں کہا — "اقبال جی جوان آدمی ہیں۔ انہوں نے بہت سارے کافروں کو مارا ہے۔"

"نہ بیٹی!" — اقبال کے باپ نے سنبھلی ہوئی آواز میں کہا — "کسی زندہ انسان کی آنکھیں نکال لینا گناہ ہے..... اپنے بیٹے کی خاطر کوئی باپ کسی کی بیٹی کو اندھا نہیں کرے گا.... تم میری بیٹی ہو ہاجو!"

صوبیدار اکبر علی کے بعد چوہدری کرامت دوسرا آدمی تھا جس نے ہاجرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے بیٹی کہا تھا۔ پہلے تو وہ حیران ہوئی پھر یہ حیرت ایک احساس بن گئی۔ احساس یہ کہ وہ دنیا میں بے کار شے نہیں اور اُس کی کچھ اہمیت اور قدر و قیمت ضرور ہے۔ اس احساس نے اُس کے دل میں کچھ کر گزرنے کی تڑپ کو اور زیادہ شدید کر دیا۔

اُس نے اقبال کی ماں سے بھی کہا کہ وہ اپنی آنکھیں اقبال کو دینا چاہتی ہے۔ ماں کا ردِّ عمل بھی اقبال کے باپ جیسا تھا۔

اقبال کو دیکھنے کے لیے وزیر آباد سے عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم آ گیا تھا۔ ہاجرہ باہر برآمدے میں فرش پر بیٹھ گئی۔ اُس کے ذہن میں اُس کی آنکھیں گھوم پھر رہی تھیں۔ افضال نے دو تین بار اُسے کہا تھا۔ ہاجرہ! تمہاری آنکھیں بہت ہی دل کش ہیں۔ ان میں تو جادو ہے.... اُسے یاد آ رہا تھا کہ اُسے چھیڑنے والے ایک لڑکے نے کہا تھا — "او ظالم، ان آنکھوں پر پردہ ڈال کے رکھو۔ یہ تو قتل کرتی ہیں۔"

ہاجرہ کو غصہ آنے لگا۔ اُسے اپنی آنکھیں بُری لگنے لگیں۔ اُسے جس طرح اُن آوارہ لڑکوں سے نفرت ہو گئی تھی اسی طرح اُسے اپنی آنکھوں سے نفرت ہونے لگی۔ اس قدر نشیلی آنکھیں اُسے چوری کا مال نظر آنے لگیں جیسے اُس نے اقبال کی آنکھیں چُرائی ہوں۔

اُسے ساتھ کے وارڈ سے محاذ کے زخمیوں کے نعرے سنائی دینے لگے۔ اُس کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ پھر اُسے فضا میں ایک گرج اور گرجدار زنّاٹہ سنائی دیا۔ اس آواز کو وہ پہچانتی تھی۔ پاک فضائیہ کے لڑاکا بمبار طیارے اوپر سے گزر گئے تھے۔

وہ سوچنے لگی کہ قوم کا ہر فرد کسی نہ کسی طرح جنگ میں شریک ہے۔ لوگ خون دے رہے ہیں، دفاعی فنڈ میں پیسے دے رہے ہیں، فوجیوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں اور تحفے بھیج رہے ہیں لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔ اُس کے سینے میں دھماکے ہونے لگے۔

وہ محاذ پر نہیں جا سکتی تھی۔
وہ انڈین ایئر فورس کے طیاروں کے پَر نہیں نوچ سکتی تھی۔
اُس کے پاس کپڑے نہیں تھے، فوجیوں کو دینے کے لیے تحفے نہیں تھے۔
وہ اپنے جسم کا سارا خون پاک فوج کی نذر کر سکتی تھی۔
وہ اپنی آنکھیں لیفٹیننٹ اقبال کو دے سکتی تھی۔

مگر اُس کی آنکھیں کسی نے قبول نہ کیں۔ اُسے یوں دُکھ ہوا جیسے اُس کی قربانی خدا نے ٹھکرا دی ہو۔ وہ تڑپ اٹھی اور اُس کے آنسو نکل آئے۔

اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے پاس کوئی کھڑا ہو۔ اُسے پاؤں نظر آئے۔ اُس نے اوپر

یکھا۔ وہ اقبال کا ماموں تھا اور اُس کے پاس اُس کی بیوی کھڑی تھی۔ ہاجرہ انہیں جانتی تھی دونوں اقبال کے گھر آیا کرتے تھے۔ گھر میں جو باتیں ہوتی تھیں ان سے ہاجرہ کو پتہ چلا تھا کہ اقبال کا ماموں اقبال کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے رہا ہے۔ آج ماموں اپنی بیوی کے ساتھ اقبال کو دیکھنے دوسرے رشتہ داروں کے ہجوم کے ساتھ آیا تھا۔ یہ دونوں کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ انہیں معلوم نہ ہوسکا کہ اُن کے قدموں میں اقبال کے گھر کی نوکرانی بیٹھی ہے۔ برآمدے میں زخمیوں کے واحقین کا ہجوم رواں دواں تھا۔

"بے چارہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا ہے" — اقبال کے ماموں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ساری عمر غارت گئی بے چارے کی!" — ماموں کی بیوی نے کہا — "ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"ڈاکٹروں نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ بینائی ماری گئی ہے" — ماموں نے جواب دیا۔

"اللہ کو یہی منظور تھا" — ماموں کی بیوی نے کہا — "لیکن میری ایک بات سُن لیں۔ اقبال کی ماں اقبال کے لیے ہماری بیٹی لے رہی تھی، بلکہ ہم دے رہے تھے لیکن اب نہیں"

"اسے ہسپتال سے تو نکل لینے دینا تھا" — اقبال کے ماموں نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

"میں آپ کو بہانے سے باہر لائی ہوں" — ماموں کی بیوی نے کہا — "میں ڈرتی ہوں کہ آپ جذبات میں آکر ہی کہہ دیں گے کہ اقبال پرواہ نہ کرو۔ اللہ مالک ہے۔ میں اپنی بیٹی تمہیں دے رہا ہوں.... یہ وقت جذبات کا ہی تو ہے لیکن ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ لڑکا اچھا تھا۔ فوج کا افسر تھا لیکن آنکھوں سے محروم ہو جانا.... اللہ توبہ!"

"میں اتنا بیوقوف تو نہیں" — ماموں نے کہا — "لیکن ذرا احتیاط کرنا۔ زبان کو قابو میں رکھنا۔ ابھی یہ لوگ افسوس میں ہیں جب کبھی ان کی طرف سے بات ہوئی تو جواب دے دیں گے.... اب اندر چلو"

ہاجرہ کے دل میں جیسے تیر اُتر گیا ہو۔ اُس کا خُون پہلے ہی اُبل رہا تھا، اب اُس کا سارا وجود جلنے لگا۔ اُس کے جی میں آئی کہ کمرے میں جا کر سب کے سامنے کہہ دے کہ اقبال کے ماموں اور اُس کی بیوی نے کیا کہا ہے لیکن وہ بہت سیدھی اور خاموش طبع لڑکی تھی۔ اُسے ڈھنگ سے بات کرنی بھی نہیں آتی تھی۔ وہ سوچ سکتی تھی بول نہیں سکتی تھی۔ اپنا خونِ جگر پی کے رہ گئی۔

شام کے بعد جب سب لوگ چلے گئے تو ہاجرہ اقبال کے پاس بیٹھ گئی۔

"اقبال جی!" — ہاجرہ نے کہا — "میری بات مان لو نا!"

"پھر وہی بات ہاجو!"

"اب وہی بات نہیں اقبال جی!" — ہاجرہ نے کہا — "اب کوئی اور بات ہے"

"اور کیا بات ہو گئی ہے؟"

ہاجرہ نے اقبال کو اُس کے ماموں اور اس کی بیوی کی وہ ساری باتیں سنا دیں جو انہوں نے ں کے پاس کھڑے ہو کر کی تھیں۔

اقبال ہنس پڑا اور اِس کے ساتھ ہی اُس کی آہ نکل گئی۔

"تمہاری ساری زندگی برباد جائے گی اقبال جی!" — ہاجرہ نے کہا — "مجھے ان دونوں پر بہت غصّہ آیا تھا۔ میرے دل میں آئی تھی کہ انہیں کہوں کہ تم اقبال جی کو بیٹی دینے سے انکار نہ کرو، میں اقبال جی کو اپنی آنکھیں دے دُوں گی، پر میں ایسی بات نہیں کہہ سکتی نا جی!"

"ضرورت ہی کیا ہے کہنے کی ہاجو!" — اقبال نے کہا — "یہ لوگ مجھے اندھا سمجھتے ہیں.... سمجھتے رہیں ہاجو! میں نے اپنے اللہ سے دل لگا لیا ہے.... اور دیکھو ہاجرہ! اب تم میرے ساتھ میری آنکھوں کے متعلق اور اپنی آنکھوں کے متعلق کوئی بات نہ کرنا"

"اقبال جی!" — ہاجرہ نے پوچھا — "یہ لڑائی کب تک ہوتی رہے گی؟"

اقبال نے اُسے جذباتی سا جواب دیا اور اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ جنگ فیصلہ کُن ہو گی اور فتح پاکستان کی ہو گی لیکن صورتِ حال کچھ اور ہوتی جا رہی تھی۔ لڑنے کا جذبہ ایک بنیادی ضرورت ہے لیکن اسلحہ اور ایمونیشن کے بغیر جذبہ بیکار ہوتا ہے۔ پاکستان کے حکمرانوں کا بھکاری پن محاذوں پر رنگ دکھانے لگا تھا۔ ایمونیشن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔

ہمارے حکمران ایک مدّت سے بھکاری بنے ہوتے تھے۔ امریکی امداد اُن کے منہ کو لگ گئی تھی اور امریکہ نے انہیں مانگنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اگر امریکہ سے صرف گندم اور مالی امداد ہی لی جاتی تو اور بات تھی، حادثہ یہ ہُوا کہ ہمارے حکمران دفاعی ضروریات کے لیے بھی امریکہ کے دستِ نگر ہو گئے۔ امریکہ نے کبھی چند ایک توپیں دے دیں تو پاکستان کے حکمران مطمئن ہو گئے کہ بس، کام ہو گیا۔ اب اپنا اسلحہ بارُود بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ کبھی وقت آن پڑا تو چچا سام فوجی سامان دے دے گا۔

اُدھر پاکستان کے خون کا پیاسا اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن اسلحہ بارُود سے اپنے سٹور بھرتا رہا اور اُس نے روس کے ساتھ دفاع کے معاملے میں معاہدہ کر لیا، اِدھر اقتدار کی سیاست چلتی رہی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے حربے استعمال ہوتے رہے۔ دفاع کی وزارت پر سیاسی لیڈر قابض رہے جو ملک کا نہیں صرف اپنی کرسی کا دفاع کرنا جانتے تھے۔ انہیں اقتدار کی رسّہ کشی میں ہوش ہی نہیں تھی کہ سرحد پار کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ پاکستان کے فضائی بیڑے میں امریکہ کے دیتے ہوتے قدیم طیارے تھے جو دشمن کے مقابلے میں بہت تھوڑے تھے۔

کسی بھی حکمران نے ضرورت محسوس نہ کی کہ اپنے دشمن کے عزائم کو اور اُس کی جنگی تیاریوں کو دیکھتے ہوئے تینوں مسلح افواج کی نفری ہی بڑھا دیتے۔ یہ تو فوج کا جذبہ تھا کہ اکیس ڈویژنوں کے مقابلے میں ساڑھے چار ڈویژن جم گئے اور قوم کا بچہ بچہ اپنی قلیل فوج کی پُشت پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر ہماری مسلح افواج اسلحہ کے بھروسے پر لڑتیں تو ایک دو دن ہی لڑ سکتیں لیکن انہوں نے بدر اور قادسیہ کی روایت کو تازہ کر دیا اور اتنے طاقتور دشمن کا حملہ پسپا کر دیا۔ یہ جذبے کا کرشمہ تھا مگر حقائق کو دیکھا جائے تو جنگ جنگی ترانوں اور بہادری کے تمغوں سے نہیں لڑی جا سکتی یا یوں کہئے کہ زیادہ عرصے تک نہیں لڑی جا سکتی۔

جس امریکہ پر پاکستان کے حکمرانوں نے بھروسہ کیا تھا کہ دفاعی ضروریات پوری کرے گا،
ں امریکہ نے فوجی امداد بند کر دی۔ فوجی امداد تو امریکہ نے بھارت کی بھی بند کر دی تھی لیکن
یکہ اُسے درپردہ اسلحہ بارُود دیتا رہا۔ اس کا ثبوت کھیم کرن کے کھیتوں میں ملا تھا۔ وہاں انڈین
ں پاک فوج کے جوابی حملے سے ایسی بے طرح بھاگی کہ ایمونیشن کے بند بکس پیچھے چھوڑ گئی۔
ں امریکہ سے آتے تھے اور ان پر پاکستان کا نام لکھا ہوا تھا، یعنی امریکہ سے یہ پاکستان
بھیجے جا رہے تھے لیکن بھارت کو دے دیتے گئے۔
دوسری مشکل یہ پیدا ہو رہی تھی کہ ہمارے حکمران جن بڑی طاقتوں کا دیا کھاتے رہے
تھے وہ فائر بندی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھیں۔ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ فتح مسلمانو
ں ہو۔ یہ طاقتیں درپردہ بھارت کے ساتھ تھیں۔ ہمارے حکمرانوں میں اتنی اخلاقی جرأت
ں تھی کہ آزادانہ کوئی فیصلہ کر سکتے۔ وہ کس بل بوتے پر آزادانہ فیصلہ کرتے؟ انہوں نے
غیرملکی امداد اور قرضوں کے عوض پاکستان کا وقار اور قومی عزت گروی رکھی ہوئی تھی

اس بے بسی کی ایک مثال چونڈہ میں سامنے آئی۔ ۱۸/۱۹ ستمبر تک چونڈہ کے میدان
ں پاک فوج کے تھوڑے سے ٹینکوں نے بھارت کے آرمرڈ ڈویژن کو بیکار کر دیا تھا۔
کستان کے آرمرڈ ڈویژن کے کمانڈر نے دشمن پر جوابی حملے کا پلان بنایا اور منظوری کے
لیے ہائی کمانڈ کو بھیجا۔ اس پلان کے ساتھ ہائی کمانڈ کو بتایا گیا تھا کہ دشمن کی یہ حالت ہو گئی
ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا۔ اگر اس پر فوری طور پر حملہ کیا جائے تو
سے نہ صرف سرحد سے دُور پیچھے دھکیلا جا سکتا ہے بلکہ ہم پٹھانکوٹ تک پہنچ سکتے
یں، مگر پاکستان کے اُس وقت کے صدر نے حملے کی منظوری نہ دی۔
غیرملکی نامہ نگاروں نے لکھا تھا کہ پاکستان نے جوابی حملے کا پلان بنایا تھا مگر حملہ سیاسی
وجوہ کی بنا پر روک لیا گیا۔ یہ سیاسی وجوہ وہ مجبوریاں تھیں جو ہمارے اقتدار پرست حکمرانوں
نے اپنے لیے خود پیدا کی تھیں اور پاکستان کی قسمت امریکہ کے ہاتھ میں دے رکھی تھی۔ وہ
تو ہم سے فائر بندی کرا رہے تھے، جوابی حملے کی وہ کیسے اجازت دے دیتے!



فائر بندی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ دن اور وقت کا ابھی تعیّن نہیں ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ
ہی بھارت نے قصور کھیم کرن سیکٹر اور لاہور سیکٹر میں تازہ دم فوج جھونک دی۔ مقصد یہ تھا کہ
فائر بندی سے پہلے پہلے پاک فوج سے کھیم کرن کا قصبہ اور ارد گرد کا علاقہ واپس لیا جائے اور پاک
فوج کو بھارتی علاقے سے نکالا جائے۔ بھارتیوں کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ لاہور سیکٹر پر اتنا زیادہ
دباؤ ڈالا جائے کہ پاک فوج کا یہ ڈویژن پیچھے ہٹ جائے اور انڈین آرمی بی آر بی نہر پار کر
کے شالیمار تک کے علاقے پر قابض ہو جائے تاکہ پاکستان سے اپنی شرطیں منوائی جا سکیں۔
یہ دباؤ اس قدر زیادہ تھا کہ پاک فوج کے تھکے ہوئے افسروں اور جوانوں کے لیے
ناقابلِ برداشت ہُوا جا رہا تھا۔ پاکستان کے پاس کوئی تازہ دم فوج نہیں تھی۔ جو کچھ تھا وہ دا

پر لگا دیا گیا تھا۔ اب تو سرحدوں کے رکھوالے روح اور جذبے کے زور پر لڑ رہے تھے۔ انہوں نے دشمن پر واضح کر دیا تھا کہ پاک فوج کا ایک بھی جوان زندہ رہا تو وہ دشمن کو بی آر بی کے قریب نہیں آنے دے گا۔

جذبہ ایک جنون بن گیا تھا۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں تھی کہ شدید زخمیوں نے پیچھے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ توپ یا ٹینک کے گولے کے بڑے ٹکڑے سے ایک ہاتھ اُڑ گیا اور جوان نے زخم پر فیلڈ پٹی باندھ کر اوپر تولیہ لپیٹ لیا تاکہ اُسے پیچھے نہ بھیج دیا جائے۔ دشمن کے ٹینکوں کے سامنے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر کھڑے ہو کر راکٹ لانچر فائر کرنے کی مثالیں بھی سامنے آئیں۔ ٹینک کی مشین گن فائر ہوتی، اِدھر سے جوان نے راکٹ فائر کیا۔ اُدھر ٹینک تباہ ہُوا اِدھر جوان شہید ہو گیا۔

جوان اب کھانا نہیں مانگتے تھے، پانی نہیں مانگتے، وہ صرف ایمونیشن مانگتے تھے۔ محاذوں پر ہر قسم کے ایمونیشن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ دشمن آخری حربے کے طور پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ اُس کی حالت زخمی درندے کی سی ہو گئی تھی جو باؤلا ہو کر مرنے سے پہلے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اپنے ریئر ایشلان کو اگلے مورچوں سے صرف یہی پکار سنائی دیتی تھی ـــ "ایمونیشن .... فوراً .... ایمونیشن"۔



دوسرے دن لیفٹیننٹ اقبال کو دیکھنے اُس کے ماں باپ، چھوٹی بہن اور رشتہ دار آئے تو بہن نے ضِد کی کہ وہ اپنے بھائی جان کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ اُس کے جذبات تھے جنہیں دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کپڑوں کے فالتو جوڑے لے کر گئی تھی۔ شام کو سب واپس آنے لگے تو ہاجرہ کو ساتھ لے آئے۔ اقبال کی بہن اقبال کے پاس رہ گئی۔

اُس شام سورج غروب ہونے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے راولپنڈی ریلوے سٹیشن سے ایک بڑی لمبی مال گاڑی روانہ ہوئی۔ اسے لاہور تک رَن تھرُو ہونا تھا۔ اس کے ڈرائیور کو سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ کسی بھی جگہ رفتار کم نہ کرے اور ہوائی حملے کی صورت میں رفتار اور تیز کر دے تاکہ دشمن کے طیاروں کو سُست یا ساکن ٹارگیٹ نہ ملے۔ اُسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ گاڑی میں تین ٹینک بھی جا رہے ہیں۔ ان میں طیارہ شکن مشین گنیں ہیں اور ہوائی حملے کی صورت میں گنر طیاروں کا مقابلہ کریں گے۔ گاڑی کے ساتھ ایک حفاظتی پارٹی بھی جا رہی تھی۔

چند ہی دن پہلے پاک فضائیہ کے ہوابازوں نے دشمن کی اسی قسم کی ایک مال گاڑی گورداسپور کے ریلوے سٹیشن پر اور ایک دھاریوال کے مقام پر تباہ کر دی تھی۔ یہ دونوں گاڑیاں گولہ بارُود سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی تباہی نے بھارتی مورچوں کو خاصا کمزور کر دیا تھا۔ انڈین ایئر فورس کے ہوابازوں نے بہت کوشش کی کہ پاکستان کی کوئی ریل گاڑی تباہ کریں۔ ان کے جاسوس ان کی رہنمائی بھی کرتے رہے اور انہیں گاڑیوں کا صحیح وقت بھی بتاتے رہے لیکن وہ کسی بھی گاڑی پر کامیاب حملہ نہ کر سکے تھے۔

اب یہ کام کرنل گپتا نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور لاہور سے راولپنڈی تک کے جاسوسوں کو کہہ دیا تھا کہ اُدھر سے کوئی بھی گولہ بارود کی گاڑی چلے، اُس کا وقت نوٹ کرو اور اُسے خود ہی ڈائنامیٹ سے تباہ کرو۔ چنانچہ بھارتی جاسوس ہماری گاڑیوں کی ٹوہ میں لگے ہوتے تھے۔ آخر اس شام راولپنڈی سے گاڑی چلی تو اُن کی نظر میں آ گئی۔ انہوں نے راولپنڈی سے وزیر آباد تک اس کا صحیح وقت نوٹ کر لیا۔ وزیر آباد تک اس لیے کہ تباہ کار جاسوسوں نے وہیں کہیں اپنا خفیہ اڈہ بنا رکھا تھا۔

جاسوسوں کو اس گاڑی کے متعلق اشارہ تک نہ ملتا۔ گاڑی کے ڈبوں کو ریلوے سٹیشن پر بکھیر کر مختلف جگہوں پر ان میں گولہ بارود لادا گیا تھا۔ صرف ٹینک اور توپیں تھیں جو سب کو نظر آ سکتی تھیں۔ ایمونیشن نہایت ڈھکے چھپے طریقے سے لادا گیا تھا لیکن ریلوے کا ایک کلرک تھا جسے جنگ کے دوران سنسنی خیز خبریں سنانے کا خبط تھا۔

"کل صبح پاک فوج کھیم کرن سے جالندھر پر حملہ کر رہی ہے" — اس بابو نے اپنی بیوی کو یہ خبر سنائی — "ادھر لاہور سے جوابی حملہ ہو گا اور امرتسر پر قبضہ کیا جائے گا اور ایک ہفتے کے اندر اندر پاک فوج دِلّی پہنچ جائے گی۔ آج رات باون ڈبوں کی مال گاڑی گولہ بارود سے لدی ہوئی لاہور جا رہی ہے۔ اس میں ٹینک بھی ہیں، توپیں بھی ہیں۔"

بیوی نے پڑوسن کو بتایا اور کہا — "ساٹھ ڈبوں کی مال گاڑی گولے اور توپیں لاہور لے جا رہی ہے۔ مُنّے کے ابّا کو ایک فوجی افسر نے بتایا ہے کہ کل صبح ہماری فوج امرتسر اور جالندھر پر حملہ کرے گی۔"

پڑوسن نے آگے چلائی اور چلتے چلتے بات محلے سے نکل کر قریبی ہوٹل میں پہنچ گئی۔ وہاں تک بات پہنچانے والے نے اپنے آپ کو اہم اور باخبر شخصیّت ثابت کرنے کے لیے بلاخوفِ تردید کہا — "میرا چچازاد بھائی میجر ہے۔ اس وقت واہگہ سیکٹر میں ہے۔ ابھی ابھی اُس کا خط آیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ کل تک امرتسر ہمارے قبضے میں ہو گا اور یہ بھی کہ ریلوے کا سٹاف امرتسر جا رہا ہے۔ ستّر، اسّی ڈبوں کی مال گاڑی بم، گولے، ٹینک، توپیں اور پٹرول لے کر پنڈی سے روانہ ہونے والی ہے۔"

یہ خبر ہوٹل میں پھیل گئی اور سب نے سچ مان لی۔ کسی نے بھی نہ سوچا کہ واہگہ سیکٹر میں لڑنے والے کسی میجر کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ خط لکھ سکے اور نہ کوئی پاکستانی میجر جنگی سکیمیں اپنے رشتہ داروں کو بتایا کرتا ہے۔

ہوٹل میں ایک جواں سال آدمی کھانے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ ادھر یہ خبر اُس کے کان میں پڑی اُدھر بیرے نے اُس کے سامنے کھانا لا رکھا۔ وہ آدمی کھانے کی طرف دھیان دیئے بغیر اٹھا اور ہوٹل سے نکل گیا۔ بیرے نے سوچا شاید ہاتھ دھونے گیا ہے لیکن وہ لَوٹ کے نہ آیا۔ ہوٹل کے عادی گپ بازوں نے ذرّہ بھر دھیان نہ دیا کہ ایک اجنبی صورت آدمی ان کی باتوں کو ذہن نشین کر کے بڑے ہی خطرناک ارادے سے کھانا کھائے بغیر ہوٹل سے اُٹھ گیا ہے۔

ذرا سی دیر بعد وہ آدمی ریلوے سٹیشن کے پُل پر کھڑا ایک کتاب پڑھ رہا تھا مگر کسی کو علم نہ تھا کہ اُس کے ہلتے ہونٹ کتاب نہیں پڑھ رہے بلکہ جالندھر کے انٹیلی جنس ہیڈکوارٹر کو گاڑی کی تفصیلات اور اس کی روانگی کا وقت بتا رہے ہیں۔ گاڑی اُس کی نظروں کے سامنے تھی اور چلنے کو تیار تھی۔



چند لمحوں میں راولپنڈی سے لاہور تک پھیلے ہوئے بھارتی جاسوسوں کو اس گاڑی کی اطلاع مل گئی۔ وہ گاڑی کو کسی بھی مقام پر تباہ کر سکتے تھے لیکن جن جاسوسوں کے پاس ڈائنامیٹ اور ڈیٹو ایکسپلوڈر تھا وہ وزیر آباد کے علاقے میں تھے کیونکہ وہ کئی روز سے چناب کے پُل کو اُڑانے کی فکر میں تھے لیکن پُلوں پر پہرے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اب راولپنڈی کے جاسوسوں نے انہیں خبردار کر دیا کہ مال گاڑی آ رہی ہے۔ انہوں نے انجن کا نمبر بھی بتا دیا تھا، رفتار بھی بتا دی اور وزیر آباد سٹیشن پر پہنچنے کا وقت بھی بتا دیا۔ انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس گاڑی کو وزیر آباد سے آگے نہ جانے دیں۔

اس گاڑی میں ہر طرح کا چھوٹا بڑا ایمونیشن تھا۔ ورکشاپ سے نکلے ہوئے تین ٹینک اور چار میڈیم توپیں بھی اسی گاڑی میں جا رہی تھیں اور اسی گاڑی کے ساتھ پانچ پٹرول ٹینک بھی تھے۔ پاکستانی ایک ہی گاڑی میں اس قدر مختلف اور اس قدر زیادہ سامان بھیجنے کی غلطی کرنے والے نہیں تھے۔ یہ بھی غلطی تھی کہ تیل پٹرول اور ایمونیشن والی ریل گاڑی دن کو چلا دی گئی تھی۔ ایسی مال گاڑیاں رات کو چلائی جاتی تھیں تاکہ دشمن کے ہوائی حملوں سے محفوظ رہیں لیکن محاذوں کی ضرورت کے پیشِ نظر اتنا بڑا خطرہ مول لینا پڑا۔ فضائیہ کے دو طیاروں کو اس گاڑی کی حفاظت کے لیے بھیج دیا گیا تھا جو گاڑی کے اُوپر اُوپر چکر میں اُڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دو تازہ دم طیارے آ جاتے اور پہلے طیارے واپس چلے جاتے تھے۔ پُلوں پر پولیس اور فوج کے پہرے تھے لیکن کوئی بھی نہ دیکھ سکا کہ وزیر آباد کے قریب بھارتی جاسوسوں نے گاڑی کو تباہ کرنے کا سامان تیار کر رکھا ہے۔

یہ مال گاڑی راولپنڈی سٹیشن سے نکل کر ابھی دو تین میل ہی گئی ہو گی کہ ہوا کی لہروں پر تیرتی ہوئی اطلاع جالندھر کرنل گپتا کے ہیڈکوارٹر میں پہنچ گئی کہ ایک اہم مال گاڑی راولپنڈی سے نکل گئی ہے۔

کرنل گپتا کو اپنے جاسوسوں پر کوئی ایسا بھروسہ نہیں تھا کیونکہ وہ جنگ کے اتنے دنوں میں پاکستان میں کوئی نمایاں تباہی نہیں کر سکے تھے۔ اُس نے انہیں اس گاڑی کو تباہ کرنے کی ہدایت دے دی لیکن انڈین ایئر فورس کے ڈائریکٹر آف آپریشن کو بھی ٹیلی فون کیا اور اُسے راولپنڈی کے جاسوسوں کی رپورٹ کے مطابق بتایا کہ رات کو فلاں وقت ایک لمبی مال گاڑی وزیر آباد اور جہلم کے درمیان ہو گی، اسے تباہ کرنے کے لیے چار لڑاکا بمبا[illegible] ہیں۔

ڈائریکٹر آف آپریشن نے پٹھانکوٹ، ہلواڑہ اور آدم پور کے ہوائی اڈوں [illegible] وقت کی

کیفیت کا جائزہ لیا تو اُسے معلوم ہُوا کہ ہلواڑہ اور آدم پور کے رَن وے پاک فضائیہ کی بمباری سے بیکار ہیں۔ پٹھانکوٹ کی کیفیت بھی تسلّی بخش نہیں تھی۔ صرف انبالہ کا ہوائی اڈہ مکمل طور پر صحیح سلامت تھا جہاں کم و بیش پچاس لڑاکا بمبار طیارے موجود تھے لیکن اُس رات اُن طیّاروں کا مشن کچھ اور تھا۔ انہیں اُس رات سرگودھا کے ہوائی اڈے پر فیصلہ کُن حملہ کرنا تھا۔

انڈین ایئر فورس سرگودھا کے ہوائی اڈے کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کر چکی تھی لیکن یہ کوشش اُسے بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ ۷ ستمبر کے پہلے ہی حملے میں پاک فضائیہ کے شاہبازوں نے دشمن کے گیارہ طیارے گرا لیے تھے۔ اس کے بعد بھارتی ہوابازوں کو دن کے وقت سرگودھا پر حملے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ رات کے وقت غول در غول آتے رہے مگر پاک فضائیہ کے اس عظیم اڈے پر خراش تک ڈالے بغیر اپنے ایک دو طیارے ہر رات دے جاتے رہے۔

اُس رات جب ایمونیشن کی گاڑی راولپنڈی سے چلی، انڈین ایئر فورس کے اکیس لڑاکا بمبار طیارے انبالہ کے ہوائی اڈے پر ... تن میں کھڑے تھے اور ان کے ہوابازوں کو سرگودھا پر حملے کی ہدایات دی جا رہی تھیں۔ ... بتایا جا رہا تھا کہ وہ راکٹوں اور ہزار ہزار پونڈ کے بموں کے علاوہ نیپام (آگ پھیلانے والے) بم بھی لے جا رہے ہیں۔ انہیں چھ چھ کے غول میں رات بھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے سرگودھا پر حملہ کرنا تھا۔

اتنے میں کرنل گپتا کا فون چلا گیا تو ڈائریکٹر آف آپریشن نے اُسے جواب دیا کہ چار کینبرا طیارے پاکستانی گاڑی کو وزیر آباد سے پرے تباہ کر دیں گے۔ اُس نے سرگودھا کے حملے کی ہدایات کو ذرا سی دیر کے لیے ملتوی کر کے کینبرا اسکواڈرن کے چار ہوابازوں کو بُلایا اور انہیں نقشے پر جہلم سے لاہور تک کی ریلوے لائن دکھا کر ہدایت دی کہ ایک مال گاڑی آ رہی ہے۔

"اس گاڑی کی نشانی یہ ہے کہ اس پر چار ٹینک لدے ہوتے ہیں اور چار پٹرول ٹینک بھی ہیں" اُس نے اپنے ہوابازوں سے کہا۔ "گاڑی کا انجن ڈیزل نہیں ہے۔ ٹینک کا موفلاژ نہیں ہیں۔ رات چاندنی ہے۔ ایک ہزار فٹ کی بلندی سے پہچان سکو گے۔ غلط گاڑی کو ہٹ کر کے نہ آجانا۔ یہ تمام گاڑی ایمونیشن سے بھری ہوتی ہے۔ اگر یہ گاڑی لاہور سے پرے ختم ہو گئی تو انڈین آرمی کھیم کرن واپس لے سکتی ہے۔ ورنہ یاد رکھو، جالندھر بھی خطرے میں ہے۔ تم مشین گن اور راکٹ استعمال کرو گے۔ اگر طیاروں میں بم لگے ہوتے ہیں تو اُتروا دو۔ اگر ٹارگیٹ اچھی طرح نظر نہ آئے تو فلیئر پھینک لینا۔"

تھوڑی دیر بعد انبالہ کے ہوائی اڈے پر جو اکیّس طیارے کھڑے تھے ان کی تعداد پچیس ہو گئی۔ سرگودھا پر حملہ کرنے والے پہلے چھ ہوابازوں اور گاڑی کو تباہ کرنے والے چار طیاروں کو ایک ہی وقت میں 'ٹیک آف' کرنا تھا۔ ڈائریکٹر آف آپریشن کا خیال تھا کہ گاڑی اور سرگودھا پر ایک ہی وقت حملہ کیا جاتے تاکہ گاڑی کو بچانے کے لیے سرگودھا سے کوئی طیارہ نہ اُڑ سکے۔

▼

رات جب گاڑی جہلم سے دُور پرے ہی تھی، انبالہ کے ہوائی اڈے پر پچیس لڑاکا بمبار طیاروں میں بم اور راکٹ لگائے جا رہے تھے۔ ان کی مشین گنوں میں ایمونیشن ڈالا جا رہا تھا۔

وہ رات پاکستان کے لیے دہشت ناک رات تھی۔ پاکستان کے آسمان پر چاند بجھا بجھا سا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اگلے لمحے کیا ہوگا۔ پاک فوج کی قسمت کا انحصار باون ڈبوں کی اس مال گاڑی پر تھا جسے تباہ کرنے کے لیے انڈین ایئر فورس کے چار کینبرا طیارے انبالہ کے ہوائی اڈے سے اُڑنے والے تھے اور سرگودھا کے ہوائی اڈے کی عظمت کے محافظ پاک فضائیہ اور پاک فوج کے زمینی توپچی تھے جنہیں ابھی گمان تک نہ تھا کہ اُن پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

عین اُس وقت جب انبالہ میں پاکستان کی تباہی کے فضائی انتظامات مکمل ہو رہے تھے، پاک فضائیہ کے ایک ہوائی اڈے پر بمبار شاہبازوں کو انبالہ پر بمباری کی ہدایات دی جا رہی تھیں، اُس وقت تک پاک فضائیہ نے انبالے کے ہوائی اڈے پر حملہ نہیں کیا تھا۔ انبالہ انڈین ایئر فورس کا سب سے اہم ہوائی اڈہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس اڈے کو جدید ترین اور دُور بین ریڈار سے لیس کرنے کے علاوہ اس کے دفاع کے انتظامات دہشت ناک تھے۔ وہاں زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائیل بھی نصب تھے جن کا نشانہ خطا ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی۔ پٹھانکوٹ، ہلواڑہ، آدم پور، جام نگر اور جمّوں کے ہوائی اڈوں کو پاک فضائیہ بے کار کر چکی تھی۔ اب انڈین ایئر فورس کے فضائی حملے انبالہ سے ہوتے تھے۔ پاک فضائیہ کے شاہبازوں کے لیے انبالہ کا اڈہ چیلنج بن گیا تھا— آج رات پاک فضائیہ نے تمام تر دشواریوں، فاصلے اور خطروں کے ساتھ یہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔



تھوڑی دیر بعد پاک فضائیہ کے دو بمبار طیّارے انبالہ کا رُخ کیے جنگ کے خطرناک اور اہم ترین مشن پر جا رہے تھے۔ انبالہ سے چار کینبرا طیّارے گاڑی کو تباہ کرنے کے لیے اُڑنے والے تھے اور سرگودھا پر حملہ کرنے والے چھ ہواباز بھی طیّاروں کی طرف چل پڑے تھے۔ پاک فضائیہ کے بمبار شاہبازوں کو کچھ علم نہ تھا کہ انبالہ کے ہوائی اڈے پر اُن کے لیے پچیس لڑاکا بمبار طیّارے کھڑے ہیں۔

پاک فضائیہ کے دونوں بمبار اس قدر کم بلندی پر انبالہ تک جا پہنچے کہ انبالہ کا ریڈار انہیں دیکھ ہی نہ سکا۔ یہ پاک فضائیہ کے شاہبازوں کا کمال تھا کہ انہوں نے دشمن کو بے خبری میں جا لیا۔ اچانک انبالہ کی فضا لرزنے لگی۔ انبالہ کے طیّارہ شکن توپچیوں نے آسمان کو آگ سے بھر دیا۔ ٹریسر ایمونیشن نے فضا میں آگ کی لکیروں کا جال تن دیا اور پاک فضائیہ کا پہلا بمبار شاہباز انگوٹھا بٹن پر اور ہونٹوں پر خدا کا نام لیے دشمن کے پچیس طیّاروں کی صف کے اوپر پہنچ گیا۔ اُس نے طیّارہ شکن فائر کے جہنّم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بمباری کا بٹن دبا دیا۔ ہزار ہزار پونڈ کے چار بم گرے نیچے بھیانک دھماکے ہوئے جن کا لرزہ دلّی تک محسوس کیا گیا ہوگا۔ نیچے اندھیرا تھا۔ بمبار شاہباز کو ابھی علم نہ تھا کہ اُس نے انڈین ایئر فورس کی کمر توڑ ڈالی ہے۔

اس کے پیچھے جب دُوسرا شاہباز بم گرانے آیا تو اُس نے دیکھا کہ نیچے جانے کتنے طیّارے جل رہے تھے۔ ان شعلوں کی روشنی میں اُسے کچھ محفوظ طیّارے نظر آ گئے۔ اس نے بھی خدا

کا نام لے کر چار بم گرا دیتے جوان چھبیس طیاروں پر گرے۔ دشمن کے ان طیاروں کے ساتھ بم، نیپام بم اور راکٹ لگے ہوئے تھے۔ پاک فضائیہ کے بمباروں کے بموں سے یہ بھی پھٹے اور اپنے ہی اڈے کو بھیانک کھنڈروں میں بدل دیا۔

پاک فضائیہ کے بمبار دوسرے حملے کے لیے غوطے میں گئے اور ہینگروں اور دیگر اہم عمارتوں کا صفایا کر کے خیریت سے پاکستان کا رخ کر لیا۔

پاک فضائیہ کی راست گوئی کا سب سے بڑا ثبوت انبالہ کے ہوائی اڈے کی تباہی ہے کیونکہ پاک فضائیہ کے ان بمبار شاہبازوں نے واپس آکر کہا تھا کہ ہم نے نیچے بے شمار جگہوں سے آگ کے شعلے اٹھتے دیکھے تھے جن میں شاید چار پانچ شعلے جلتے طیاروں کے تھے چنانچہ پاک فضائیہ نے اخباروں اور ریڈیو کو خبر دیتے ہوئے دشمن کے صرف چار طیاروں کی تباہی بتائی تھی لیکن ایک امریکی رپورٹر اتفاق سے اُس وقت انبالہ میں موجود تھا اُس نے خبر دی تھی کہ پاک فضائیہ گذشتہ رات انڈین ایئر فورس کے چھبیس طیارے تباہ کر گئی ہے۔ اسی نامہ نگار نے خبر دی تھی کہ یہ چھبیس طیارے پاکستان کے کسی اڈے پر فیصلہ کن ہوائی حملہ کرنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

پاک فضائیہ کے ان دو بمبار شاہبازوں نے نہ صرف سرگودھا کو بچا لیا بلکہ پاکستان کی ایک اہم ترین مال گاڑی کو بھی بچا لیا اور بھارت کے سب سے بڑے ہوائی اڈے کو چھبیس طیاروں سمیت تباہ کر کے پاکستان کے آسمان کو دشمن کے طیاروں سے محفوظ کر لیا۔

▼

لیکن وزیر آباد سے ذرا آگے ریلوے لائن سے کوئی ڈیڑھ میل دُور ایک درخت تلے دو مست ملنگ بیٹھے "علی حیدرؓ، علی حیدرؓ" کے نعرے لگا رہے تھے۔ کسانوں نے انہیں دیکھا اور ملنگ سمجھ کر ان کے قریب سے گزر گئے۔ جس جگہ پر ملنگ بیٹھے ہوئے تھے، وہاں اُنہوں نے چھوٹا سا ایک بکس اور ڈیڑھ میل لمبی تار زمین میں دبا رکھی تھی۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ اگر گاڑی رستے میں کہیں بھی نہ رُکی تو وہ کتنے بجے وزیر آباد سے گزرے گی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ گاڑی جہلم سے پرے ترکی اور ڈومیلی کے پہاڑوں میں سے گزر رہی تھی۔ رفتار بہت تیز تھی اور گاڑی ہر سٹیشن سے رن تھرو ہو رہی تھی۔

لیسر کے قریب پاکستان کی ہیوی آرٹلری رجمنٹ کی ایک دو سو پونڈر توپ کے توپچیوں نے اپنے حوالدار سے چلا کر کہا — "امونیشن، امونیشن" — دشمن کے ٹینک ایک اور پہلو سے حملہ آور ہونے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ توپچیوں نے دیکھا کہ ٹریکٹر میں بہت تھوڑے سے گولے رہ گئے تھے۔ کمانڈر نے انہیں دوسری گنوں سے تھوڑے تھوڑے گولے منگوا دیئے لیکن وہ سوچنے لگا کہ اس محاذ پر ایک بھی توپ خاموش ہو گئی تو دشمن کو راہ مل جائے گی۔ اس محاذ کو سنبھالنا انفنٹری کے بس کی بات نہ تھی۔ یہاں ٹینکوں اور بڑی توپوں کی ضرورت تھی۔ ریئر ایشلان سے اسے امونیشن مل تو گیا لیکن ساتھ یہ پیغام بھی ملا کہ ذرا احتیاط سے فائر کرو، امونیشن آ رہا ہے — یہ پیغام بیٹری کمانڈر کے لیے تکلیف دہ تھا۔

کچھ ایسی ہی ہدایت لاہور کے ایک محاذ کے بٹالین کمانڈروں کو دی گئی کہ مارٹر شیل ذرا سنبھل کر فائر کرو۔ امونیشن آ رہا ہے۔ مارٹر کی ضرورت پڑے تو آرٹلری سپورٹ کرے گی، فوراً آرٹلری اور ٹینک سکواڈرن سے ملاپ کرو۔

امونیشن ہوا کی رفتار سے چلا آ رہا تھا۔ گاڑی جہلم سے نکل آئی تھی اور لالہ موسیٰ کا سٹیشن قریب آ رہا تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ چاندنی بجھی بجھی تھی۔ گاڑی کو لاہور پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ چاہیئے تھا۔

وزیر آباد سے ذرا آگے ریلوے لائن پر ایک ضعیف بوڑھی عورت لاٹھی کے سہارے کھڑی تھی۔ قریب کے گاؤں کے دو آدمی اُس کے قریب سے گزر گئے تھے۔ انہیں ذرہ بھر شک نہ ہوا تھا کہ وہ بڑھیا کے رُوپ میں ایک بہت خطرناک جاسوس ہے جس نے لائن کے سلیپر کے نیچے بڑا ہی طاقتور ڈائنامیٹ (بارُود) رکھ دیا ہے اور دُور پرے ایک درخت کے نیچے دو ملنگوں نے تار کا ایک سرا ڈیٹونیٹر ایکسپلوڈر کے ساتھ لگا کر دوسرا سرا لائن کے قریب ایک جھاڑی تک پہنچا دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ تار ڈائنامیٹ سے ملنے والا تھا۔

▼

صُوبیدار اکبر علی کو اس گاڑی کی اطلاع مل چکی تھی اور یہ بھی کہ یہ گاڑی کس قدر اہم ہے۔ وہ اپنے خفیہ دفتر میں وائرلیس سیٹ سے کان لگائے بیٹھا تھا۔ اُسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ گاڑی کی اطلاع جاسوسوں کو بھی مل چکی ہے۔ وزیر آباد کی فضا میں اجنبی پُراسرار اور دشمن آوازیں اُسے پاگل کیے جا رہی تھیں۔ وہ اتنی جلدی شکست قبول کرنے والا نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا مدِمقابل انڈین آرمی کا کرنل گپتا ہے جس کے ہاتھوں تربیت پائے ہوئے جاسوس اناڑی نہیں ہو سکتے۔

آج کی رات کرنل گپتا، اُس کے جاسوسوں اور اکبر علی کے لیے آزمائش کی رات تھی۔ امونیشن سے لدی گاڑی گزر رہی تھی جسے خیریت سے لاہور پہنچانا اکبر علی کا فرض تھا اور راستے میں تباہ کرنا کرنل گپتا اور اُس کے جاسوسوں کا عزم تھا۔

اکبر علی اپنے سیٹ پر بیٹھا وائرلیس کے گتھم گتھا پیغامات سن رہا تھا۔ کوئی آواز عجیب سے 'کوڈ' میں تھی۔ ان ہی میں 'مورس کوڈ' کی آوازیں بھی تھیں اور ایک آواز کسی کسی وقت صاف سنائی دیتی تھی — "رانا کالنگ .... نائن ٹو فور .... بوگی .... راجا۔ راجا۔ آؤٹ"۔

اکبر علی کے دماغ کی نسیں تنی ہوئی تھیں۔ اُس نے گھڑی دیکھی اور اُسے جو ہدایات ملی تھیں ان کے پیشِ نظر اندازہ کیا کہ اس وقت مال گاڑی کس مقام پر ہو گی۔ جوں جوں گاڑی قریب آ رہی تھی، اکبر علی کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ جاسوس وزیر آباد کے علاقے ہی میں ہیں اور یہ بھی کہ گاڑی شدید خطرے میں ہے۔ گاڑی کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر محاذوں کی ضرورت شدید نہ ہوتی تو اکبر علی کیپٹن طارق سے کہہ کر گاڑی کو کہیں پیچھے ہی رُکوا

لیتا لیکن گاڑی کو ہر قیمت پر خیریت سے لاہور پہنچانا تھا۔

اُس نے اپنے طور پر اندازہ لگایا کہ جاسوس چناب کے پُل کی طرف نہیں ہو سکتے کیونکہ پُل پر پہرہ ہے۔ اس سے آگے نالہ پلکھو کے پُل پر بھی پہرہ تھا۔ لہٰذا گاڑی کو تباہ کرنے والے جاسوس وزیرآباد سے آگے لاہور کی طرف ہو سکتے ہیں۔ اُسے انتہائی تلخ خیال آیا ــــ "اگر وہ اس سے بھی آگے ہوئے تو؟" ــــ وہ تڑپ اٹھا۔ اُس نے وائرلیس کی جو آوازیں سنی تھیں، ان کے مطابق اُسے یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ گاڑی کو طیّاروں سے تباہ نہیں کرایا جائے گا جو کچھ ہو گا زمین پر ہو گا۔

یہ مال گاڑی اکبر علی کے لیے اپنی بیٹیوں کی آبرو کی طرح مقدّس بن گئی۔ اُس کے ساتھ ایک حوالدار اور دو لانس نائک تھے جن میں سے ایک وائرلیس آپریٹر تھا۔

اکبر علی نے تھانے میں فون کیا اور تھانے کے انچارج سے کہا ــــ "وزیرآباد سے دھونکل تک ریلوے لائن کا خیال رکھو۔ کانسٹیبلوں کو رائفلوں کی جگہ پستول دینا اور وہ وردی میں نہ ہوں پستول، چھپا کر رکھیں..... فون کیپٹن طارق صاحب کو دو..... السلام علیکم سَر! میں ہر طرح تیار اور چوکس ہوں سَر! گڑبڑ ہے.... فکر نہیں سَر! میں نے انسپکٹر کو بتا دیا ہے اسے کیا کرنا ہے۔ آپ ذرا سختی سے کہہ دیں!"

کیپٹن طارق نے اکبر علی کو کچھ ہدایات ایسے اشاروں میں دیں جنہیں اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

وزیرآباد" ہا پولیس کی نفری اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میلوں ریلوے لائن پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کانسٹیبل کھڑے کیے جا سکتے۔ کیپٹن طارق کے کہنے پر انسپکٹر نے چھ کانسٹیبلوں کو تیار کر کے انہیں ہدایت دی کہ وزیرآباد سے دھونکل تک ریلوے لائن کے دونوں طرف بکھر کر گھومتے رہیں اور پانچ چھ میل کے اس علاقے کو نظر میں رکھیں۔ جب گاڑی گزر رہی ہو تو کسی بھی آدمی کو لائن کے قریب مشکوک حالت میں دیکھیں تو اُسے پکڑ لیں۔

"اگر وہ دُور ہو تو اُسے گولی مار دیں" ــــ کیپٹن طارق نے کہا ــــ "اگر کوئی بے گناہ مارا جاتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ گاڑی ایک انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔ جب گاڑی گزر رہی ہو تو کسی کی پرواہ نہ کرنا کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں۔ گولی کی زبان میں بات کرو۔ گاڑی کو وزیرآباد سے ٹھیک گزارنا ہے۔ اگر گاڑی کو اس علاقے میں کچھ ہو گیا تو تھانے میں واپس نہ آنا، اپنے آپ کو گولی مار لینا۔ جاؤ اور پاپیادہ دھونکل تک چلے جاؤ، پھر وہاں سے واپس آؤ۔ دوسرے حکم تک ٹہلتے رہو۔"

ریلوے لائن سے ڈیڑھ میل دُور بیٹھے ہوئے دو ملنگوں نے ریل گاڑی کو تباہ کرنے کا مکمل انتظام کر لیا۔ ریلوے لائن میں ڈائنا میٹ رکھا جا چکا تھا۔ یہ ملنگ کیپٹن طارق، صوبیدار اکبر علی اور پولیس کی نظروں سے بہت دُور تھے۔

"پُل کا فکر نہیں" ــــ اکبر علی نے کہا ــــ "وہاں ایک نائب صوبیدار ہے۔ اُس کے ساتھ بات ہو چکی ہے۔ اُس کا بندوبست ٹھیک ہے۔"

"گاڑی قریب ہی ہو گی" ــــ حوالدار نے کہا۔

"تم اِدھر خیال رکھو" ــــ صوبیدار اکبر علی نے کہا ــــ "میں ذرا باہر کا چکر لگا آؤں" ــــ اُس نے آہ لے کر کہا ــــ "اللہ مددگار ہے۔"

وہ باہر نکل گیا۔ باہر جا کر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اندر رہ کر بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ باہر جا کر اُسے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کچھ کر رہا ہے۔ متحرّک رہنے سے اُسے اطمینان سا ہوتا تھا۔ گلی سے نکل کر وہ ذرا کھلی جگہ گیا تو فضا میں مانوس گرجدار زناٹہ سنائی دیا۔ پاک فضائیہ کے دو سیبر طیّارے بڑی کم بلندی پر اڑتے گزر گئے۔ صوبیدار اکبر علی یوں لرز گیا جیسے طیّاروں کی گرج اُس کے سینے میں داخل ہو گئی ہو۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

طیّارے آگے جا کر واپس آ گئے۔ اب اُن کی بلندی کچھ اور کم تھی۔ اکبر علی سمجھ گیا کہ یہ اپنے طیّارے ہیں۔ اگر دشمن کے ہوتے تو چناب کے پُل پر لگی ہوئی طیارہ شکن گنیں آسمان کو آگ سے بھر دیتیں۔ پل کے محافظوں کو ہدایات مِل چکی تھیں۔

سیبر طیّاروں کے آگے جانے اور واپس آنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گاڑی وزیرآباد کے قریب آ گئی ہے۔ اپنے یہ دو طیّارے صوبیدار اکبر علی کو نظر نہیں آتے تھے۔ چاندنی تو تھی لیکن طیّارے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اکبر علی کو اتنا اطمینان ہو گیا کہ اپنے طیّارے ساتھ ہیں۔ ان کی موجودگی میں دشمن کے طیّارے ریل گاڑی پر حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ اکبر علی کو معلوم نہ تھا کہ دشمن کے بمبار طیّارے آ گئے تو اپنے سیبر طیارے کچھ بھی نہیں کر سکیں گے کیونکہ سیبر طیّارے نائٹ فائیٹر نہیں تھے، یعنی یہ رات کو لڑنے کے قابل نہیں تھے۔ یہ صرف دن کو لڑ سکتے تھے۔ یہ احتیاط کے طور پر یا اپنے دل کو تسلّی دینے کے لیے گاڑی کے ساتھ بھیج دیئے گئے تھے۔

▼

اپنے طیّاروں کی آواز سن کر صوبیدار اکبر علی کے خیالوں کا دھارا رُخ موڑ گیا۔ اسے بھارت کے حملے کا پہلا دن یاد آ گیا اور معاً وہ عورتیں نظروں کے سامنے آ گئیں جنہیں بھارتی سپاہی سرحدی دیہات سے اٹھا لے گئے تھے اور جو گاؤں میں شہید ہو گئی تھیں اور وہ بھی جو بچ نکلی تھیں اور بڑی بُری حالت میں لاہور پہنچی تھیں۔ اُسے وہ بچّے یاد آتے، معصوم، بھولے بھالے بچے جن کی توتلی زبانوں نے ابھی "پاکستان زندہ باد" کہنا بھی نہ سیکھا تھا مگر

اس مال گاڑی کو خیریت سے لاہور تک پہنچانا یا کم از کم وزیر آباد سے خیریت سے گزارنا اکیلے صوبیدار اکبر علی کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ اس ذمہ داری کا زیادہ تر حصہ کیپٹن طارق کے کندھوں پر تھا۔ اسی لیے تو وہ تھانے میں موجود رہتا تھا کہ بوقتِ ضرورت تھانے کی ساری نفری کو استعمال کرے۔ اس کے علاوہ چناب کے پل کی حفاظت کے لیے کسی رجمنٹ کی جو پلاٹون تھی، اُسے بھی یہ حکم دیا گیا تھا کہ کیپٹن طارق کو جتنے جوانوں کی ضرورت پڑے اُسے دیئے جائیں۔

ان تمام انتظامات کے ہوتے ہوئے بھی صوبیدار اکبر علی کچھ ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے اس ریل گاڑی کو لاہور تک خیریت سے پہنچانا اُس اکیلے کا فرض ہو اور اُسے یہ فرض براہِ راست خدا نے سونپا ہو۔ کبھی اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ریل گاڑی اُس کی ذاتی ملکیت ہو اور بھارتی انٹیلی جنس کا کرنل گپتا اُس کا ذاتی دشمن ہو۔

جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک افواج کے ہر افسر اور ہر جوان نے اپنے آپ میں یہ احساس پیدا کر لیا تھا کہ ملک کو دشمن سے بچانا اُس اکیلے کا فرض ہے۔ اس طرح جنگِ ستمبر ہر لڑنے والے کی ذاتی جنگ بن گئی تھی۔ احکام جو انہیں کمانڈروں سے ملتے تھے انہیں وہ خدا کے احکام سمجھتے تھے۔

صوبیدار اکبر علی کو بھی یہی احساس پریشان کر رہا تھا کہ اس ریل گاڑی کو تباہ کار جاسوسوں سے بچانے کے لیے وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ کیپٹن طارق کے ساتھ فون پر بات کر کے اُس نے وائرلیس سیٹ کے ساتھ کان لگا لیے۔ اُسے زیادہ تر "مورس کوڈ" کی ٹٹ ٹیں ٹیں سنائی دے رہی تھی۔ اُس کا وائرلیس آپریٹر ان آوازوں کو لکھ رہا تھا لیکن پیغامات کا تبادلہ خفیہ کوڈ میں ہو رہا تھا۔ اکبر علی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ان الفاظ کو ڈیسائیفر کرانے کے لیے لاہو بھیجتا۔

ریل گاڑی قریب آ رہی تھی۔

"صاحب!— حوالدار نے کہا — "کچھ ہوگا ضرور اور ہوگا وزیر آباد کے آگے یا پیچھے.... دریا کے پل کے نیچے بھی پٹرولنگ ہونی چاہیئے۔ دشمن نیچے ڈائنامیٹ نہ رکھ چکا ہو۔"

کفّار کے ہاتھوں کٹ گئے۔

اُسے اپنے خاندان کے اٹھارہ شہید یاد آ گئے جنہیں وہ ٹرک میں ہی بھارت کی ایک نہر میں پھینک آیا تھا۔ اُس نے اپنے وجود میں تپش سی محسوس کی جیسے اُسے بخار ہو رہا ہو۔ اُس کا دل بوجھ سے دبنے لگا اور ایک بار پھر اُس کے سینے سے خواہش اُبھری کہ وہ اس زمین دوز ڈیوٹی سے ہٹ کر کھلے میدان میں دشمن سے دو بدو لڑے اور معصوموں کے خون کا بدلہ اپنے ہاتھوں

لے۔ رن کچھ کے معرکے کے دوران اُس نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو نہیں بریگیڈیئر سے کہا تھا کہ اُسے انٹیلی جنس ڈیوٹی سے ہٹا کر کسی بٹالین میں بھیج دیا جائے لیکن بریگیڈیئر نے اُسے احساس دلایا تھا کہ جو محاذ اُسے سونپا گیا ہے وہ فیلڈ سے زیادہ اہم ہے۔

اُسے غصہ آنے لگا۔ وہ اپنی ڈیوٹی کی اہمیّت کو سمجھتا تھا لیکن وہ اس سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے ساتھ حساب چکانے کو بیتاب ہُوا جا رہا تھا۔ وہ دشمن کی تڑپتی لاشیں اور بہتا خون دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا خون دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کرنل گپتا کے سامنے جا کر اُسے للکارنے کو اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا مگر کرنل گپتا جالندھر میں بیٹھا تھا اور جالندھر بہت دُور تھا۔

اُس نے پہلی جنگِ عظیم کی باتیں سُنی تھیں اور دوسری جنگِ عظیم میں خود لڑا تھا۔ اُس نے جنگ و امن کے فلسفے پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ وہ فوجی تھا فلاسفر نہیں تھا۔ اُس کا ایک ذاتی نظریہ ضرور تھا کہ جنگ نہیں ہونی چاہیئے۔ اُس نے انگریزوں کا راشن کھایا تھا اور وہ ان کی طرف سے لڑا تھا مگر اُسے انگریزوں سے نفرت تھی۔ اُسے ہر اُس قوم سے نفرت تھی جو جنگ میں شریک تھی۔ آج جب جنگ اس کے اپنے وطن میں سرحد پھلانگ آئی تو اُسے احساس ہونے لگا کہ جنگ کس قدر اہم اقدام ہے۔ ایک زندہ اور خوددار قوم کا جنگجو ہونا کس قدر لازمی ہے اور اُس پر یہ انکشاف بھی از خود ہو گیا کہ پاکستانی جنگجو ہیں جنگ پسند نہیں اور اگر ان پر جنگ ٹھونسی جائے تو وہ اپنے وطن کے ایک ایک انچ اور مٹی کے ایک ایک ذرّے کے لیے کٹ مریں گے۔

"اب کفر کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ لڑ کے ہی دم لیں گے"— اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

دوسرا روز تھا اُس نے شیو بھی نہیں کی تھی اور چائے اور چند ایک بسکٹوں کے سوا کچھ کھایا بھی نہیں تھا۔ اُس کے سٹاف کا بھی یہی حال تھا۔ تھوڑی ہی دیر ہُوئی اُس نے اپنے حوالدار اور دو لانس نائیکوں سے کہا تھا کہ کھانا یہیں منگوا لو یا باری باری جا کے کھا آؤ۔

"کھا لیں گے صاحب!— ایک لانس نائک نے کہا تھا — "گاڑی گزر جانے دیں" — اور وہ اپنے کام میں محو رہے۔

اکبر علی خراماں خراماں چائے کی سامنے والی دکان کی طرف چل پڑا۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے دکان کے اندر کونے میں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ اکبر علی کا ارادہ تھا کہ اپنے سٹاف کے لیے چائے اور بند وغیرہ بھجوا دے گا۔

رات زیادہ تو نہیں گزری تھی، لیکن گلیاں اور سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ لوگ گھروں میں بند تھے، سو گئے تھے یا گپ شپ لگا رہے تھے۔

اکبر علی چائے کی دوکان سے دُور ہی تھا کہ ایک جواں سال عورت نے اُسے روک لیا۔ وہ کوئی دیہاتی عورت تھی۔ بال پریشان، دوپٹہ، شلوار اور قمیض جگہ جگہ سے پھٹی ہُوئی اور چال چلیے سے وہ مفلوک الحال معلوم ہوتی تھی۔

"میں سیالکوٹ سے آئی ہُوں"— عورت نے خوفزدہ آواز میں کہا — "پہلے تو پیدل چلتی رہی

راستے میں ایک رِیڑھے والا مل گیا۔ تھوڑی دور تک وہ رِیڑھے میں لے آیا۔ پھر پیدل چلنے لگی۔ کچھ اور آگے آئی تو ایک بس والے نے بٹھالیا۔ ابھی ابھی یہاں پہنچی ہُوں۔"

"کس گاؤں سے آئی ہو؟" — اکبر علی نے پوچھا۔

"ظفروال!" — عورت نے رندھیائی ہوئی آواز میں جواب دیا — "گاؤں میں کافروں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ جو بھاگ سکے بھاگ گئے اور ہم جو قسمت کے مارے پھنس گئے" — اُس کی زبان لڑکھڑا گئی ہچکی لے کے بولی — "نہ پوچھو.... میں کچھ نہ بتا سکوں گی۔ ایک ہی بچہ تھا۔ وہ بھی، بچے کا باپ بھی" — وہ دھاڑیں مار مار رونے لگی۔

"یہاں تمھارا کوئی رشتے دار ہے؟"

"کوئی نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں" — عورت نے روتے ہوئے کہا — "لاریوں کے اڈے سے بس سے اُتری تو اس طرف چل پڑی۔ سمجھ نہیں آتی کہاں جاؤں؟"

"تم اپنے آپ کو پاکستان میں اجنبی سمجھتی ہو؟" — اکبر علی نے کہا — "ظفروال کی بیٹی وزیرآباد والوں کے لیے غیر تو نہیں۔ بس سے اُتر کر کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتیں، گھر والے تمھیں سینے سے لگا لیتے.... خیر.... اچھا کیا جو میرے پاس آگئی ہو۔"

اس ایک عورت کو پناہ میں لے لینے سے اکبر علی کو ایسا روحانی سکون محسوس ہُوا جیسے اُس نے سرحد کی تمام عورتوں کو پناہ میں لے لیا ہو۔ اُس کے دل پر جو بوجھ سا تھا یکبارگی اُٹھ گیا۔ وہ اس عورت کو ساتھ لیے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ دونوں بیٹیاں اپنے اپنے سُسرال میں تھیں۔ اُس نے راستے میں چھوٹے سے ایک ہوٹل سے چار روٹیاں اور چند کباب لے لیے۔

گھر پہنچ کر اُس نے موم بتی جلائی اور روٹیاں عورت کے سامنے رکھ دیں۔ وہ خود بھی بھوکا تھا۔ کھڑے کھڑے ایک روٹی پر کباب رکھا اور جلدی جلدی نوالے حلق میں ٹھونسنے لگا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔

▼

جب صوبیدار اکبر علی اس ڈری سہمی ہوئی بے گھر عورت کے سامنے روٹی پر کباب رکھ کر کھا رہا تھا، ہاجرہ ایک گلی میں جا رہی تھی۔ چوہدری کرامت کی رشتہ دار دو جوان لڑکیاں اُس کی بیٹی شمع کو دیکھنے آئی تھیں۔ شمع کا بخار ابھی اُترا نہیں تھا۔ لڑکیوں کو دیر ہوگئی۔ شمع کی ماں نے ہاجرہ سے کہا کہ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ اُن کے گھروں تک جائے۔ شمع کی ماں نے یہ تو سوچ لیا کہ لڑکیاں جوان ہیں، رات کے وقت اکیلی نہ جائیں لیکن اُس نے یہ نہ سوچا کہ ہاجرہ بھی جوان ہے اور دونوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ لڑکیوں کو چھوڑ کر اکیلی آئے گی۔ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی! ہاجرہ نوکرانی تھی۔ نوکروں نوکرانیوں کی عزت اور عصمت کا خیال رکھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

دونوں لڑکیاں اٹھکیلیاں کرتی جا رہی تھیں اور ہاجرہ چُپ چاپ اُن کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔

"اقبال کی ممانی کی سنی تم نے؟" — ایک لڑکی نے دوسری سے کہا — "کہتی پھرتی ہے کہ میں تو اپنی بیٹی اقبال کو نہیں دوں گی۔ وہ تو ساری عمر کے لیے اندھا ہو گیا ہے۔"

"میں سن چکی ہوں" — دوسری لڑکی نے کہا — "وہ اس لیے کہتی پھرتی ہے کہ عورتیں اقبال کے ماں باپ کو بتا دیں۔"

ہاجرہ کے دل پر بڑی سخت چوٹ پڑی۔ اُسے اقبال کی ممانی پر غصہ آنے لگا لیکن وہ اپنا خون پینے کے سوا کر ہی کیا سکتی تھی!

وہ لڑکیوں کو اُن کے گھروں تک پہنچا کر واپس آرہی تھی۔ رات کا پہلا پہر گزر رہا تھا۔ چاندنی نکھرتی آرہی تھی۔ ہاجرہ کی جذباتی دنیا میں زلزلے بپا تھے۔ اُس کی طبیعت میں ہیجان اور بے قراری تھی۔ اس بے قراری میں رہ رہ کر اُسے تلخی کا احساس ہوتا تھا اور اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ کھاریاں اقبال کے پاس چلی جائے اور اُس سے باتیں سنے یا افضال کے پاس جا بیٹھے۔ یہ تو اُسے یقین ہو چکا تھا کہ افضال جاسوس نہیں۔

افضال کا خیال آتے ہی اُسے میٹھی میٹھی سی تھکن محسوس ہونے لگی۔ وہ یوں افضال کے گھر کی طرف چل دی جیسے تھکا ماندہ راہ رو منزل کی طرف جا رہا ہو۔

شہر میں مکمل بلیک آؤٹ تھا۔ گلیاں سنسان تھیں۔ لوگ برآمدوں میں سوئے ہوئے تھے یا چھتوں پر باتوں میں محو تھے۔ ہاجرہ افضال کی گلی سے ذرا ہی دُور تھی کہ اسے گلی کی نکڑ پر سفید برقعے میں لپٹی ہوئی کوئی عورت کھڑی نظر آئی۔ گلی سے ایک آدمی نکلا اور عورت کو ساتھ لے کر تیز قدم دوسری سمت چل پڑا۔ ہاجرہ کو یقین کی حد تک شک ہُوا کہ وہ افضال ہے لیکن اُسے خیال آیا کہ افضال کا کسی عورت سے کیا کام؟

وہ تقریباً دوڑنے کی رفتار سے افضال کی گلی میں داخل ہوئی اور اُس کے دروازے پر جا رُکی۔ دستک دی تو دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ اندر اندھیرا اور سکوت تھا۔ اُس نے افضال کو پکارا کوئی جواب نہ ملا۔ اُسے یاد آگیا کہ افضال تو یہاں سے جا چکا ہے۔ اُسے اکبر علی پر غصہ آنے لگا جس نے افضال پر جاسوسی کا الزام لگایا تھا۔ ہاجرہ کو خیال آیا کہ افضال شریف آدمی ہے، اس ڈر سے کہیں اور چلا گیا ہے کہ اکبر علی اُسے گرفتار کرا دے گا۔

ہاجرہ کو یقین ہو گیا کہ سفید برقعے والی عورت کے ساتھ جو آدمی گیا ہے وہ افضال ہی تھا۔ وہ عورت افضال کی ماں بھی ہو سکتی تھی، بہن بھی یا سیالکوٹ کے کسی گاؤں سے بھاگی ہوئی کوئی پناہ گزیں عورت بھی، مگر ہاجرہ کی نگاہ میں وہ عورت تھی۔ اُسے دھچکا سا لگا جیسے وہ عورت اُس سے افضال کو چھین لے گئی ہو۔ اُس کی جذباتی حالت پہلے ہی بے ٹھکانہ تھی۔ احساسات میں افراتفری بپا تھی۔ گو وہ تھکن محسوس نہیں کر رہی تھی لیکن اعصاب پر دو راتوں کی شب بیداری اور اقبال کی حالت اور اُس کی باتوں کے ہیجان کا اثر بہر صورت تھا۔ اس نئی صورتِ حال میں وہ اعصابی تناؤ کا شکار ہو گئی اور اُس کی سوچ مفلوج ہو کے رہ گئی۔

وہ اَن پڑھ لڑکی تھی جو پیار کی محرومی، گھُرکیوں، گالیوں، تھپیڑوں اور لوگوں کے باورچی خانوں

اور خونیوں میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ نفرت، حقارت اور زود پشیمانی اُس کی ذات کے بنیادی عناصر تھے جن کے زیرِ اثر اُس کا ہر ردِّعمل فوری اور انتہائی ہُوا کرتا تھا۔ لوگ اُسے گلیوں میں چھیڑا کرتے تھے تو اُس نے انگارے نگل کر چُپ سادھ لی تھی۔ چُپ بھی ایسی جیسے پتھر بن گئی ہو لیکن اشتعال پہ اُتری تو اپنی آنکھیں تک نکال کر اقبال کو دینے پر تیار ہو گئی۔ جب اقبال اور اکبر علی سے نفرت تھی تو ان کی آنکھیں نوچ لینے کو تیار لیکن جب افضال اچھا لگا تو دنیا بھر کے ڈر خطرے اور شرم و حجاب کو الگ رکھ کر اُس کی گود میں جا سر رکھا۔ اب افضال کے ساتھ ایک عورت کو جاتے دیکھا تو وہ بلا سوچے سمجھے آگ بگولا ہو کر اُسی سمت دوڑ پڑی جدھر افضال چلا گیا تھا۔

▼

صُوبیدار اکبر علی نے جلدی جلدی ایک روٹی کھائی اور ظفروال کی پناہ گزیں عورت کو تسلّی تشفی دے کر پیٹ بھر کر کھانا کھلایا اور اُسے پانی کا گلاس دیا۔

"میں شاید رات کو گھر نہ آسکوں" — اُس نے اس عورت سے کہا — "تم یہاں اطمینان سے سو جاؤ اور اسے اپنا گھر سمجھو۔ صبح تمہارا کوئی اور بندوبست کر دوں گا۔ آج کی رات یہیں گزارو۔"

"نہیں!" — عورت نے ڈرے ہُوئے بچے کی طرح کہا — "خدا کے لیے اکیلے چھوڑ کے نہ جانا۔ مجھے ساتھ لے چلو۔ ڈر آتا ہے۔"

اکبر علی نے اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بہت سی باتیں کیں مگر عورت اس قدر خوفزدہ تھی کہ اکبر علی کی راہ روک کے کھڑی ہو گئی — "اللہ تیرا بھلا کرے، مجھے پناہ دی ہے تو اپنے ساتھ رکھو" — اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

"میں تو یہ موم بتی بھی بجھا دینا چاہتا ہوں۔ شہروں میں بلیک آؤٹ ہوتا ہے مگر تم اندھیرے میں کیسے رہو گی؟" — اکبر علی نے کہا — "یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ جنگ وزیر آباد سے بہت دُور ہے۔ یہاں تک دشمن کی ہوا بھی نہیں پہنچ سکتی۔ یہاں سب تمہارے سجن ہیں۔ اندر سے دروازہ بند کر کے سو جاؤ۔"

"نہیں" — عورت اُٹھ کر اس سے لپٹ گئی اور رو رو کے بے حال ہونے لگی — "خدا کے لیے رک جاؤ، نہ جاؤ۔"

اکبر علی پر رقّت طاری ہو گئی۔ اس عورت کی یہ ذہنی کیفیت اُس کے لیے قابلِ فہم تھی۔ وہ دوسری جنگِ عظیم کا فوجی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جنگ کی زد میں آئے ہُوئے شہریوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ جب برما، ملایا، سنگاپور وغیرہ سے جاپانی شکست کھا کر پسپا ہو گئے تھے اور یہ علاقے ایک بار پھر انگریزوں کے قبضے میں آ گئے تھے تو اکبر علی کو ان علاقوں میں بھیجا گیا تھا۔ فوجیوں نے وہاں کی جوان عورتوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا تھا، وہ بھی اُس نے دیکھا تھا۔ اُس نے اُن عورتوں کی چیخیں سنی تھیں جن کے گھر جنگ نے تباہ کر دیئے تھے اور انہیں اپنے بچّوں کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں ہیں؟ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔ اُس نے ایسے بچے بھی دیکھے تھے جو صدمے سے گونگے ہو گئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہر کسی کو دیکھتے رہتے تھے۔

اُس نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی بربرّیت کی شکار بے شمار عورتیں دیکھی تھیں۔ اب ظفروال کی اس عورت کو دیکھا جس کا اکلوتا بچّہ اور خاوند دشمن کے ہاتھوں کٹ گیا تھا تو اس پاکستانی عورت اور ملایا وغیرہ کی عورتوں میں صرف اتنا سا فرق نظر آیا کہ یہ عورت اُس کے اپنے دیس کی تھی..... اپنی بیٹی، اپنی بہن..... اُس نے یہاں تک سوچ ڈالا کہ جہنم میں جائے ایمونیشن کی گاڑی۔ میں پاکستان کی اس بیٹی کو ڈرنے اور تھر تھر کانپنے کے لیے اکیلا چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔

▼

گاڑی کا خیال آتے ہی اکبر علی کو دھچکا لگا جیسے کسی اَن دیکھی قوّت نے اُسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہو۔ اُس کے دل سے آواز اٹھی — "یہ گاڑی تباہ ہو گئی تو اس عورت جیسی جانے کتنی عورتوں کی عزت تباہ ہو جائے گی۔"

ریل گاڑی کے محافظ، دو سیبر طیّارے ایک بار پھر چیختے چنگھاڑتے اُوپر سے گزر گئے اور دوسرے ہی لمحے گھوم کر پھر واپس چلے گئے۔ ان کی ہیبت ناک گرج سے ڈر کر عورت نے چیخ ماری اور اکبر علی کے قدموں میں دوزانو ہو کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"وہ آ گئے، وہ آ گئے" — وہ پاگلوں کی طرح چلّانے لگی — "توپیں..... گولے..... میرا مُنّا..... نہ جاؤ، خدا کے لیے مجھے کہیں چھپا لو۔"

صوبیدار اکبر علی نے دوسری عالمگیر جنگ میں بڑے بڑے ہیبت ناک لمحے دیکھے تھے۔ برما فرنٹ پر کرنل گپتا (جب وہ نائک تھا) کے ساتھ انٹیلی جنس ڈیوٹی پر ایک بار وہ دونوں اس قدر آگے نکل گئے تھے کہ جاپانیوں کے نرغے میں آ گئے۔ ان کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اکبر علی دائیں ران میں جاپانیوں کی دو گولیاں کھا کر دو گھنٹے جھاڑیوں، دلدل اور اونچی گھاس میں رینگ رینگ کر اس حالت میں نکل آیا تھا کہ جاپانیوں کی گولیوں سے گپتا کا لہولہان نیم مردہ جسم، اُس کے کندھوں پر تھا۔ ایسے ہی کئی خوف ناک لمحے آئے تھے مگر وہ ہر بار موت کو جُل دے کر ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے لیے قیمتی خبریں لے آیا تھا۔

اب جب جنگ اُس کے اپنے وطن میں آئی تو وہ بھوک، پیاس اور نیند سے بے نیاز اپنے محاذ پر ڈٹا ہُوا تھا۔ وہ بھارتی ٹینکوں سے بھی ٹکرا جانے کو تیار تھا لیکن ظفروال کے سرحدی دیہات کی ایک مظلوم عورت اُس کی ٹانگ سے لپٹ گئی اور اُدھر ایمونیشن سے لدی مال گاڑی وزیر آباد کے قریب آ گئی تو اُس کی سُوجھ بوجھ شل ہو کے رہ گئی۔ اس جواں سال عورت نے اُسے جذبات کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑ گیا ہو جو اُتر نہ سکے گا۔

اُس کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی اور وہ اپنے وجود میں آسیبی لرزہ سا محسوس کرنے لگا۔ مال گاڑی اور یہ نوجوان عورت دو متضاد قوتیں بن کر اُسے متضاد سمتوں کو کھینچنے لگیں۔ اُسے یہ خدشہ بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ اس عورت کو یہاں اکیلا چھوڑ گیا تو وہ اس ذہنی کیفیت میں دیواروں سے سر پھوڑ لے گی یا پاگل ہو جائے گی۔ اُسے کسی قیمت پر گوارا نہ تھا کہ اُس کی پناہ میں

آئی ہُوئی کوئی عورت خودکشی کر لے یا پاگل ہو جاتے۔ اُسے کسی کے حوالے کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

مال گاڑی لالہ موسیٰ سے رن تھرو ہو آئی تھی اور بلاخوف وخطر انتہائی رفتار سے چلی آ رہی تھی۔ پولیس کے کانسٹیبل ایک ایک کر کے وزیر آباد سے دُور آ گے نکل گئے تھے۔ وہ اُس ڈائنامیٹ کو دیکھ نہ سکے تھے جو گاڑی کو تباہ کرنے کے لیے ایک سلیپر کے نیچے رکھا تھا، نہ اُس تار کو دیکھ سکے تھے جس کا سرا جاسوسوں نے جھاڑیوں میں چھپا رکھا تھا۔ یہ سرا ڈیٹونیٹر کے ساتھ لگا دیا گیا تھا اور دوسرا ڈیٹونیٹر کے ساتھ تھا۔

عورت کی دیوانگی اور خوفزدگی کو دیکھ کر اکبر علی کی ذات کا جانباز اور فرض شناس سپاہی دم توڑنے لگا اور اس کی جگہ ایک جذباتی شہری نے لے لی۔ اُس نے جُھک کر عورت کو کندھوں سے تھاما اور اُسے اٹھا لیا۔ وہ اٹھی اور ڈرے ہوئے بچے کی طرح اکبر علی کے سینے سے لگ گئی۔ اُس نے اکبر علی کو اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچ لیا۔ اُس کے ملائم اور بکھرے بکھرے ریشمی بال اکبر علی کے ہونٹوں اور گالوں کو چھونے لگے۔ اکبر علی کا سینہ عورت کے سینے کے اتار چڑھاؤ کی شدت کو بڑی شدّت سے محسوس کرنے لگا۔ اکبر علی کا سینہ میدانِ جنگ بن گیا۔ نہ جانے کیسی کیسی قوتیں، کیسے کیسے جذبات، کیسی کیسی حسّیں اور کیسے کیسے بگولے خونریز معرکے لڑنے لگے — اکبر علی آخر مرد تھا، انسان تھا۔



ہاجرہ کا سینہ بھی اسی طرح کے خونریز معرکے کا میدان بنا ہُوا تھا۔ وہ افضال اور برقعہ پوش عورت کے تعاقب میں چلی جا رہی تھی۔ وہ دونوں تیز قدم چلتے اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہاجرہ دوڑ پڑی۔ اُس کا ذہن نارمل نہیں رہا تھا۔ اُس پر محرومیوں اور پیار کی پیاس کا اور افضال کی محبت کا آسیب طاری تھا۔ وہ گرد و پیش سے بے خبر دوڑتی گئی پھر رک گئی اور کچھ سوچ کر تیز تیز چلنے لگی۔

اُسے زیادہ دیر بھٹکنا نہ پڑا۔ وہ قریبی راستے سے آگے گئی۔ ذرا ہی پیچھے اُسے افضال اور برقعہ پوش عورت اپنی سمت آتے دکھائی دیئے۔ وہ ایک بند کھوکھے کی اوٹ میں چھپ گئی افضال اور عورت اُس کے قریب سے گزرے۔

"اب تیز چلو" — ہاجرہ کو مردانہ آواز سنائی دی — "وقت تھوڑا ہے۔"

ہاجرہ افضال کی آواز کو خوب پہچانتی تھی لیکن یہ آواز افضال کی نہیں تھی۔ یہ آواز عورت کی بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ آواز مردانہ تھی۔ وہاں کوئی تیسرا آدمی بھی نہیں تھا۔ ہاجرہ کو اتنا یقین ضرور تھا کہ یہ آواز برقعے کے اندر سے آئی تھی۔ چند قدم آگے جا کر دونوں رُک گئے۔ عورت نے برقعے کا نقاب اٹھا کر گھوم کے دیکھا۔ چاندنی رات میں ہاجرہ نے اچھی طرح دیکھا کہ وہ چہرہ عورت کا نہیں تھا۔ اس چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور اس کے ساتھ جو آدمی تھا وہ افضال ہی تھا۔

"افضال ہندوستان کا جاسوس ہے" — ہاجرہ کے ذہن میں اکبر علی کی آواز گونجی۔

"جاسوسوں کا یہی تو کمال ہے کہ وہ پہچانے نہیں جا سکتے" — ہاجرہ کو اقبال کے الفاظ یاد آئے تو اُس نے سوچا کہ افضال کو تو میں پہچان سکتی ہوں۔ اُس نے کوئی بھیس نہیں بدلا، وہ جاسوس نہیں

ہاجرہ کی ذات دو حصوں میں بٹ گئی — نہیں، افضال جاسوس نہیں .... مگر کون جانے؟ .... جاسوس نہیں تو بدکار ہے؟ .... فریبی ہے؟ .... نہیں .... افضال بدکار نہیں ہو سکتا۔ وہ قرآن پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے .... برقعے میں عورت نہیں مرد ہے .... مرد کیوں ہے؟ .... شاید پھیکی پھیکی چاندنی میں غلطی لگی ہو .... وہ عورت ہی ہوگی! .... عورت ہے تو کون ہے؟ افضال کی کیا لگتی ہے؟ افضال اس کے ساتھ مکان خالی کر کے شہر سے باہر کی طرف کہاں جا رہا ہے؟

وہ غیر یقینی کی کیفیت میں چھُپ چھُپ کر اُن کے پیچھے چل پڑی۔ اُس کا دماغ سوچنے سے معذور ہو چکا تھا۔ دل اور دماغ کا رشتہ ٹوٹ گیا اور وہ پُراسرار برقعے کے بھید کے پیچھے یوں چل پڑی جیسے خواب میں چلی جا رہی ہو۔ افضال اور برقعہ پوش شہر سے نکل گئے اور سڑک سے اُتر کر درختوں کے سائے سائے میں چلنے لگے۔

ہاجرہ بھی درختوں کی اوٹ میں تعاقب میں بڑھتی گئی۔ دل اور دماغ نے شل ہو کر اُس کے جسم کو بھی معذور کر دیا تھا۔ وہ اب قدم گھسیٹ رہی تھی اور اُسے اب یہ تعاقب بے مقصد محسوس ہونے لگا۔ پھر اُسے سب کچھ ہی بے مقصد نظر آنے لگا — افضال کی محبت بے مقصد، اقبال کا اندھا ہو جانا بے مقصد، اکبر علی کی باتیں بے مقصد، یہ جنگ، یہ نعرے بے مقصد — اسے یہ زندگی بے مقصد نظر آنے لگی پھر اسے اپنے جسم سے یوں گھن آنے لگی جیسے گوشت پوست کی یہ غلیظ شے کسی فریب کار مرد کی ملکیت ہو۔ وہ ایک قدم بھی چلنے سے معذور ہو گئی مگر افضال ایک مقناطیسی قوت بن گیا اور وہ کھچی ہُوئی اُس کے پیچھے پیچھے چلتی گئی۔

افضال اور برقعہ پوش نظام آباد کی طرف شہر سے دُور نکل گئے۔ ہاجرہ اُن کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔ وہ دونوں ریلوے لائن کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں جا رُکے۔ ہاجرہ کئی قدم دور پیچھے ایک درخت کے تنے کے ساتھ یوں بیٹھ گئی جیسے تھک کر، ہار کر گر پڑی ہو۔ اُسے اونگھ آنے لگی .... مکروہ سی غنودگی جیسے اُسے کسی نے دھوکے میں چرس، افیون یا بھنگ پلا دی ہو۔ جسم اور دماغ کی رہی سہی قوتیں بھی ٹھنڈی ہو گئیں۔ اُسے تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ وہ یہاں تک چلی کیوں آئی ہے؟ اور اب یہاں کیوں ڈھیر ہو گئی ہے؟ اچانک اُسے وہ وقت یاد آ گیا جب نو برس کی عمر میں اُس کی ماں کو اور باپ کو لوگوں نے دفن کر دیا تھا تو وہ دونوں قبروں کے درمیان گم سم بیٹھ گئی تھی۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔ پھر وہ سسکیاں لے لے کے رونے لگی۔

وہ شاید وہیں سو جاتی یا شاید وہاں سے چلی آتی یا جانے کیا کرتی لیکن اُس نے آنسوؤں کے دھندلکے میں دیکھا کہ عورت برقعہ اتار رہی ہے۔ ہاجرہ نے آنسو پونچھ کر دیکھا۔ عورت نے برقعہ اتار کر لپیٹا اور زمین پر رکھ دیا۔ ہاجرہ چونک اٹھی۔ وہ عورت نہیں تھی جس نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ وہ ایک آدمی تھا جس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ سر سے ننگا تھا۔



صوبیدار اکبر علی نے پناہ گزیں عورت کو چارپائی پر بٹھا دیا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے اُچھل کر باہر آ جائے گا۔ موم بتی کی تھرتھراتی لو میں اُس نے اس عورت کے

بالوں کو دیکھا۔ اُسے ہاجرہ یاد آگئی۔ ہاجرہ کے بال بھی اسی طرح جاذب نظر تھے۔ ہاجرہ کا خیال آتے ہی اُس کا دل یکبارگی ہلکا پھلکا ہوگیا جیسے اُس کا مسئلہ حل ہوگیا ہو۔

"مجھے ایک ایسی ڈیوٹی پر جانا ہے جو ٹل نہیں سکتی"— اکبر علی نے کہا —"میں تمھیں اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا سکتا۔ چلو، میں تمھیں ایک لڑکی کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔ وہاں تمھیں ڈر نہیں لگے گا۔ میں ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

اُس نے ٹھیک سوچا تھا۔ ہاجرہ کا خیال آتے ہی اُسے یہ سوجھ آگئی تھی کہ وہ اس عورت کو اقبال کے والد کے سپرد کر دے گا اور وہ لوگ اسے ہاجرہ کے کمرے میں جگہ دے دیں گے۔

"نہیں"— عورت بولی —"تم میرے ساتھ رہو۔"

"میں تمھارے ساتھ نہیں رہ سکوں گا"— اکبر علی نے ہاری ہوئی آواز میں کہا —"میں آدھی رات کے بعد آسکوں گا۔"

اُس نے گھڑی دیکھی تو چونک اٹھا۔ گاڑی وزیر آباد کے قریب آرہی تھی۔

"تھوڑی دیر بعد چلے جانا"— عورت نے رندھی ہوئی التجا کی —"میں سو جاؤں تو بے شک چلے جانا۔ ذرا دیر بیٹھ جاؤ..... میرے قریب بیٹھو"— اُس نے سر جھکا لیا۔

اکبر علی گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُس نے چونک کر ایک بار پھر گھڑی دیکھی۔ اضطراب اور ذہنی کش مکش اُس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔ اُس نے عورت کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے چہرہ ہاتھوں میں تھامے، یاس اور ناامیدی کا مرقع بنی بیٹھی تھی۔ موم بتی کی زرد روشنی اُس کے بالوں پر ناچ رہی تھی۔ ان بالوں میں ٹیڑھی مانگ کی سیدھی سپید لکیر اکبر علی کو پریشان کرنے لگی۔ اُس نے سوچا، یہ عورت ظفروال کی سرحد پر قیامت کی گولا باری سے بچ کر جانے دھول اور مٹی میں کہاں کہاں چھُپ چھُپ کر پا پیادہ کتنی ہی مسافت طے کر کے آئی ہے۔ جانے کتنے دن بھوکی پیاسی بھی رہی ہوگی۔ دل میں بچّے اور خاوند کا غم لیے اتنے دنوں سے رو رہی ہوگی۔

اُس نے عورت کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ پھر اس کی جھکی پلکوں کو نظر بھر کے دیکھا۔ عورت نے اپنے گال پر انگلیاں پھیلا دیں۔ لمبوتری انگلیوں کا حسن بالوں سے زیادہ مسحور کن تھا۔ اُس کے ہاتھوں، ہونٹوں، پلکوں اور رخساروں کی سپیدی مائل گلابی رنگت میں تازگی اور اشتعال انگیز حُسن کا نکھار تھا۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔

دو تین لمحے گزر گئے۔

عورت نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور اکبر علی کی طرف دیکھا۔ عورت کی آنکھیں خوف سے کھُل گئیں۔ اکبر علی نے دیکھا کہ ان آنکھوں میں جادو کا اثر تھا۔ اس قدر موہنی آنکھیں اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

عورت کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ اُس نے خوفزدہ ہو کر ایک ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ وہی اکبر علی جو ابھی ابھی فرشتہ تھا، اب درندے اور وحشی کے روپ میں اُس کے سامنے کھڑا اُسے چپ چاپ گھور رہا تھا — اکبر علی کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی عورت

کی طرف تھی۔

عورت پر سکتہ طاری ہوگیا۔ ہونٹ کپکپائے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ اکبر علی چپ چاپ اُس پر ریوالور تانے اُس کی جادو بھری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ کمرے میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ موم بتی کی لَو لرزنے لگی۔ دیوار پر اکبر علی کا سایہ ننگے بھوت کی طرح ناچ رہا تھا۔

"اٹھو"— اکبر علی نے دھیمی مگر قہر آلود آواز میں کہا۔

عورت آہستہ آہستہ اٹھنے لگی اور لڑکھڑاتی زبان میں بولی —"تم..... تم نے..... پستول کیوں نکال لیا ہے؟"

اکبر علی چپ چاپ اُس کی طرف بڑھا۔ عورت نے آہستہ سے دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھ لیے لیکن یوں تیزی سے ہاتھ ہٹا لیے جیسے اُسے کسی نے چونکا دیا ہو۔ اکبر علی کے لیے اتنا سا اشارہ کافی تھا۔ وہ انٹیلی جنس کا صوبیدار تھا۔ اشارے سمجھتا تھا۔

عورت پیچھے ہٹنے لگی لیکن چارپائی نے اُسے پیچھے نہ ہٹنے دیا۔ اکبر علی نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ اُس کے ازار بند پر رکھ کر اُسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ عورت نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اکبر علی نے اُسے اسی ہاتھ سے دھکیل کر چارپائی پر چِت گرا دیا اور اُس کے ہاتھوں کو جھٹک کر اُس کی قمیص ناف سے ہٹا دی۔

"بے غیرت!"— عورت نے چلّا کر کہا —"کافر..... مظلوم عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالتے شرم نہیں آتی؟ میں پاکستان کی لُٹی پٹی عورت ہوں....."

"کرنل گپتا مجھ سے زیادہ چالاک نہیں"— اکبر علی نے اُس کے ہاتھوں کو جھٹک کر فاتحانہ لہجے میں کہا —"وہ جانتا ہے وزیر آباد میں اُس کا گرائیں اور نمبری اکبر علی موجود ہے۔ برما فرنٹ پر میں اُس کے ساتھ نہ ہوتا تو سالا ایک رپورٹ ٹھیک سے نہ دے سکتا۔ میں اُسے اُٹھا کر نہ لاتا تو آج وہ جالندھر میں کرنل بنا نہ بیٹھا ہوتا۔"

عورت جیسے بے جان ہوگئی ہو۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ اکبر علی نے اُس کے ازار بند کو ڈھیلا کر دیا اور شلوار ذرا سی سرکا دی۔ عورت کی کمر کے گرد ناف سے نیچے کپڑے کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اکبر علی نے پیٹی کھول دی۔ اس کے ساتھ ۳۲ بور کا میگزین والا پستول بندھا ہُوا تھا جو ریوالور سے چھوٹا اور چپٹا ہوتا ہے۔

عورت بے حس لیٹی رہی۔ اب اُس کے چہرے پر نہ خوف تھا نہ مظلومیت کا کوئی تاثر بلکہ ہونٹوں پر تبسّم تھا جس نے اُس کے حُسن کی دل کشی کو اور زیادہ عریاں کر دیا تھا۔

"گاڑی کو کس پوائنٹ پر سبوتاژ کیا جائے گا؟"— اکبر علی نے ذرا پیچھے ہٹ کر پوچھا۔

"کون سی گاڑی؟"— عورت نے حیرت سے پوچھا اور شلوار اوپر کرنے کی بجائے اور نیچے سرکا دی۔

"فوراً بولو۔ وقت نہیں"— اکبر علی نے گرج کر کہا مگر اس قدر حسین اور جوان عورت کی عریانی نے اُس کی گرج میں لرزہ پیدا کر دیا۔

اُسے یوں لگا جیسے اسے اپنے خلاف خونریز جنگ لڑنی پڑے گی۔ عورت کا جسم تر و تازہ تھا۔ تھکن کے، گرد کے، مظلومیت کے کوئی آثار نہیں تھے۔

"تم جیت گئے" — عورت نے مسکرا کر کہا — "میں جاسوس ہوں۔ میں سمجھی تھی کہ پاکستان کے لوگ جذبات سے اندھے ہو گئے ہیں۔ میں تمہاری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ تم بھی ایک بہن کی بدحالی سے دیوانے ہو گئے تھے مگر...."

"میں پوچھ رہا ہوں ہماری گاڑی کو کس پوائنٹ پر تباہ کیا جائے گا؟" — اکبر علی ایک بار پھر گرجا۔

"میں جاسوس ضرور ہوں لیکن گاڑی کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں" — عورت نے مسکرا کر کہا۔ اس کی مسکراہٹ [illegible] گناہ تھی اور یہ مسکراہٹ طلسماتی تھی۔ اس نے کہا — "میرے پاس بیٹھ جاؤ نا، سب کچھ بتا دوں گی" — وہ لیٹے لیٹے ذرا پرے سرک گئی۔

یہ [illegible] اشتعال انگیز [illegible] تھی کہ اکبر علی کی مردانگی انگڑائیاں لینے لگی۔ اس نے اپنے خلاف جدوجہد کر کے پاکستانی صوبیدار کے پاؤں اکھڑنے نہ دیئے۔

"سنو کافر لڑکی!" — وہ [illegible] پڑا اور بولا — "جس ملک کو تمہارے ملک کی دس لاکھ فوج اور ساڑھے چار سو طیارے [illegible] اور ایک مرہٹہ [illegible] فتح نہیں کر سکے اسے ہندوستان کی ایک عورت تو کبھی جیت نہ سکے گی۔ [illegible] جنرل چوہدری کو شاید معلوم نہیں کہ پاک آرمی کا صوبیدار انڈین آرمی کے کرنل سے [illegible] ہوتا ہے" — اس نے گھڑی دیکھی اور اندازہ کیا کہ گاڑی چناب کے پل سے کتنی دور ہے۔ وہ چلا اٹھا — "گاڑی کو کہاں تباہ کیا جائے گا؟" — اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا — "میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا کافر لڑکی! میں ابھی دس بارہ چرسیوں، افیمیوں اور بھنگیوں کو بلا کر تمہیں ان کے حوالے کر دوں گا۔ صبح تک تم خارش سے مرتی ہوئی کتیا کی طرح تڑپ رہی ہو گی۔ تم پر کوئی رحم نہیں کرے گا۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی شلوار اس کے پاؤں میں گر پڑی — "میں سچ کہہ رہی ہوں سب کچھ بتا دوں گی" — اس نے فحش سی قسم کی مسکراہٹ سے کہا — "تم خود مرد نہیں ہو؟ خدا کے واسطے مجھے وحشیوں کے حوالے نہ کرنا۔ میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتی ہوں.... آؤ بیٹھو تو سہی" — وہ گناہ کا ہنستا مسکراتا پیکر بن گئی۔

اکبر علی کا دل بلند آواز سے دھڑکنے لگا۔ عورت کا یہ وار کام کرنے لگا۔ اکبر علی کی بیوی کو مرے اٹھارہ سال گزر گئے تھے۔ وہ فرشتہ نہیں تھا۔ انگریزوں کے دور کا فوجی تھا۔ اب تو وہ اس عمر کو پہنچ گیا تھا جس عمر کے آدمی کی طرف کوئی بدصورت اور زیادہ عمر کی عورت بھی نہیں دیکھتی۔ اس نے ہاجرہ کو گھر لانے کے بڑے جتن کیے تھے۔ ہاجرہ نے اس کی نیندیں حرام کر دی تھیں مگر اس کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ آج کی چپ چاپ رات اس قدر حسین ہندو لڑکی عریاں ہو کر اسے مسکرا مسکرا کر بلا رہی تھی — اس کے پاؤں اکھڑنے لگے — پاک آرمی کی آہنی جنس کے صوبیدار پر یوں نشہ سا طاری ہونے لگا جیسے اس کی ناک پر کلوروفارم سے آلودہ رومال رکھ دیا گیا ہو۔

"یاخداوند کریم!" — اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور دل ہی دل میں دعا کی — "یہ عورت پہلے کی طرح ڈری ہوئی پاکستانی عورت بن جائے اور رو رو کر مجھ سے پناہ مانگے۔"

اس نے اپنے وجود میں جھلسا دینے والی تپش محسوس کی۔ الاؤ بھڑک اٹھا۔ اس کے سامنے پاکستانی نہیں ہندوستان کی ایک جاسوس عورت کھڑی تھی.... نیم عریاں!

"سوچنے کیا ہو؟" — عورت نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی — "مرد سوچا تو نہیں کرتے۔ پندرہ بیس منٹ رک جاؤ، بڑی دلچسپ باتیں سناؤں گی۔"

▼

ایمونیشن سے لدی گاڑی چناب سے ذرا ہی دور رہ گئی تھی۔ ڈرائیور نے گھڑی دیکھی۔ سامنے چاندنی رات میں چمکتی پٹڑی کو دیکھا پھر رفتار کی سوئی دیکھی۔ پھر اس نے فائرمین کی طرف دیکھا۔ فائرمین نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے رفتار بڑھا دی اور ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ خدا سے گاڑی کی سلامتی مانگ رہا تھا۔ گاڑی کے پہیے پٹڑی سے اٹھنے لگے۔ اس پٹڑی پر اس قدر تیز گاڑی کبھی نہیں چلی تھی نہ یہ پٹڑی اتنی رفتار کے قابل تھی۔ ڈرائیور کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے لاہور کتنی جلدی اور کیوں اتنی جلدی پہنچنا ہے لیکن اسے کون بتاتا کہ پندرہ بیس منٹ تک اس کا انجن ڈائنامیٹ کے اوپر سے گزر رہا ہو گا اور....

اور وہ حسین عورت اکبر علی سے کہہ رہی تھی — "پندرہ بیس منٹ رک جاؤ، بڑی دلچسپ باتیں سناؤں گی۔ میں اقبالِ جرم کر چکی ہوں۔ میں جاسوس ہوں" — وہ اسے دعوتِ گناہ دے رہی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

اکبر علی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ اس کے ریوالور کی نالی عورت کی طرف تھی۔ ریوالور پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط تھی لیکن عورت کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اور اس کے وجود میں جو آگ بھڑکی تھی وہ بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔

عورت نے شکار مار لیا تھا۔

اکبر علی کے ہاتھ میں جو ریوالور تھا۔ اس کی نالی ابھی تک عورت کی طرف اور اکبر علی کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ جب وہ عورت کے قریب پہنچا تو اس کی سانس یوں پھول چکی تھی جیسے پہاڑی پر چڑھ رہا ہو۔ اس کی انگلی ٹریگر گارڈ میں رہی اور ریوالور پر اس کی گرفت چھوٹ گئی۔ ریوالور اس کی انگلی میں لٹک گیا۔ عورت کی مسکراہٹ اور زیادہ زہد شکن ہو گئی۔

عین اس وقت گاڑی کے محافظ دو طیارے نیچی پرواز کرتے گزر گئے۔ ان کی بلندی اس قدر کم تھی کہ کمرے کی چھت چھن چھن کرتی لرز گئی۔ اب کے یہ سیبر طیارے نہیں بلکہ دو ایف ۱۰۴ سٹار فائٹر تھے۔ ان کی بجلی جیسی گرج نے وزیر آباد کو بنیادوں تک ہلا ڈالا۔ اکبر علی کا سینہ اس کی چھت کی طرح لرزا۔ اس نے عورت کی طرف بڑی آہستگی سے آخری قدم بڑھایا تھا۔ یہ قدم صوبیدار کا نہیں ایک مرد کا تھا جو حسن و عریانی کی طرف کھنچا جا رہا تھا لیکن اپنے طیاروں کی دل ہلا دینے والی گرج سن کر آخری قدم آگے کی بجائے پیچھے آ گیا۔ ریوالور جو نیم عریاں حسن سے مرعوب ہو کر انگلی میں لٹک

گیا تھا، اپنے آپ اچھل کر اکبر علی کے ہاتھ کی گرفت میں آگیا اور نالی عورت کی طرف ہوگئی۔

اکبر علی کا بایاں ہاتھ بجلی کی طرح لپکا اور عورت کے دلکش بالوں کو مٹھی میں لے کر اس قدر زور سے جھٹکا دیا کہ عورت چیخ اٹھی۔ اکبر علی نے دانت پیس کر عورت کو دوہرا کر دیا اور ریوالور کی نالی اُس کی دو انگلیوں کے درمیان رکھ کر انگلیوں کو اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑا اور زور سے دبایا۔ عورت کی انگلیوں کی ہڈیاں جیسے ٹوٹنے لگی ہوں۔ اُس کے بالوں پر اکبر علی کے ہاتھ کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ اُس نے اُسے پیچھے کی طرف اس قدر دوہرا کر دیا کہ عورت کی ریڑھ کی ہڈی کے جوڑ چٹخنے لگے۔

عورت تڑپنے لگی۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے اس طرح پھوٹ آئے جیسے کسی نے پانی کا چھینٹا مار دیا ہو۔ اُس کے سپیدی مائل گلابی گال لال سرخ ہو گئے۔ نشیلی آنکھیں خون آلود ٹوٹیاں بن گئیں۔ اُس کے دانت کٹکٹانے لگے۔ اکبر علی بھول گیا تھا کہ وہ عورت ہے۔ اُس نے اس کے بالوں کو ایک اور جھٹکا دیا اور انگلیوں کو اور زیادہ دبا دیا۔ عورت کی چیخیں درد کی سسکیاں بن گئیں اور اُس کا جسم کانپنے لگا۔

"گاڑی کو کس پوائنٹ پر سبوتاژ کیا جائے گا؟" — اکبر علی نے غصے سے چلّا کر پوچھا اور ننگی گالی دے کر کہا — "اُس روز اکبر علی اپنے ریوالور سے خودکشی کر لے گا جس روز کپتا پاکستان کی گاڑی کو تباہ کرے گا.... فوراً بولو.... میں ابھی آدمیوں کو بلا کر تمہیں ان کے ساتھ اس کمرے میں بند کر دوں گا.... فوراً بولو" — اُس نے اس کی انگلیوں کو اور زیادہ دبایا۔

"ڈیڑھ کلومیٹر" — عورت نے کربناک سسکی لیتے ہوئے کہا — "میری انگلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

"کس طرف؟" — اکبر علی نے اُس کی انگلیوں سے ریوالور کی نالی نکالے بغیر پوچھا — "کہاں سے ڈیڑھ کلومیٹر؟"

"وزیرآباد سٹیشن کے آوٹر سگنل سے" — عورت نے کربناک آواز میں کہا — "لاہور کی طرف۔"

"کوڈ بولو" — اکبر علی نے گرفت ڈھیلی کر کے پوچھا — "کوڈ.... فوراً۔"

"رانا" — عورت نے ہچکی لی۔

"کہاں کا؟"

"جالندھر کا!"

"اور یہاں کا؟"

"راجا۔"

"ٹائم بم رکھا ہے یا ڈائنامیٹ؟" — اکبر علی نے اُس کے بالوں کو چھوڑ کر اور اُس کی انگلیوں سے ریوالور کی نالی نکال کر پوچھا۔

"ڈائنامیٹ" — عورت نے اپنی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ سے دباتے ہوئے مری سی آواز میں جواب دیا۔

صوبیدار اکبر علی جانتا تھا کہ ڈائنامیٹ جو ریل گاڑیوں کے نیچے رکھا جاتا ہے وہ پہاڑوں کا جگر چاک کر دیا کرتا ہے۔ اتنے وزنی ریلوے انجن کو ہوا میں کھلونے کی طرح اچھال دیتا ہے۔ اُسے خیال آیا کہ

ریل گاڑی تباہ ہوگئی تو اُس کے ڈبوں میں توپوں کے جو گولے بھرے ہوئے ہیں وہ پھٹیں گے۔ ہو سکتا ہے ان گولوں کے ٹکڑے اُڑ کر وزیرآباد جا پہنچیں۔

"کیا تم یہاں صرف مجھے پھانسنے آئی تھیں؟" — اکبر علی نے اُس سے پوچھا۔

"اور کچھ نہیں بتاؤں گی" — عورت نے کہا — "میں تمہیں یہ بتا دیتی ہوں کہ ایک صوبیدار اتنی اہم شخصیت نہیں ہوتا کہ مجھ جیسی قیمتی عورت اُس کے پیچھے ڈال دی جائے۔ مجھے لاہور سے بلایا گیا تھا۔ میرا کام کچھ اور تھا۔ یہاں آکر مجھے یہ کام دے دیا گیا۔"

"کیا تم مجھے اپنا پورا راز نہیں دو گی؟"

"نہیں!" — عورت نے کہا — "جو بتانا تھا وہ بتا دیا ہے.... اور سنو! میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گی۔ میری بات غور سے سنو۔ تمہیں اتنی دولت دلاؤں گی جو تمہاری سات پشتوں کے لیے بہت ہوگی۔ بیوی چاہیے تو مجھ سے زیادہ خوبصورت بیوی ملے گی۔"

"میں ہندوستان کا جاسوس بن جاؤں؟" — اکبر علی نے پوچھا۔

"اگر جاسوس بن جاؤ تو نوابوں جیسی عیش کرو گے" — عورت نے کہا — "اس وقت صرف اتنا کام کرو کہ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں صبح تک تمہارے ساتھ رہوں گی اور نقد رقم الگ دلاؤں گی۔"

"اوہ!" — اکبر علی جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو — "گاڑی.... میں اس گاڑی کی قیمت نہیں لوں گا۔"

اُس نے بڑی تیزی سے اُس چارپائی کی ادوائن کھولی جس پر یہ ہندو عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ اکبر علی جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ اُس نے عورت کے ہاتھ ادوائن سے باندھ دیئے۔ وہ اکبر علی کو لالچ دے رہی تھی۔ اکبر علی نے ایک کپڑا لا کر عورت کے منہ میں ٹھونس دیا پھر اُس کے پاؤں اسی ادوائن سے باندھ دیئے اور اُسے اُس چارپائی پر پھینک دیا جس سے اُس نے ادوائن نکالی تھی۔

"واپس آکر بات کروں گا" — اکبر علی نے کہا اور موم بتی کو پھونک مار کر باہر کو دوڑ پڑا — "میرے خدا! اپنے نام کی لاج رکھنا۔ مجھے گاڑی سے پہلے ڈائنامیٹ تک پہنچا دینا" — وہ دوڑتا اور خدا کو پکارتا جا رہا تھا۔

کیپٹن طارق کو اطلاع دینے کا وقت نہیں تھا۔ ریل گاڑی چناب کے پُل پر آگئی تھی۔ رات کی خاموشی میں اکبر علی کو گاڑی کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ سٹیشن کے دونوں سگنل، آوٹر اور سٹارٹر ڈاؤن ہو گئے تھے۔ سٹیشن کے عملے کا ایک آدمی ہری بتی ہاتھ میں لے کر لائن سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا کہ ڈرائیور کو یقین ہو جائے کہ لائن کلیئر ہے۔

▼

ہاجرہ نے جب برقعہ پوش کو برقعہ اتار کر پرے پھینکتے دیکھا کہ وہ عورت نہیں آدمی ہے تو وہ آنسو پونچھ کر بیدار ہوگئی۔ افضال اور وہ آدمی ریلوے لائن تک گئے۔ لائن کی دوسری طرف سے ایک اور آدمی آگیا۔ تینوں لائن پر جھک گئے۔ ہاجرہ اپنے آپ میں آچکی تھی لیکن اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ

وہ سب ریلوے لائن پر کیا کر رہے ہیں۔

وہ انہیں دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک رات کے سکوت میں ہیبت ناک گڑگڑاہٹ ابھری، رات لرزنے لگی۔ ایمونیشن اور جنگی سامان سے لدی ہوئی مال گاڑی وزیرآباد سے ذرا ہی پرے چناب کے پُل سے گزر رہی تھی۔ پھر انجن کی تیز "چھک چھکا چھک" سنائی دینے لگی۔

ہاجرہ کا رواں رواں بیدار ہو گیا۔ اُس کے منہ سے گھبرائی ہوئی سی سرگوشی نکلی ——"کوئی گاڑی آ رہی ہے"—— اُس کے شل جسم اور ماؤف دماغ میں از خود تازگی آ گئی اور اُس کی ہاری ہوئی قوتیں آپ ہی آپ جاگ اُٹھیں۔

اُسے اقبال کی آواز سنائی دی ——"دشمن کے جاسوس ریلوے لائن پر بم رکھ دیتے ہیں۔"

پھر اکبر علی کی آواز ——"افضال ہندوستان کا جاسوس ہے۔"

ہاجرہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دیکھا، افضال ریلوے لائن پر بیٹھا کچھ کر رہا تھا۔ اُس کے ساتھی اُس کے قریب پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ ہاجرہ کی نبضیں تیز ہو گئیں لیکن اُسے معلوم نہ تھا وہ کیا کرے۔ اُس نے سوچا کہ وہ بھاگ کر افضال سے کہے، دیکھو افضال جی! مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میرے ملک کی گاڑی کو تباہ نہ کرو —— لیکن اُس نے راہِ فرار ڈھونڈ لی اور اپنے آپ سے کہا ——"نہیں، افضال بہت پیارا آدمی ہے، وہ جاسوس نہیں ہو سکتا"—— مگر اس خیال نے اُسے ذرہ بھر سکون نہ دیا۔ کوئی اجنبی سی قوت اُسے اپنے تابع کر چکی تھی۔

اُس نے اپنے آپ کو فریب دینے کی بہت کوشش کی لیکن اُس کے سامنے اقبال کی اندھی آنکھیں آ گئیں۔ یہ دو آنکھیں دو لاکھ آنکھیں بن گئیں —— پاک فوج کے جیالے جانبازوں کی اندھی آنکھیں —— وہ سپاہی جو ٹرکوں میں وزیرآباد شہر سے "یا علیؓ" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے سیالکوٹ اور لاہور کی طرف گزرتے رہتے تھے اُسے اندھوں اور اپاہجوں کے جلوس کی صورت واپس آتے نظر آتے۔ دو لاکھ ماؤں کے شہزادے، اقبال کی طرح بھرپور جوان اور گبھرو —— ہاجرہ کے سینے میں بم پھٹا اور وہ ریلوے لائن کی طرف چل پڑی۔ اُسے بائیں طرف سے، درختوں کے جھنڈ میں ایک اور آدمی تیز قدم آتا نظر آیا۔ ہاجرہ رُک گئی۔

طیارے آگے جا کر پھر پیچھے آتے۔ ریل گاڑی وزیرآباد ریلوے سٹیشن میں داخل ہوتی تو اُسے ذرا آہستہ ہو جانا چاہیے تھا۔ گاڑی کو پٹڑیاں بدلنی تھیں۔ تیز رفتاری سے گاڑی پٹڑی سے اُتر سکتی تھی لیکن ڈرائیور نے ذرہ بھر پرواہ نہ کی۔ اُس نے سبز بتیاں دیکھیں اور اُسی رفتار پر رن تھرو ہو گیا۔ گاڑی کے پہیوں نے ایک سے دُوسری پٹڑی پر ہوتے ہوتے دھماکوں جیسا شور بلند کیا اور گاڑی سٹیشن سے نکل گئی۔

ریلوے لائن سے ڈیڑھ پونے دو میل دور دو ملنگوں نے ڈیمو ایکسپلوڈر سے ملاتے ہوئے تار کو آخری بار چیک کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ گاڑی وزیرآباد ریلوے سٹیشن سے رن تھرو ہو گئی ہے۔ تباہی کے مقام تک پہنچنے میں چند منٹوں کا عرصہ رہ گیا تھا۔ ڈائنامیٹ لائن کے سلیپر کے نیچے رکھا تھا۔ افضال نے دونوں تار ہاتھ میں پکڑے ہوتے ڈیٹونیٹر سے ملا دیئے اور ڈیٹونیٹر کو ڈائنامیٹ میں صحیح جگہ پر رکھ دیا۔ اب ملنگوں کے بٹن دبانے کی دیر تھی۔ افضال اور اُس

کے ساتھی ریلوے لائن سے پرے اتر گئے۔ انہیں اب ڈائنامیٹ کی زد سے دُور ہو جانا تھا۔

▼

گاڑی وزیرآباد ریلوے سٹیشن سے نکل کر آؤٹر سگنل سے بھی آگے آ گئی تھی جو آدمی درختوں کے جُھنڈ میں ہاجرہ کو نظر آیا تھا، اسے ہاجرہ نظر نہ آئی۔ وہ آدمی تیزی سے ہاجرہ کے قریب سے گزر گیا۔ ہاجرہ نے اُسے پہچان لیا —— وہ صوبیدار اکبر علی تھا جو دوڑتا ہُوا ریلوے لائن پر جا چڑھا اور جھک کر لائن کو دیکھنے لگا۔ ہاجرہ بھی اُس کی طرف دوڑ پڑی۔

رات کا سکوت جو تیزی سے آتی گاڑی کے شور سے لرز رہا تھا ریوالور کے دھماکے سے دہل گیا۔ اکبر علی یک لخت سیدھا ہُوا۔ اُس نے ناف کے قریب ہاتھ رکھا، دُہرا ہُوا، اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کر گر پڑا —— جاسوسوں کے ریوالور کی گولی اُس کے کولھے سے ٹانگ کے جوڑ کو کاٹتی پار ہو گئی تھی —— ہاجرہ دوڑتی اُس تک پہنچی۔ اس سیدھی سادی بلکہ بُدھو لڑکی کو تو کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اُسے یہ احساس ضرور تھا کہ کچھ ہو رہا ہے اور اُسے کچھ کرنا چاہیے۔

گاڑی ایک میل سے بھی کم دور رہ گئی تھی —— ایک منٹ کا عرصہ جو بڑی تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ دُور پرے درخت تلے ایک ملنگ نے ڈیمو ایکسپلوڈر کے بٹن پر انگلی رکھ دی اور چھوٹا سا ایک وائرلیس سیٹ کان سے لگا لیا۔ وہ اشارے کا منتظر تھا —— پاک فوج کی فتح و شکست کا دارومدار ایک بہروپیے کی انگلی کی جُنبش پر تھا۔

گاڑی دو فرلانگ تک آ گئی۔ انجن کی بتی بُجھی ہوئی تھی اور ڈرائیور رفتار کے میٹر کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے گمان تک نہ تھا کہ وہ موت سے ایک لمحے کے فاصلے پر پہنچ گیا ہے اور یہ فاصلہ اُس کی سانسوں سے بھی زیادہ تیزی سے کم ہو رہا ہے —— چند سانسیں، چند ثانیے!

جالندھر میں کرنل گپتا بے تابی سے گاڑی کی تباہی کی رپورٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

لائن سیدھی تھی۔ ڈرائیور نے انجن کی رفتار اور تیز کر دی اور اپنی گھڑی کی سوئیوں پہ نظریں جما کر حساب کرنے لگا کہ وہ گاڑی کو کتنی جلدی لاہور پہنچا سکتا ہے۔ تمام محاذوں پر قیامت بپا تھی۔ ریتر ابشلان ایمونیشن اور پٹرول کا انتظار کر رہا تھا۔ انڈین آرمی کی ٹینک رجمنٹ نے ڈویژنل آرٹلری کے کور میں کھیم کرن کے مورچوں پر فیصلہ کُن حملہ کر دیا تھا۔ فائر بندی میں تین روز باقی تھے اور جنرل چوہدری پاک فوج سے کم از کم کھیم کرن واپس لینے کے لیے پاگل ہُوا جا رہا تھا۔

ہاجرہ اکبر علی تک پہنچی تو اکبر علی نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا۔ ہاجرہ چلّا کر بولی ——"اکبر علی!"

گاڑی اور قریب آ گئی۔ اکبر علی کا معذور جسم زمین کا لرزہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے ہاجرہ کی آواز پر گھوم کے دیکھا۔

”کون ؟ ہاجرہ !“ — اُس نے کہا ”تم بھی کافروں کے ساتھ آتی ہو بے غیرت !“ — اُس نے پہلو سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی تو رینگ کر پٹڑی کے اوپر آ گیا۔ گاڑی اژدہا کی طرح غرّاتی پھنکارتی سر پر آ پہنچی۔

”میں کسی کافر کے ساتھ نہیں آئی“ — ہاجرہ نے اکبر علی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا اور اُسے بازو سے گھسیٹنے لگی۔ سخت گھبراتے ہوتے لہجے میں بولی — ”اِدھر ہو جاؤ اکبر ! گاڑی آ رہی ہے۔ کچلے جاؤ گے۔“

”ہاجرہ !“ — اکبر علی چلّایا۔ گاڑی کے شور سے آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ چلّا کر بولنا پڑتا تھا۔ اکبر علی نے کہا ”ہاجرہ ! اُدھر دیکھو۔ اُدھر آگے کوئی تار ہو گی۔ کوئی رسّی ہو گی، اسے کھینچ لو .... جلدی، ہاجرہ، جلدی، .... کوئی تار یا رسّی .... میں اُٹھ نہیں سکتا۔ گاڑی آ رہی ہے“

اُس نے ریوالور نکال لیا۔

ملنگ کی انگلی بٹن دبانے کو تیار تھی۔ ادھر ہاجرہ اکبر علی کے اشارے پہ اُٹھ دوڑی۔ گاڑی آن پہنچی .... دس سیکنڈ .... آٹھ سیکنڈ .... چھ سیکنڈ !

ایک اور گولی چلی جو ہاجرہ کے دائیں بازو میں لگی۔ ہاجرہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑائی اور گر پڑی۔

”ہاجرہ“ — اُسے اکبر علی کی للکار سنائی دی — ”مرنے سے پہلے تار کھینچ لینا“۔

ہاجرہ گر کر اُٹھی۔ جاسُوس کی گولی اُسے جان سے نہ مار سکی۔ ایک اور گولی چلی جو خطا گئی۔ ہاجرہ لائن کو دیکھتی آگے چلی گئی۔ چاندنی میں زمین نظر آ رہی تھی۔

ایک آدمی پیچھے سے دوڑتا آیا اور ہاجرہ کو دبوچ لیا لیکن وہ اس قدر تیزی سے آیا تھا کہ سنبھل نہ سکا اور ہاجرہ سمیت آگے کو گر پڑا۔ ہاجرہ اس کے نیچے تھی۔ اُس کا ایک بازو ریوالور کی گولی نے معذور کر دیا تھا۔ اس آدمی نے اُسے دبوچ بھی رکھا تھا۔ اُدھر سے افضال دوڑتا ریلوے لائن پر چڑھا۔ اِدھر سے اکبر علی کا ریوالور چلا۔ گولی افضال کی پیشانی میں لگی اور کھوپڑی سے پار ہو گئی۔ افضال پیچھے کی طرف گِرا، پھر اُٹھ نہ سکا۔ اکبر علی نے پیٹ کے بل رینگنے کی کوشش کی لیکن اُسے گولی ایسی جگہ لگی تھی کہ وہ رینگ بھی نہیں سکتا تھا۔

ہاجرہ اس آدمی کے نیچے منہ کے بل گری تھی۔ اُس کی نظر پڑ گئی۔ ایک تار اُس کے مُنہ کے نیچے تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اسی تار کے متعلق اکبر علی نے کہا تھا یا وہ کوئی اور تار تھا۔ اُس نے اسی تار کو دانتوں میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ اُس آدمی نے جو ہاجرہ کے اوپر تھا، ہاجرہ کو اٹھا کر پٹخنی دی۔ اُدھر ملنگ نے ڈینمو ایکسپلوڈر کا بٹن دبا دیا لیکن ہاجرہ نے تار کو دانتوں سے کھینچ کر ڈائنامیٹ سے الگ کر دیا تھا۔ تار ابھی تک ہاجرہ کے منہ میں تھا۔ ڈائنامیٹ کی جگہ صرف ڈیٹونیٹر پھٹا۔ یہ ایک شرارہ تھا جو چمک کر بجھ گیا۔ ہاجرہ خوش قسمت تھی کہ ڈیٹونیٹر دُور تھا ورنہ اس کا سر اور مُنہ اُڑ جاتے۔ اُسے جیسے محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اُس کے بازو میں گولی لگی ہے۔ ہڈی بچ گئی تھی۔ گولی پٹھے سے گذری تھی اور خون تیزی سے نکل رہا تھا۔

گاڑی کا انجن اکبر علی سے ایک قدم دُور تھا اور وہ ڈائنامیٹ سے تار الگ کروانے میں اس قدر محو تھا کہ اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھی۔ اُدھر انجن اُس کے اُوپر آن پہنچا اِدھر وہ ریلوے لائن کے اندر کی طرف ہو گیا اور پیٹ کے بل ہو کر سر زمین سے لگا دیا۔ گاڑی آدھے منٹ سے بھی کم عرصے میں اُس کے اوپر سے گزر گئی۔ ہاجرہ کو جس آدمی نے پکڑا اور گرایا تھا، وہ بھاگ گیا۔

▼

جالندھر میں کرنل گپتا گاڑی کی تباہی کی اطلاع کے انتظار میں بے چین تھا۔ وہ وائرلیس آپریٹر سے بار بار پوچھتا تھا کہ اطلاع آتی ہے یا نہیں۔ آخر اُسے اطلاع مل گئی لیکن اُس وقت ملی جب گاڑی خیریت سے لاہور پہنچ گئی تھی۔

پاک فوج کے سرفروش ٹرک ڈرائیور لاہور ریلوے سٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ بہت سے پرائیویٹ ٹرک ڈرائیور بھی اپنے ٹرکوں سمیت موجود تھے۔ ایمونیشن گاڑی سے اُتار کر ٹرکوں میں لادنے کے لیے فوجیوں کے علاوہ ریلوے سٹیشن کے تمام قلی آن پہنچے۔ رات ہی رات لاہور کھیم کرن سیکٹروں میں ایمونیشن اور پٹرول پہنچا دیا گیا۔ توپیں اور ٹینک کھیم کرن کی طرف روانہ ہو گئے۔

پولیس کانسٹیبل اُس وقت دھونکل کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ مال گاڑی گزر گئی ہے تو وہ ریلوے لائن سے ہٹ کر تھانے پہنچ گئے۔ ہاجرہ لائن کے قریب بے ہوش پڑی تھی۔ ایک تو اُس کا خون زیادہ نکل گیا تھا، دوسرے یہ کہ جب اُس آدمی کے دھکے سے وہ گِری تھی اُسے ماتھے پر شدید چوٹ آئی تھی۔ ماتھا پتھروں پر لگا تھا۔

پہلے تو وہ ہوش میں رہی پھر ہوش کھو بیٹھی۔

اکبر علی نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اُٹھ سکا۔ اُس نے ہاجرہ کو آوازیں دیں، مگر جواب نہ ملا۔ وہ رینگنے لگا۔ اُس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ حلق میں کانٹے چُبھ رہے تھے۔ ہاجرہ تک پہنچنے کے لیے اُسے بیس پچیس گز رینگنا پڑا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ٹانگ جسم سے الگ ہو گئی ہو لیکن اُس نے اپنے زخم کو دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ہاجرہ کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہاجو !“ — اُس نے ہاجرہ کو بلایا پھر ہلا کر بلایا — ”ہاجو بیٹی !“

ہاجرہ بے ہوش تھی۔

اکبر علی نے دیکھا کہ ہاجرہ کی پیشانی، سے خون بہہ رہا تھا۔ ہیبت ناک زخم بازو کا تھا جہاں سے ریوالور کی گولی پار ہو گئی تھی۔ اس زخم کی راہ اس کے جسم کا سارا خون بہہ گیا تھا۔ ڈائنامیٹ کا تار ابھی تک ہاجرہ کے دانتوں میں جکڑا ہُوا تھا۔ اکبر علی نے تار اُس کے دانتوں سے نکالا۔ ذرا پرے افضال کی لاش پڑی تھی۔

▼

اکبر علی نے سوچا کہ زور زور سے پکارے، شاید کوئی مدد کے لیے آن پہنچے، لیکن وہ

اس خیال سے چُپ رہا کہ بھارتی جاسوس کہیں قریب ہی نہ ہوں۔ اُس نے ریوالور نکال لیا۔ وہ ہاجرہ کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے ہاجرہ کو اس ارادے سے بازوؤں پر اٹھا لیا کہ اسے سڑک تک لے جا سکے لیکن وہ اُٹھ تو سکتا نہیں تھا، اُس نے بیٹھے بیٹھے سرکنے کی کوشش کی مگر کولہے کے گہرے زخم اور خون کی مہلک کمی نے اسے ایک انچ بھی سرکنے نہ دیا۔ وہ بے بس ہو گیا۔

اسے معاً یاد آیا کہ برما فرنٹ پر وہ ایک بار گپتا کو شدید زخمی حالت میں کندھوں پر اُٹھا لایا تھا مگر آج اُس کی ٹانگ کا رشتہ ہی جسم سے ٹوٹ گیا تھا۔

گپتا کا خیال آتے ہی اُس کے جسم کا بچا کھچا خون اُبلنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ وہ ایک کافر کو جان پر کھیل کر بچا لایا تھا مگر اپنی قوم کی بیٹی اس کے ہاتھوں میں مر رہی ہے۔ اُس نے ہاجرہ کے بے حس جسم کو بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں ہاجرہ کے چہرے کو دیکھا۔ اُس کے دل سے ہوک اٹھی۔ اُس نے دیوانہ وار ہاجرہ کو سینے سے لگا لیا۔

"ہاجو!" — اُس نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا — "مرنے کے لیے ہم فوجی ابھی زندہ تھے، تو یہاں کیوں چلی آتی تھی؟"

اُس کے سینے میں بجلی کوندی۔ اُس نے ہاجرہ کو بازوؤں میں مضبوطی سے سنبھالا اور جسم کی تمام تر قوت صرف کر کے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے گرج کر نعرہ لگایا — "یاعلی مشکل کشا" — اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بے ہوش ہاجرہ اس کے بازوؤں پر تھی۔

اس نے قدم اٹھانے کی کوشش کی اور بولا۔ "ہاجو! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا" — لیکن اُس کے زخمی کولہے والی ٹانگ تھر تھر کانپنے لگی۔

جسم سے جیسے سارا خون نکل گیا تھا۔ اکبر علی کے سامنے ریلوے لائن کی چمکتی ہوئی دو لکیریں چکر میں گھومتی نظر آئیں پھر گرد و پیش کے درخت بھی اس چکر میں گھومنے لگے۔ اکبر علی کو آسمان کے تارے زمین پر گرتے نظر آتے۔ اُس نے محسوس کیا جیسے اُس کے گھٹنے ریلوے لائن کے پتھروں کو چھو رہے ہوں۔ اُس نے گھٹنوں کو ایک بار پھر اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ ساتھ ہی ہاجرہ کو بازوؤں میں اور مضبوطی سے سنبھال لیا مگر اُس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

▼

اُس کا حوالدار گاڑی گزر جانے کے بعد اُس کے گھر گیا لیکن اُس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ بہت دیر دفتر میں اس کا انتظار کرتا رہا لیکن رات گزرتی چلی گئی اور وہ نہ آیا۔ سحر کی تیرگی چھٹ رہی تھی جب دو دیہاتیوں نے تھانے میں اطلاع دی کہ ریلوے لائن کے قریب تین لاشیں پڑی ہیں۔

تھانے دار چند کانسٹیبلوں کو لے کر وہاں گیا۔ وہ صرف اکبر علی کو پہچانتا تھا اور اُسے معلوم تھا کہ اکبر علی یہاں کیا کرنے آیا ہوگا لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ ریلوے لائن کے نیچے کہیں ڈائنامیٹ

رکھا ہوا ہے۔ اُس نے دیکھا اکبر علی اور ہاجرہ کی نبضیں مری مری چال چل رہی تھیں اور افضال مر چکا تھا۔ پولیس دونوں کو اور افضال کی لاش کو ہسپتال اٹھا لے گئی۔

کیپٹن طارق کو اطلاع دی گئی۔ وہ دوڑتا ہسپتال پہنچا۔ وہاں سے تھانے جا کر اُس نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو فون کیا۔ دو گھنٹے تک ملٹری پولیس کے دو افسر پہنچ گئے۔ اکبر علی اور ہاجرہ کو خون دیا جا رہا تھا لیکن وہ ابھی تک بے ہوش تھے۔ تھانیدار کی نشاندہی پر ملٹری پولیس کے افسر ریلوے لائن کے قریب اُس مقام پر پہنچے جہاں سے اکبر علی اور ہاجرہ کو اٹھایا گیا تھا۔ انہوں نے ریلوے لائن کے قریب ڈائنامیٹ کا تار دیکھا۔ وہ ساری بات سمجھ گئے اور لائن کو دیکھنے لگے۔ ایک جگہ انہیں سلیپر کے نیچے ڈائنامیٹ کا سلیب پڑا مل گیا۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

دونوں افسر تار کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن سے دُور تک چلے گئے۔ وہاں درختوں کا جُھنڈ تھا اور چھوٹا سا ایک گڑھا اور پاؤں کے نشانات تھے۔

تھانے دار نے کھسیانا سا ہو کے کہا — "میں شرمندہ ہوں کہ یہ جاسوس میرے علاقے میں موجود تھے۔"

"تھے نہیں، موجود ہیں" — ایک افسر نے کہا — "ذرا بیدار رہیں۔"

دوسرے روز اکبر علی اور ہاجرہ ہوش میں آ گئے۔ ڈاکٹروں نے اُن کے جسموں کا خون پورا کر دیا تھا۔

"میرے گھر میں جا کے دیکھو" — اکبر علی نے ہوش میں آتے ہی کہا — "وہاں چارپائی کے ساتھ ایک عورت رسّیوں سے بندھی ہوئی ہو گی۔ اُسے فوراً ملٹری پولیس کے حوالے کر دو۔ میں اسی کی نشاندہی پر ریلوے لائن پر پہنچا تھا جہاں ڈائنامیٹ رکھا تھا۔ وہ عورت انڈیا کی جاسوس ہے" — پھر اُس نے ہاجرہ کے کارنامے کی تفصیل سنائی۔

ہاجرہ نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ کس طرح افضال کے پیچھے ریلوے لائن تک پہنچی تھی۔ افضال کی لاش بھی ہسپتال لائی گئی تھی۔ سب نے دیکھا کہ وہ مسلمان نہیں تھا۔ ہاجرہ کے متعلق اُس کے گھر والوں کو صبح کے وقت پتہ چل گیا تھا کہ وہ ہسپتال میں پڑی ہے۔ اقبال کے ماں باپ ہسپتال پہنچے۔

▼

جب ہاجرہ ہسپتال سے اچھی بھلی ہو کے نکلی تو جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اقبال صحت یاب ہو کے گھر آ گیا تھا اور وہ بدستور بینائی سے محروم تھا۔ وہ رہ رہ کر ہاجرہ کو اپنے پاس بلاتا تھا اور وہ اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی لیکن گم صُم۔ اُس کی ذہنی حالت بے ٹھکانہ تھی۔ وہ تو اس فاتحانہ حقیقت سے ہی بے نیاز تھی کہ جس گاڑی کو اُس نے تباہی سے بچایا ہے اُس نے بھارتیوں کے فیصلہ کُن حملوں کو کس بُری طرح ناکام بنایا ہے۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ عمر میں صرف ایک انسان ملا تھا جس نے اُسے کھویا ہوا پیار دیا تھا مگر وہ بھی دشمن کا جاسوس نکلا۔

ہاجرہ کو کوئی بلاتے تو بولتی تھی ورنہ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی تھی۔ گھر والوں نے اُسے بہت بڑا انعام دیا۔ وہ یہ کہ اُنھوں نے گھر میں ایک ادھیڑ عمر ملازمہ رکھ لی اور ہاجرہ کو کہا کہ وہ گھر کے کام کاج کی صرف دیکھ بھال کیا کرے۔ اُنھوں نے اُس کی حیثیت بھی اور تنخواہ بھی زیادہ کر دی۔

لیکن سب سے بڑا انعام اسے اقبال نے دیا۔ ایک روز اقبال نے اسے کمرے میں بُلایا تو وہ اُس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے ہاجرہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

"ہاجو!" — اقبال نے کہا "تم نے مجھے کہا تھا کہ میری آنکھیں لے لو۔"

"لے لو نا اقبال جی!" — اُس نے کہا "میں تو اب بھی کہتی ہوں معلوم نہیں تم کیوں میری آنکھیں نہیں لیتے؟"

"کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے ہاجو!" — اقبال کے آنسو نکل آئے اور وہ چُپ ہو گیا۔ ہاجرہ سُن سی ہو گئی۔ اقبال نے بے تابانہ کہا — "مجھے آنکھیں نہیں چاہئیں ہاجو! مجھے تمہارا سہارا چاہیے۔ عمر بھر کے لیے .... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اندھے کا پیار قبول کرو گی ہاجو؟ مجبور نہیں کروں گا۔ تم میری روح کی آنکھیں ہو ہاجو!"

آہ، کس قدر بے بسی تھی اقبال کی التجا میں۔ ایک وہ وقت کہ اُس نے ہاجرہ کی آبرو کو دو روپے میں خریدنا چاہا تھا اور آج یہ گھڑی کہ اُس سے محبت اور سہارے کی بھیک مانگ رہا تھا۔ ہاجرہ نے بھی دنیا والوں سے پیار کی بھیک مانگی تھی۔ وہ جانتی تھی پیار کے پیاسوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ اُس نے سوچا، کیا کوئی اچھی بھلی لڑکی اقبال کو قبول کرے گی؟ کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کو کسی اندھے سے بیاہ دے گی؟ — اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے دوپٹے کا آنچل تھاما اور اقبال کے آنسو پونچھ ڈالے۔

اور پندرہ روز بعد وزیر آباد میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ چوہدری کرامت علی کے بیٹے نے اپنی نوکرانی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔

اگر یہ شادی عام حالات میں ہوتی تو لوگ سَو سَو باتیں بناتے لیکن سب جانتے تھے کہ اقبال کے ماں باپ نے اپنی نوکرانی کو کیوں کر بہو بنا لیا ہے۔

لیکن بارات کہاں سے جاتی؟ ڈولی کہاں سے اُٹھتی؟ اس کمی کو اکبر علی نے محسوس کیا تھا۔ وہ ہسپتال سے فارغ ہو کر اکثر اقبال کے پاس جایا کرتا تھا۔ اُس کی ایک ٹانگ ریوالور کی گولی لگنے سے خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ بالائی جوڑ پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ لنگڑا کر چلتا تھا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ اقبال ہاجرہ کے ساتھ شادی کر رہا ہے تو وہ بہت ہی خوش ہوا تھا۔

"لیکن ہاجو بیٹی کی ڈولی تو کسی آنگن سے اٹھنی چاہیے" — اُس نے بےساختہ کہا تھا — "اقبال میاں! تمہاری بارات تو کہیں جانی چاہیے۔"

اور وہ شادی سے دو روز پہلے ہاجرہ کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ اُس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو بلا لیا تھا جنھوں نے ہاجرہ کو بڑے پیار سے دُلہن بنایا تھا۔ اکبر علی نے اُسے جہیز بھی دیا تھا اور اقبال کی بارات آ کے ڈولی لے گئی تھی۔

▼

اعلانِ تاشقند کے بعد اقبال کا ایک ساتھی لیفٹیننٹ اُسے دیکھنے وزیر آباد آ گیا۔ اقبال نے بے تاب ہو کر کہا کہ مجھے بی آر بی تک لے چلو۔ لیفٹیننٹ کے پاس جیپ تھی۔ اقبال نے ہاجرہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ ہاجرہ بڑے پیار سے اقبال کا ہاتھ تھامے اُسے جیپ تک لے گئی۔

جیپ بیدیاں سیکٹر میں بی آر بی کے کنارے جا رُکی۔ وہاں اب خاموشی تھی۔ بنگالیوں کے نعرے اور اُن کی للکار، اُن کے جذبے اور پاکستان کی آن پر مر مٹنے کے عزم تاشقند کی مٹی میں دفن ہو چکے تھے۔ میدان میں جیتی ہوئی بازی میز پر ہار دی گئی تھی اور جنگِ ستمبر ایک بے مقصد جنگ بنا دی گئی تھی۔ اقبال ہاجرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا تھا جیسے اُسے ابھی کسی بنگالی کی آواز سنائی دے گی — "فکر نئیں شاب! دشمن آگے آ نئیں سکے گا" — مگر وہاں خاموشی تھی۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔

"مجھے ذرا نہر کے کنارے کے اوپر لے چلو ہاجو!" — اقبال نے کہا۔

اقبال کا دوست لیفٹیننٹ جیپ میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ اُس نے میاں بیوی کو اکیلا چھوڑنا مناسب سمجھا تھا۔

ہاجرہ اقبال کا ہاتھ تھامے نہر کے کنارے کے اُوپر چڑھ گئی۔ اقبال کو نہر کی روانی کا جلترنگ سنائی دینے لگا۔

بی آر بی کمال تمکنت سے بہہ رہی تھی۔ پرے ایک پُل ٹوٹا ہُوا تھا اور اس کے ساتھ ہی پاک فوج کے فیلڈ انجینئرز کا بنایا ہُوا لوہے کا عارضی پُل تھا۔

"یہاں ہاجو!" — اقبال نے شگفتہ اور فاتحانہ لہجے میں کہا — "یہاں ہم نے دشمن کو روکا تھا .... میں اِس مٹی کی بُو سونگھ رہا ہوں۔ یہی جگہ تھی۔ میں بنگال کے شیروں کے خون کی بُو سونگھ رہا ہوں جو اُنھوں نے پنجاب کی مٹی پر بہایا تھا .... بی آر بی بہہ رہی ہے نا؟" — اُس نے ہاجرہ کو کندھوں سے جھنجھوڑ کر پوچھا — "بتاؤ نا ہاجو! بی آر بی بہہ رہی ہے نا؟"

"ہاں اقبال جی!" — ہاجرہ بولی — "نہر بہہ رہی ہے۔ تم دیکھ نہیں رہے؟" — لیکن ہاجرہ کے دل سے درد کی ٹیس اٹھی جیسے کسی نے خنجر مار دیا ہو۔ اس نے بھولے سے کہہ دیا تھا "تم دیکھ نہیں رہے؟" — وہ بھول گئی تھی کہ اقبال دیکھ نہیں سکتا۔ ہاجرہ کے آنسو نکل آئے۔

"اقبال جی" — اُس نے رُندھی ہوئی التجا کی — "میری آنکھیں لے لو۔ ایک ہی آنکھ لے لو۔ ڈاکٹر کہتا ہے آنکھ نکالتے اور ڈالتے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ تم وہ محاذ تو دیکھ لو نا جو تم نے فتح کیا تھا۔"

"نہیں ہاجو!" — اقبال نے پیار سے کہا — "تم ہاتھ تھام لیتی ہو تو سب کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ اس نہر کی روانی کو میں اچھی طرح سُن رہا ہوں۔ لگتا ہے جیسے اسے بہتا دیکھ بھی رہا

ہوں .... ہاجو! میری آنکھوں کی روشنی بجھ گئی ہے لیکن روح روشن ہوگئی ہے۔ روح کو روشنی اسی نہر کے کنارے ملی تھی۔ اس نہر میں پاکستانیوں کا خون ملا ہوا ہے ہاجو! یہ نہر بہتی رہے گی"۔۔۔ اس پر فاتحانہ رِقّت طاری ہوگئی۔ وجدانی سی کیفیت میں بولا۔۔۔"زمانے گزرتے رہیں گے ہاجو! بی آر بی بہتی رہے گی"۔

اور اُس نے ہاجرہ کو کندھوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔
